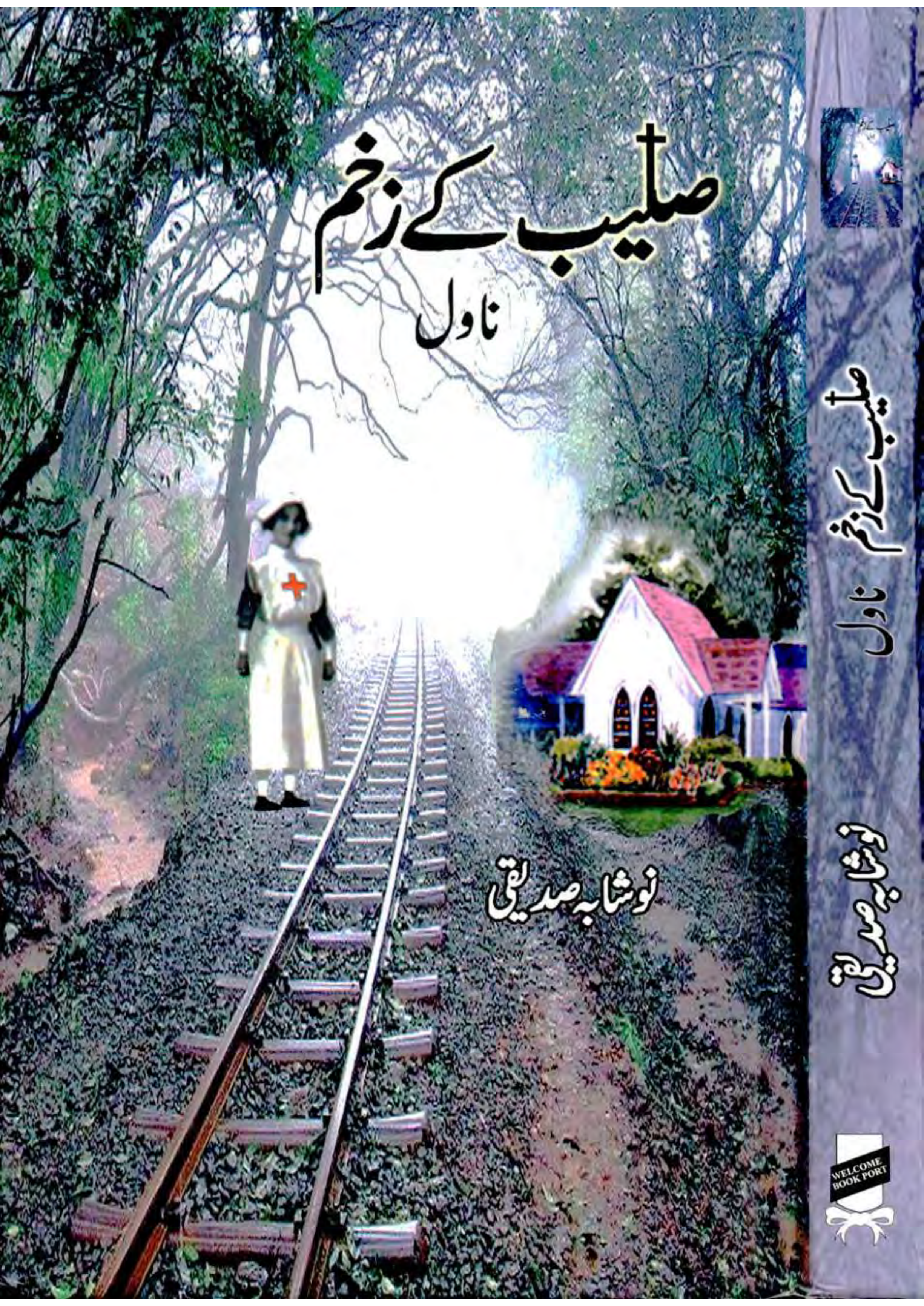
صلیب کے زخم
ناول
نوشابہ صدیقی
صلیب کے زخم
ناول
نوشابہ صدیقی
WELCOME
BOOK PORT

صلیب زخم

نوشابہ صدیقی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

اشاعت اوّل : 1973ء
اشاعت دوم : 2011ء
طباعت : اے بی سی پرنٹر
کمپوزنگ : محمد آصف
تزئین و آرائش : قمر زیدی
قیمت : -/400 روپے

ناشر

ویلکم بک پورٹ
مین اُردو بازار کراچی۔ پاکستان
فون : 021-32639581/32633151
فیکس : 021-32638086
ای میل : wbp@welbooks.com
ویب : www.welbooks.com
ISBN : 13-978-969-500-078-7

contact author: ashernoor@gmail.com

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

سے متعلق اُس دو گز زمین

کے نام

جو میرے ابّا جان مرحوم کی ابدی آرام گاہ ہے۔

''وہ کنواں جس کے اندر ہمارے قہقہے کی آواز گونجتی ہے۔ وہی تو ہے جس کے اندر ہمارے آنسو گرتے ہیں..... جس قدر زیادہ غم ہمارے اندر جاگزیں ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ گنجایش مسرت کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ جب تم مسرت سے معمور ہو تو اپنے دل کی گہرائی میں بغور دیکھو، تم پاؤ گے کہ وہی چیز تمھارے دل کو رنج دے رہی ہے جو تمہیں مسرور بھی کرتی ہے۔ جب تم مغموم ہو تو پھر اپنے ہی دل کے اندر دیکھو۔ تم دیکھو گے کہ تم درحقیقت اسی چیز کے لیے ملول ہو جو تم کو مسرت عطا کرتی ہے۔ تم میں سے بعض کہتے ہیں مسرت غم سے بہتر ہے اور بعض کہتے ہیں، نہیں غم برتر ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ وہ دونوں ناقابلِ تفریق ہیں، ناقابلِ امتیاز ہیں—— ساتھ ہی ساتھ دونوں آئے ہیں۔ جب ایک تمھارے دسترخوان پر موجود ہو تو یقین جانو کہ دوسرا ہمارے بستر میں سو رہا ہوگا۔ سچ ہے کہ تم ترازو کی وہ ڈنڈی ہو جو ان دونوں پلڑوں کو اُٹھائے رہتی ہے۔ جب زندگی کا خزانہ ہاتھ میں ترازو لے کر اپنا سونا چاندی تولتا ہے تو وہ دونوں پلڑے ہلتے ہیں——
اور ڈنڈی اس کے ہاتھ کے نیچے ہوتی ہے۔ جو خزانہ دار ہے——''

—— خلیل جبران

ہمیں عذاب سے گذریں، ہمیں اُٹھائے پھریں
صلیب ہے کہ ہمارا بدن ہے، کیا کہیے!

آپ سے

ناول ''صلیب کے زخم'' سے متعلق آپ سے مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے کہ میرے مضمون ''صلیب کے زخم اور مجنوں صاحب'' میں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی ہوں جو میرے خاکوں کے مجموعے ''سرِشام'' میں چھپ چکا ہے۔ اور اُن قارئین کی آسانی کی خاطر جن کی نظر سے ''سرِشام'' نہیں گزری اور صلیب کے زخم ان کے زیرِ مطالعہ ہے اپنا وہ مضمون اس ناول کی دوسری اشاعت میں شامل کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔

ہاں میں یہ ضرور کہہ دوں کہ میں آج تک مجنوں صاحب کی محبت اور ہمت افزائی کے جذبوں میں اپنے آپ کو جکڑا ہوا محسوس کرتی ہوں اور فخر و مسرت کی اس کیفیت کو اپنے پر تا حال طاری محسوس کرتی ہوں جو برسوں پہلے انھوں نے اپنی تحریر اور آراء سے مجھے بخشی ہے۔

اب مجنوں صاحب اس دُنیا میں نہیں، میں نے اپنے دوسرے ناول ''زندگی بھر کی بات'' پر جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے کسی ناقد سے کچھ بھی نہیں لکھوایا کہ میں مجنوں صاحب کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھنا چاہتی ہوں اور اس لیے بھی کہ میں نے مجنوں صاحب سے یہ وعدہ بھی لے لیا تھا کہ میری دوسری ناول پر بھی انھیں ہی مقدمہ لکھنا ہے۔

لیکن شاید میں نے دوسرا ناول لکھنے میں دیر کردی یا مجنوں صاحب جلدی چلے گئے یوں وعدہ وفا نہ ہوسکا اور میں نے ناول ''زندگی بھر کی بات'' کو بغیر کسی مقدمے کے خالی ہی چھوڑ دیا۔

میں تمام ناقدین کا ادب کرتی ہوں اور اپنی تحریروں پر ان کی رائے لینا بھی چاہوں گی کہ یہ میرے لیے باعثِ اعزاز ہوگا اور شاید اس باعث میں کچھ اور اچھا لکھ پاؤں گی۔

آپ ناول پڑھیے اپنی رائے سے آگاہ کیجیے اور میرا شکریہ قبول کیجیے۔

نوشابہ صدیقی

E-mail : ashernoor@yahoo.com
Phone : (021)35870600

مجنوں گورکھپوری اور صلیب کے زخم

ناول کیا ہے اور ہم اسے کیوں پڑھتے ہیں؟

اس سوال کا جواب اٹھارہویں، انیسویں صدی سے لے کر اب تک مغربی ناقدین دیتے آئے ہیں اور ہماری اُردو زبان میں بھی اس سوال پر کافی مواد ملے گا۔ جتنے جوابات اب تک دیے گئے ہیں ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو بالکل درست ہو لیکن ہر جواب میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔ ایک بہت عام تجربہ یہ ہے کہ پڑھنے والا کہانی یا ناول میں سب سے پہلے تفریح یا لذت کا عنصر طلب کرتا ہے۔ تفریح بھی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ اور اس کو بھی ہم زندگی کے مقاصد میں شامل سمجھتے ہیں۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ تفریح اور لذت میں فرق ہوتا ہے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ داستان یا کہانی یا ناول کسی دور میں بھی محض تفریح نہیں رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ پڑھتے وقت ہم نے ان میں تفریح کے سوا کچھ نہ پایا ہو۔ اور تو اور الف لیلیٰ کی ایک ہزار راتیں، طلسم ہوش رُبا کی آٹھ جلدیں اور حاتم طائی کے کارنامے محض تفریح نہیں۔ ان میں اپنے زمانے کی زندگی کا عکس ملتا ہے۔ اور یہ عکس تخلیقی اور Projective یعنی تیسری سمت یا مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہمیں ان کہانیوں سے یہ بصیرت ملتی ہے کہ اس وقت زندگی کیا ہے۔ اس کو کیا ہونا چاہیے اور یہ کیا ہو سکتی ہے؟ تقریباً سینتیس (۳۷) سال ہوئے میں نے اپنے مقالے ''افسانہ اور اس کی غائت'' میں لکھا تھا کہ افسانہ ایک پہلو سے تفریح ہوتا ہے۔ مگر

دوسرے پہلو سے وہ زندگی کے بحران سے نجات پانے کی کوشش ہوتی ہے۔

ذرا الف لیلٰی کے قصوں کی شانِ نزول پر غور کیجیے۔

شہنشاہ شہریار کے لیے یہ قصّے تفریح تھے۔ اور لوریاں کا کام کرتے تھے لیکن وزیرزادی شہرزاد سے پوچھا جائے تو وہ صرف اتنا کہہ سکتی تھی کہ مجھے تو اپنی موت کو ایک صبح سے دوسری صبح تک ٹالتے رہنا ہے۔ گویا زندگی کو بحرانی لمحوں سے بچانے کی خواہش و ہدایت ناول یا افسانے، کم سے کم جدید ناول یا افسانے کا اصل مقصد ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ناول میں ایک لذت، ایک طیف کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ورنہ وہ وعظ یا پند ہو کر رہ جائے گا۔ اور کوئی اُس کو دل لگا کر نہ پڑھ سکے گا۔

گذشتہ دس بارہ سال کے اندر میری نظر سے کئی ناول گزر چکے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک میں، میں نے کچھ نہ کچھ فنی حُسن اور فکری رسائی پائی ہے۔ اور ان میں سے کئی پر موقع موقع سے میں نے اپنی مختصر رائے کا اظہار کیا ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے نوشابہ صدیقی نے مجھے اپنے زیرِ طبع ناول ''صلیب کے زخم'' کا مسودہ دکھایا۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ میں اس ناول پر تعارف یا مقدمہ لکھوں۔ میں نے ان کو بہت بہلانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنے فیصلوں سے ٹلنے والی معلوم نہیں ہوئیں۔ آخر مجھے ہی اپنی جگہ سے ہلنا پڑا۔

میں نوشابہ صدیقی سے اچھی طرح واقف نہیں۔ مجلسوں اور تقریبوں کی ملاقاتوں سے اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ کس قسم کی شخصیت اور کس مزاج و کردار کی مالک ہیں۔ لیکن میں نے اُن کو ''صلیب کے زخم'' میں دیکھا اور میرے لیے یہ ناول اور وہ خود ایک ہی ہیں بقول اس مصرعے کے، جو عام طور سے زیب النساء سے منسوب کیا جاتا ہے ؎

ہر کہ دیدن میل دارد، در سخن بیند مرا

اس ناول کو شروع سے آخر تک دل لگا کر پڑھ جانے کے بعد جو قابلِ تجزیہ تاثر پیدا ہوتا اور باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جیسے کسی نے اپنی اصل ہستی کو جس کو مدتوں سے وہ کھوئے ہوئے ہے اور بھلا چکا ہے یا اگر کسی نے اپنی اصل ہستی کو کبھی نہیں پایا ہے تو وہ اس کو پا جاتا ہے۔ خود مجھ پر پہلا اثر یہی ہوا کہ میری وہ ہستی جو کم و بیش نصف صدی سے کھوئی ہوئی تھی

خلاف توقع مجھے پھر مل گئی۔ یہ احساس بازیافت اس منزل پر جس پر میں ہوں سخت خطرناک ہوتا ہے۔ میں اس بازیافت کو پھر جلد سے جلد کھو دینا چاہتا ہوں۔ مگر یہ تو میں نے اپنے ذاتی تاثر کا قصہ چھیڑ دیا۔

ناول کی بہت سی تحتی صنفیں ہیں۔ کوئی کسی ایک خاندان کی مکمل زندگی کا آئینہ ہوتا ہے، کوئی تاریخی ناول ہوتا ہے۔ کسی ناول میں زندگی پر مابعدالطبعیاتی یا ماورائی نظر ڈالی جاتی ہے۔ کسی ناول میں نفسیاتی الجھاوے سلجھائے جاتے ہیں۔ کوئی پرابلم ناول کسی اہم مسئلہ زندگی پر ہوتا ہے۔ کوئی تصوریت لیے ہوئے ہوتا ہے۔ کسی میں عمل کا پیغام ہوتا ہے۔ کوئی خالص جمالیاتی ہوتا ہے یعنی فن برائے فن کی نمایندگی کرتا ہے۔ اور کسی ناول میں سائنس کے موجودہ اور آیندہ اکتشافات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آخر "صلیب کے زخم" کس قسم کا ناول ہے؟ اس کا جواب بڑا مشکل ہے۔ اس میں گھریلو زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں جو واقعیت لیے ہوئے ہیں۔ بڑے سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے بچے تک کی زندگی کا مختصر نمونہ ہماری نظر سے گزرتا ہے، جو فطری ہے۔ ناول میں صحت مند قسم کی عملیت بھی ہے، اور تصوریت بھی۔ اس میں واقعاتی زندگی کا پورا عکس بھی ہے، اور وہ رُومانیت بھی ہے جس سے انسان جب تک وہ انسان ہے کسی دور میں بھی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ تمام عناصر باہم اس طرح شیر وشکر ہیں کہ ان کا کیمیائی تجزیہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ افراد اور سماج، انفرادی شخصیت کے مطالبے اور سماجی نظام کے تقاضے دونوں برسرِ پیکار ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہیں۔ اور پیکار، پیکار محسوس نہیں ہوتی۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ منزل ہے جہاں فرد کی ذاتی رُوح کائنات کی رُوح کے ساتھ مل کر ایک آہنگ بن گئی ہے۔

ویسے تو ناول کا ہر کردار اپنا ایک فطری مقام رکھتا ہے لیکن اس کی رُوحِ رواں سلینا کراس اور انور ہیں۔ اور سلینا کراس تو ایک ایسا محور معلوم ہوتی ہے جس پر جہاں تک اس ناول کا تعلق ہے زندگی کا پورا کرہ گھوم رہا ہو۔ ناول کی ترتیب، روزمرہ واقعات سے ہوتی ہے لیکن یہ محض واقعات کی کہانی نہیں ہے۔ یہ کرداروں کی کہانی ہے۔

بیرونی کش مکش یا تصادم معاشرے اور اس کے مروجہ اخلاقی اور اجتماعی معیار و روایت کی پیداوار ہے۔ لیکن اندرونی پیکار خود کرداروں کی شخصیتوں اور مزاجوں سے پیدا ہوا ہے۔ ایسے دو کردار بہت کم دیکھے گئے ہیں جو ایک دوسرے سے بہ یک وقت اتنا قریب ہوں اور اتنا دُور ہوں۔

کہانی کی ابتدا انور کی تیمارداری سے ہوتی ہے جس میں یوں تو سارا گھر شریک ہے لیکن بغیر ایک سند یافتہ اور تجربہ کار نرس کے کام نہیں چلتا۔ یہ نرس سلینا کراس ہے جو آتے ہی مریض کو اپنے ہاتھ میں اس طرح لے لیتی ہے کہ گھر والے اعتماد کے ساتھ سُبک دوشی سی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ انور کی بیماری بھی ایسی ہے جو عام نہیں ہے یعنی وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے اور یہ بات اس کے ذہن سے بالکل محو ہو گئی ہے کہ وہ ایک عرصے تک لندن اور ایڈنبرا میں وہاں کے لوگوں اور وہاں کے معاشرے میں بالکل گھل مل کر زندگی گزار چکا ہے۔ وہ ایک بالکل نابالغ بچے کی سی حرکتیں کرتا ہے۔ اور ان حرکتوں میں سنجیدگی کے ساتھ منہمک ہے۔ اس کا بچکانہ مشغلوں میں ایک مشغلہ پانی میں صابن گھول کر نلکی سے چھوٹے بڑے بلبلے اُڑاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ آسمان پر سیارے یا راکٹ بھیج رہا ہے۔ نرس پہلے ہی دو چار گھنٹے کے اندر انور کی نبض جس طرح پا لیتی ہے اور بغیر اس سے کسی قسم کا اختلاف کیے ہوئے اس کو رام کر لیتی ہے۔ یہ ہر نرس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور انور اچانک اس سے یوں مانوس ہو جاتا ہے کہ گویا یہ وسیلۂ موانست بذریعۂ الہام اس کو ملا ہے۔

اگر کوئی دوسرا اس موضوع پر قصہ چھیڑتا تو ایک ماہر نفسیات یا تحلیلِ نفسی کے عالم کی طرح ہم کو طرح طرح کی اصطلاحوں میں اُلجھا دیتا۔ اور اس کی یادداشت واپس لاتے کے لیے نہ جانے کیسی کیسی شعبدہ بازیاں دکھاتا جو خود پڑھنے والے کے ذہن کو پراگندہ کر کے رکھ دیتیں۔ اور پھر بھی وہ اصلیت سے دُور رہتے۔ سلینا نے جس سلیقہ کے ساتھ انور کی ذہنی گرہوں کو کھولنے کی پُرخلوص مسلسل کوششیں کیں، اس کو ہم آسانی توفیق سے منسوب کر سکتے ہیں۔ کون جانے اس میں اس کا وہ جذبۂ عقیدت بھی کارفرما ہو جو اس کو پاک کنواری مریم کے ساتھ تھا۔ وہ دل سے چاہتی ہے کہ انور اس کے

ہاتھوں چنگا ہو جائے۔ اور اپنی کھوئی ہوئی یادداشت پا کر ویسا ہی صحت مند و توانا ہو جائے جیسا کہ وہ پہلے رہا ہوگا۔

شاید یہ اس کا خلوص ہی تھا جس نے خود بہ خود اس کے لیے ایک مساعد اتفاق مہیا کر دیا۔ ایک صدمے نے انور کی یادداشت کھوئی تھی اور اگر وہ واپس آسکتی تھی تو اس کے لیے ایک دُوسرا صدمہ ہی ضروری تھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ دوسرا صدمہ پہلے صدمے سے بالکل مختلف تھا۔ انور، سلینا سے اس قدر خوش تھا کہ خود اپنی جگہ اپنے سارے ذہنی اختلال کے باوجود سلینا کی رضاجوئی اور اس کو خوش رکھنے اور دیکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ یہی محرک تھا جس نے اس کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ سلینا کی خواہش پوری کرنے کے لیے پہاڑی پر تفریح کے لیے جائے۔

وہاں وہ ٹھوکر کھاتا ہے اور اس طرح گرتا ہے کہ اس کے سر میں شدید چوٹ آتی ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ سلینا بدحواس ہو جاتی ہے اور سب کے ساتھ اس کو واپس لے کر آتی ہے۔ اب وہ ایسا محسوس کرتی ہے کہ اس کے سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ اور اب ازسرنو اس کی تیمارداری کرنا پڑے گی جس کا نتیجہ یقینی بھی نہیں۔ وہ ازسرنو انور میں منہمک ہو جاتی ہے۔ اس کو نئی تدبیریں اختیار کرنا پڑتی ہیں۔ مگر شاید ان ہی تدبیروں سے کام نہ چلتا اگر سلینا اسی کے ساتھ ساتھ صلیب اور پاک مریم کے سہارے دل سے دُعا بھی نہ مانگتی رہتی۔ اس ناول میں ایک شفائی یا زخموں کے لیے ایک اندمالی طاقت (Healing Power) ہے جو شروع سے آخیر تک کام کر رہی ہے اور جس کا راز صرف یہ ہے کہ سلینا دوا اور دُعا دونوں کی بہ یک وقت قائل ہے۔ اور دونوں سے ایک ساتھ کام لے رہی ہے۔

انور ایک خاص عالم میں پہنچ جاتا ہے جس کو بے ہوشی کہیے یا نیم شعور اور اسی عالم میں اس کی یادداشت لوٹ آتی ہے اور وہ ساری سرگذشت خواب کی حالت میں بڑبڑاتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ سلینا بہت غور سے اس کو سنتی ہے اور اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا مریض بہت جلد اپنی اصلی حالت پر آجائے گا۔ اور وہ اس پُرامید خیال سے خوش ہوتی ہے لیکن اس دوران سلینا کے شعور میں بے ساختہ ایک تبدیلی بھی ہو چکی ہوتی

ہے۔ وہ اب اپنے مریض کی صرف تیماردار نہیں ہے بلکہ اس کے لیے اپنے دل میں ایک مبہم مگر مستقل خلش بھی محسوس کرنے لگتی ہے۔ جس کو عام زبان میں محبت ہی کہہ سکتے ہیں۔

یہاں سے خود سلینا کے شعور میں ایک نہایت نازک لمحہ شروع ہوتا ہے۔ اور اس کے دل میں ایک بحرانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ جس کا بظاہر کوئی حل معلوم نہیں ہوتا۔ خود وہ ڈیوڈ کے ساتھ منسوب ہو چکی ہے۔ منگنی کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پڑی ہوئی ہے۔ سلینا اب

ایمان مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر

کی اندرونی کش مکش میں مبتلا ہے۔ اور قرائن و آثار سے ناول کا پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ اس کش مکش سے کبھی نجات نہ پا سکے گا۔ لیکن سلینا کش مکش کی ابتدا کے دوران ہی فیصلہ کر چکی ہے اور اس کا یہ فیصلہ ایسا ہے جو کسی معمولی انسان کے بس کا نہیں۔ مگر اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ اور وہ جس طرح اس فیصلے سے ثابت قدم ہے، وہ اسی کا حصہ ہے۔ اس نے نہ کفر سے منہ موڑا ہے، نہ ایمان سے انحراف کیا۔ بلکہ دونوں کو کچھ ایسا کر دیا ہے کہ معمولی طبیعت کے لوگ سکتے کے عالم میں رہ جاتے ہیں۔ انور صحت یاب ہو جاتا ہے۔ اس موقعہ پر جشن منایا جاتا ہے۔ جس میں سلینا بھی اپنی تمام کش مکش اور خلش کو اپنے اندر دبائے ہوئے ہموار پیشانی کے ساتھ شریک ہوتی ہے۔ کچھ دن اور قیام کر کے بالآخر وہ سب سے رُخصت چاہتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے فرض سے بوجوہ احسن سبک دوش ہو چکی ہے۔ اور اب اس کو اپنے کام پر واپس جانا ہے۔ انور کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلینا چلی جائے گی تو اس کو دھکا لگتا ہے۔ اور وہ بے اختیار اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہوا اس کو روک لینے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ لیکن سلینا استقامت کے ساتھ اپنے فیصلے پر قائم ہے۔ وہ انور کو ہر طرح سے سمجھاتی ہے اور جب انور اس سے کہتا ہے کہ وہ خود اپنے کو فریب دے رہی ہے اس کا سلینا جو جواب دیتی ہے وہ دل میں نقش چھوڑنے والا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ''میرے ہاتھ میں ایک زہر بھرا پیالہ تھما دیا گیا ہے جس کو میں برابر گھونٹ گھونٹ پیتی رہی ہوں۔ اور اب اس پیالے میں صرف چند گھونٹ رہ گئے ہیں۔ جن کو میں پی جانا چاہتی ہوں تا کہ جن قدرتی اور معاشرتی عوامل نے مجھے پروان چڑھایا ہے، وہ

شرمندہ ہوں"۔

آخرکار وہ انور کو اس کے حال پر چھوڑ کر اسٹیشن کی طرف روانہ ہوجاتی ہے۔ وہ قطعی طور پر یہ نہیں بتاتی کہ وہ کہاں جارہی ہے۔ بس ایک اسٹیشن کا نام لیتی ہے اور گاڑی کے ایک ڈبے میں سوار ہوجاتی ہے۔ گھر کے سب چھوٹے بڑے معہ انور کے اس کو اسٹیشن پہنچانے آتے ہیں۔ انور سکتے کے عالم میں ہے۔ گاڑی آخرکار روانہ ہوجاتی ہے۔ اور انور کی نگاہیں ریل کی پٹریوں پر جمی ہوئی ہیں جو متوازی چلی جارہی ہیں۔ انور تاحدِ نظر ان پٹریوں کو دیکھتا ہے۔ اور اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ متوازی پٹریاں بہت دور جا کر آپس میں مل گئی ہیں۔ اطہر اس کے اس التباس کو یہ کہہ کر پاش پاش کر دیتا ہے کہ یہ صرف نظر کا دھوکا ہے ورنہ یہ پٹریاں آپس میں دراصل کہیں نہیں ملتیں۔ اسی صورتِ حال کے متوازی جب سلینا گاڑی سے اپنے اسٹیشن اُترتی ہے تو اس کی نگاہیں بھی دونوں متوازی پٹریوں پر پڑتی ہیں اور اس کو ڈیوڈ کا وہ جملہ یاد آتا ہے جو اس نے اس سے اسپتال میں اپنی بیماری کی حالت میں کہا تھا۔ وہ زندگی سے دل برداشتہ تھا اور سلینا اس کو تسلیاں دے رہی تھی اور ڈیوڈ نے اس سے یہ کہہ کر اپنے دبے ہوئے جذبے کا اظہار کیا تھا کہ "تم میری متوازی لکیر بن جاؤ" سلینا کو ڈیوڈ کا جملہ یاد آتا ہے اور اس کی نگاہیں بھی پٹریوں پر جم جاتی ہیں۔ اور اس کو بھی نظر کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اور بہت دور دونوں متوازی پٹریاں باہم ملتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں مگر اس کو فوراً یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ محض نظر اور حواس کا دھوکہ ہوتا ہے۔ لیکن اس التباس یا طیف کو جس طرح حقیقت بنا دیا گیا ہے وہ حقیقت سے بھی زیادہ حقیقی ہے۔ اس کو ماہرین ریاضیات سے پوچھیے جن کا مقولہ ہے کہ یہ دو متوازی خطوط کبھی نہیں ملتے۔ لیکن جو یہ بھی مانتے ہیں کہ متوازیات لامتناہی میں جا کر مل جاتے ہیں۔ انور کا حال نہیں معلوم لیکن سلینا نے اس قول کو سچ بنا کر دکھا دیا۔ انور کا کردار بھی بڑا بلند ہے لیکن سلینا جس مقام پر پہنچ گئی ہے، انور شاید وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اپنی اسی توانائی کی بدولت سلینا پورے ناول پر چھائی ہوئی ہے۔

خطوط متوازی ناول میں ایک دوہری علامت بن گئے ہیں۔ پورے قصے میں چار کردار اہم ہیں۔ میبل اور انور۔ میبل اور بیڈن۔ سلینا اور انور۔ سلینا اور ڈیوڈ۔

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس کے باوجود کہ سلینا، انور سے کہتی ہے کہ میں میبل نہیں بن سکتی۔ لیکن انور کے لیے تو وہ دوسری میبل ہی رہی۔ لیکن یہ صرف پہلی نظر کا دھوکا ہے۔ میبل اور بیڈن جس عالم میں مل کر ایک ہوتے ہیں وہ خطوطِ متوازی کے ملنے کا عالم نہیں ہے جہاں متوازی خطوط میں انحراف پیدا ہوا ہے، وہ دونوں کے ملنے کا مقام ہے۔ سلینا کی حالت دوسری ہے۔ وہ پہلے سے ڈیوڈ کے ساتھ رفاقت کا پیمان باندھ چکی ہے۔ انور بعد کو اس کے راستے میں آیا۔ اس نے اپنے عہد کی لاج رکھی۔ ڈیوڈ سے اس نے شادی کرلی۔ مگر انور بھی اس کا اپنا رہا۔ اس لیے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ متوازی خطوط وہاں ملے ہیں جہاں ان کو فطرتاً ملنا چاہیے یعنی عالم لامتناہی میں۔ یہاں کسی قسم کا انحراف ممکن نہیں۔

اب میں اس ذاتی تاثر کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوں جو ناول پڑھ کر مجھ پر ہوا۔ اور وہ یہ کہ ناقابلِ فتح پر فتح پالی گئی ہے۔ اور ممتنع الحصول حاصل ہوگیا۔

ناول مجھے اس مقام سے لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے جہاں غالبؔ نے یہ حکم لگایا ہے ''بھول جانا ہے نشانی میری'' یا جہاں سے بیدلؔ ہم کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے ؎

حسن حقیقت رُوبرو، شمع فضول آئینہ جُو
بیدلؔ چہ فرماید، بہ گو، اے یافتنِ ناجستند

میں اس کو ناول نگار کا کمال سمجھتا ہوں کہ اس نے پوری رُوداد کو ایسے آنسوؤں سے مشابہہ بنا دیا ہے جو پلک تک آچکے ہیں لیکن ایک قطرہ بھی گرنے نہیں پایا۔ ناول میں بہت سے الفاظ، فقرے اور عبارتیں ایسے پیمانے کی مانند ہیں جو اشکِ خونیں کی شراب سے لبریز ہوں۔ لیکن کیا مجال کہ چھلک جائیں۔

سلینا جس منزل پر پہنچ گئی ہے وہ ترکِ ترک کی منزل ہے۔ جہاں ترک بھی محو ہو جاتا ہے۔ یہ وہ صبر ہے جو عام معنوں میں صبر نہیں ہوتا۔ یہ صبر کسی انفعالی حالت کا نام نہیں ہے بلکہ ایک شدید فعال طاقت ہے جو اگر چاہے تو آسمان و زمین کو تہہ و بالا کرکے رکھ دے۔ یہ وہ صبر ہے جس کی تلقین الہام کے وسیلے سے انبیاء و رُسل کو کبھی کبھی کی جاتی رہی ہے۔ اور جس کو وہ اپنا شعار بنائے رہے۔ سلینا اپنی تپکتی ہوئی یادوں پر قابو پاگئی ہے۔ اور اب وہ پاک مریم کے سامنے صومِ سکوت کا ایک پیکر بن گئی ہے۔

یہ ناول آرزو کا ناول ہے۔ لیکن ایسی آرزو جس کا انجام شکست سے پہلے متعین ہو۔ غالبؔ نے کہا تھا

؎ حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزوِ خرامی!

لیکن سلینا آرزو کی شکست، آرزو کو زندہ رکھ کر صرف اسی کو حاصل سمجھنا اپنا شعار بنا چکی ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ شعر میں تو حسرتؔ بڑے مزے سے کہہ گئے ہیں

؎ بہم رہنے لگے دونوں تمنا اور مجبوری

مگر زندگی میں اس نکتے کو پانا معمولی انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ سلینا نے تمنا اور مجبوری کو مجبوری رہتے ہوئے بھی دونوں کو ایک راگ میں تبدیل کر دیا۔

تاثر اور تامل، تخیل اور تعقل، بے لاگ خارجیت اور تہہ گیر دُور بینی، امرِ واقع اور صورتِ حال کے صحیح شعور اور معنوی مضمرات کا مکمل ادراک کیا ہے۔ جس نے مبہم یا واضح وجود کا "صلیب کے زخم" میں جا بہ جا احساس نہ پایا جاتا ہو۔ لکھنے والی اظہار پر تو قدرت رکھتی ہی ہے لیکن ناول میں بہت سے ایسے مقام آتے ہیں جہاں وہ نیم اظہار اور اس سکوت کی بھی ماہر معلوم ہوتی ہے جس کو کارلائل سکوتِ بلیغ (Eloquent Silence) کہتا ہے۔

میں اس ناول کا اس لیے معترف ہوں کہ وہ المیہ نہیں بلکہ فوق الالمیہ (Super Tragic) کے نقطۂ عروج کو چُھو لیتا ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغرب و مشرق کی دُنیائے فکر و فن میں جتنے جدید میلانات اور جتنی پَے بہ پَے نئی تحریکیں ہوئی ہیں ان سب سے نوشابہ صدیقی شعوری یا غیر شعوری طور پر صحت منداثر قبول کرتی رہی ہیں۔ کیا رومانیت، کیا واقعیت، کیا نفسیاتی میلانات، کیا زندگی کا حکیمانہ ادراک، کیا لاشعور کیا شعور کی رَو، کیا وجودیت اور کیا وہ غیر موسوم میلان جس کو میں ماورائے وجودیت کہوں گا۔

ان تمام میلانات و محرکات کے ارتعاشات ناول میں محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن شاید نوشابہ صدیقی ان میں سے کسی ایک سے بھی اندھی عقیدت نہیں رکھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ایسا ناول لکھ سکیں جس کو میں بہت بڑا ناول سمجھتا ہوں۔ لیکن جس کی

نوعیت متعین نہیں کی جا سکتی۔

اس ناول کو پڑھنے کے بعد مجھے مغرب و مشرق کے بہت سے قصّے یاد آرہے ہیں جنھوں نے میرے ذہن پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں اور جن میں عورتوں ہی کے کردار شروع سے لے کر آخیر تک برتری کے ساتھ غالب رہے ہیں۔ ان میں ایک تو ''زہرِ عشق'' والی مہ جبیں ہے جو اپنی موت کا پورا نقشا درست کر کے عاشق سے آخری ملاقات کرنے آتی ہے اور اپنے اندر اتنی توانائی لیے ہوئے ہے کہ عاشق کی سچی یا جھوٹی دِگرگوں حالت کو بھی سنبھال لی جاتی ہے۔ اُس کا وصیت نامہ، آدمیت کا ایک مکمل کورس ہے اور اس کے یہ آخری الفاظ:

؎ دل میں لے کر تمہاری یاد چلی　　　باغِ عالم سے نامراد چلی

کسی طرح ہمارے اندر نامُرادی یا ناکامی کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتے۔ دوسری عورت ہیسٹر پرائن (Hester Prynne) ہے جو Nathanniel Hothorn کے مشہورِ روزگار ناول The Scarlet Letter کی ہیروئن ہے۔ وہ ایک پادری کے ہاتھوں غارت ہو کر جیل جاتی ہے۔ اور جب جیل سے باہر آتی ہے تو اُس زمانے کے دستور کے مطابق وہ قانوناً مجبور ہے کہ اپنے کُرتے کے سینے پر ایک سُرخ نشان لگائے رہے گی جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اچھوت ہے۔ اُس کی گود میں ایک بچی ہے جو اس انداز میں رہ رہ کر سُرخ نشان کو دیکھتی ہے کہ جیسے اس پر اس کے متعلق وحی نازل ہو رہی ہو۔ اس سے بار بار پوچھا جاتا ہے۔ لیکن وہ اپنے بہکانے والے کا نام نہیں لیتی۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس پادری کو بار بار اس کے سامنے آنا پڑتا ہے، اُس کو دُعائیں دینے کے لیے۔ آخرکار پادری کا ضمیر جاگ اُٹھتا ہے اور وہ خود اپنی لغزش کا اعلان کر دیتا ہے۔ لیکن ''ہیسٹر پرائن'' پھر اس کے پاس نہیں جاتی اور ایک پندار کے ساتھ اس سے الگ رہنے کی کوشش کرتی ہے۔

تیسری عورت ٹالسٹائی کے شاہ کار ناول کی ہیروئن اینا کیرینینا (Anna Karenina) ہے۔ وہ ایک امیر گھرانے کی شادی شدہ عورت ہے اور ایک دوسرے نوجوان امیرزادے کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہے۔ اس کا شوہر نہایت میکانکی انداز میں اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس کو اپنے سے الگ بھی نہیں کرتا۔ اور وہ

اوباش مزاج ''ؤلانکی'' کے پیچھے ماری ماری پھرتی ہے۔ وہ اس سے ایک بچے کی ماں ہو چکی ہے۔ اور ولانکی اس مزاج کا ہے جو روز رات کو ایک نئی عورت کو بت کی طرح پوجتے ہیں۔ اور صبح ہوتے ہوتے اس کو غلاظتوں کے ایک ڈھیر کی طرح ٹھکرا دیتے ہیں۔ ٹالسٹائی اس ناول میں جہاں تک المیاتی بحران کے حل (Resolution) کا سوال ہے میرے خیال میں کامیاب نہیں رہا۔ لیکن اینا کرینینا اپنی تمام آلودگیوں اور افتادگیوں کے باوجود بہت بڑی شخصیت رہ جاتی ہے۔

چوتھی عورت تھامس ہارڈی کی اختراع فائقہ ناول کی ہیروئن Tess ہے۔ جو پے در پے معصوم لغزشوں میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی اتنی عظیم و مقدس ہے کہ خود اس کا مصنف اس ناول کا ذیلی عنوان ایک پاک عورت (A Pure Woman) لکھتا ہے۔

یہ عورتیں میرے دل میں چھپی ہوئی جراحتوں کی طرح اب تک خلش پیدا کرتی رہی ہیں۔ سلینا ان گنائی ہوئی عورتوں کے درمیان کسی قسم کی مناسبت یا مشابہت نہیں رکھتی ہے لیکن وہ مجھے ان سے زیادہ نہیں تو ان ہی کے برابر برتر اور پاک معلوم ہوتی ہے۔

واقعات کی ترتیب، کرداروں کی اندرونی تہوں کی عکاسی، نازک لمحات کا فطری ڈرامائی انداز میں بیان مختلف کرداروں کے مختلف موقعوں پر مکالمے، ہر اعتبار سے ناول معیاری ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ناول نفس مطلب اور رمزیہ (Allegory) دونوں کو ایک مزاج بنا کر پیش کرتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ ناول تعریف سے مستغنی اور تنقیص سے بالاتر ہے۔

مجھ سے پوچھا جا سکتا ہے کہ ناول میں کوئی نقص بھی نظر آیا یا نہیں۔ ہاں ناول میں صرف ایک نقص ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ جس کا نقص سے بالکل پاک ہونا بڑا خطرناک ہے۔

مجھے ناول کا نام پسند نہیں۔ میں ہوتا تو کچھ اور نام دیتا۔ جس پر شاید مجھ پر ہر طرف سے ملامت کی بوچھاڑ ہونے لگتی۔ لیکن یہ ناول کا کوئی نقص نہیں ہے۔ یہ یا تو واقعی نوشابہ صدیقی کی اپنی پسند ہے یا سماج اور ماحول کی مصلحتوں کا تقاضا ہے۔

نوشابہ صدیقی سے مجھے ایک بہت بڑی شکایت ہے۔ مگر پھر یہاں اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی بصیرت کا سوال پیدا ہوجاتا ہے۔ انہوں نے کہیں درمیان میں میر کو مستِ الم یا یاس پرست شاعر کہا ہے۔ میر کی شاعری کو ہم قنوطیت کی شاعری نہیں کہہ سکتے۔ وہ صرف غم کے شاعر نہیں۔ ان کی آواز میں صرف دُکھ کی آواز نہیں تھی۔ وہ اس نشاط کے شاعر تھے جو صرف غم سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس سُرور کے شاعر تھے جو سارے دُکھ کو اپنے ریشے ریشے میں جذب کر کے اور اس پر عبور پا کر' پیدا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں غم یا دُکھ ایسے مقام پر پہنچا ہوا محسوس ہوتا ہے جس کو سمجھنا یا ادراک کو تعقل کے احاطے میں لے آنا محالات سے ہے جس کے بارے میں ورڈزورتھ کہتا ہے کہ وہ ازل تا ابد کی پہنائی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ مگر ہوسکتا ہے کہ یہ صرف میرا احساس ہو، اور غلط ہو۔ اور بہت ممکن ہے کہ اور بہت سے دوسروں کی طرح نوشابہ صدیقی ہی کا خیال صحیح ہو——!!

مجنوں گورکھپوری

صلیب کے زخم — اور مجنوں صاحب

یہ 1973ء کی بات ہے۔ میں نے ایک ناول لکھا۔ دل چاہا کہ وہ لاہور سے شائع ہو مجھے کسی ایسے ناشر کے بارے میں معلومات نہیں تھی کہ جسے میں مسودہ بھیجتی میں ایک بک اسٹال پر گئی۔ کئی ایک ناول کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک کتاب اچھی چھپی ہوئی تھی۔ مکتبہ عالیہ ایبک روڈ لاہور۔ میں نے ناشر کا انتخاب کر لیا تھا۔ گھر آئی دو لائن کا ایک خط لکھا۔

''جنابِ والا مجھ سے ایک حماقت ناول کی صورت میں سرزد ہوگئی ہے کیا آپ اسے چھاپ سکیں گے۔''

محترم کلیم نشتر کا جواب مکتبۂ عالیہ سے جلد ہی موصول ہوا۔

محترمہ! ہم ایسی ہی حماقتوں کو چھاپنے کیلئے یہاں بیٹھے ہیں مسودہ بھیج دیجیے دیکھ کر مزید کچھ عرض کر سکیں گے۔

میں نے جھٹ مسودہ بھیج دیا۔ چند روز بعد اطلاع ملی۔

''آپ کی حماقت چھپ جائے گی۔'' شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی

کہ مجھے کم از کم تین عدد اور حماقتوں کو ان کے ہی یہاں سے چھپوانا ہوگا۔ یہ کون سی بڑی یا کڑی شرط تھی ہم نے فوراً مان لی۔ ہم بھلا تین اور ناول کیا لکھ بھی پائیں گے۔؟ نہ لکھیں گے نہ کہیں سے چھپے گا۔

ہمیں اپنی صلاحیت کا پہلے ہی سے علم تھا۔ آخر ہوا بھی تو یہی وہ آج تک اگلی حماقت کا انتظار کر رہے ہیں اور ہم اب عقلمند ہو گئے ہیں۔

اب جو مرحلہ درپیش تھا وہ دیباچے کا تھا۔

کلیم صاحب برابر مانگ رہے تھے اور ہم اس سوچ میں تھے کہ لاہور اور پبلشر تو اچھے مل گئے۔ مجنوں صاحب مجھے کیسے دستیاب ہوں گے۔ اور یہ کہ ذہن میں مجنوں صاحب کے علاوہ کوئی جگہ نہیں لے پا رہا تھا۔ مجنوں گورکھپوری اور بس مجنوں گورکھپوری۔ دوملکوں کا فاصلہ۔ پھر مجنوں صاحب کی لیاقت اور میری حماقت کے درمیان کا بھی فاصلہ۔ معاملہ نپٹے کیسے۔ کئی مہینے گزر گئے اور ہمارے تعلقات پبلشر سے خراب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ مجھے بار بار سمجھا رہے تھے۔ ایک سے ایک بڑے لوگ کراچی میں موجود ہیں کسی کی بھی خوشامد کر لیں۔ مجھے اختیار دیں۔ لاہور میں بڑی بڑی شخصیات موجود ہیں میں لکھوا دوں۔ مگر نوجوانی کی ضد اور خواہش اس کے آگے بھلا کون ٹھہرا ہے یا ٹھہر سکتا ہے۔ نہیں بس مجنوں صاحب!

واہ رے خواہش کی شدت کہ ایک انہونی ہوگئی۔ مجنوں صاحب نے ہندوستان چھوڑ دیا۔ پاکستان آ گئے۔ بلکہ کراچی آ گئے۔ بلکہ ناظم آباد آ گئے میں آج تک کہتی ہوں حالانکہ حماقتوں کا زمانہ بھی گزر گیا ہے کہ مجنوں صاحب صرف میرے لئے کراچی آئے تھے۔

میں کسی کو علیگ نہیں مانتی جب تک کہ وہ شخص ایک امتحان میں پاس نہ ہو۔ امتحان کا واحد سوال یہ ہوتا کہ آپ اگر میرے والد یا دادا کو نہیں جانتے تو آپ علیگ ہرگز نہیں۔ یہ امتحان میں ہر علیگ کا لیا کرتی اور نسخہ سو فیصد درست اترتا۔ میں نے حسب عادت پہلی ہی ملاقات میں مجنوں صاحب کو سو فیصد علیگ مانتے ہوئے اپنے دادا اور

والد کا نام لیا۔ مجنوں صاحب کی مسکراہٹ اور پھر شفقت نے مجھے ان سے پل بھر میں بہت قریب کر دیا۔ اب مرحلہ تھا اپنے شوق کے اظہار کا۔ میں اپنے بارے میں کسی بھی خوش فہمی کا شکار نہیں تھی پھر یہ اظہار کیونکر کرتی کہ وہ میرے ناول پر مقدمہ لکھ دیں لیکن مجھے یہ بات ان سے کہنی تو تھی ہی۔ میرے شوق میں کتنا وزن اور میرے اٹکتے ہوئے لہجے میں کتنی لجاجت تھی کہ مجنوں صاحب نے نہ مجھے ڈانٹا نہ شرم دلائی' نہ غصہ ہوئے نہ منع کیا' نہ حامی بھری' بس اتنا کہا ''ناول دیکھ کر بتاؤں گا۔''

ان کے اس ایک جملے نے شریانوں میں خون کی رفتار تیز کر دی۔ سارے آنسو آنکھوں سے ایک ساتھ ٹپک پڑے۔ لرزتے ہونٹ تھم گئے۔ اپنے لکھے کی شرمندگی البتہ بڑھ گئی۔ ''اب کیا ہوگا''

یہ خوف ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اور بڑھ گیا۔

دوسرا دن طے ہوا ان شرائط کے ساتھ:

انہیں ان کے گھر سے اپنے گھر لانا میری ذمہ داری تھی۔ یہ ان کے مطابق وہ فرض تھا جو انہیں میرے خاندان سے واقفیت کی بناء پر اتارنا ہی تھا۔ تھرماس چائے سے بھرا ہوگا، کمرے میں کوئی تیسرا نہیں ہوگا، چائے کی پیالی خالی نہیں رہے گی اور میں مقابل کی کرسی پر بیٹھ کر درست لہجے اور تلفظ میں انہیں روانی سے سناتی جاؤں گی۔ جہاں چاہوں گا چپ کرادوں گا۔ اُٹھ کر گھر چلا جاؤں گا۔ پھر اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ سفارش ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔

شروع کی شرائط نرم مگر آخری بہت گرم اور سخت تھیں۔ لہجہ' تلفظ روانی سب پر ناز تھا خواہ بیجا ہی سہی' مگر پھر بھی یہ ناز ان کے مقابل آنے سے گھبرا اور کترا رہا تھا۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اور شوق بہر حال اپنی قوت منوا رہا تھا۔

کام شروع ہوا۔ کوئی بھی پڑھا لکھا شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک نامی گرامی نقاد' افسانہ نگار' شاعر' استاد' ادیب مقابل ہو ایک ایسے نالائق کے جسے قلم بھی پکڑنا نہ آتا ہو تب صورتِ حال کیا ہوتی ہے۔

نوجوانی کا دور ہوتو یہ نغمہ زبان پر آ ہی جاتا ہے
میں بچہ پاکستانی ہوں اور کام کروں گا بڑے بڑے
میری سوچوں میں یہ سب کچھ تھا کہ مجنوں صاحب کی چائے کی ایک پیالی ختم ہوگئی۔

''لڑکی شروع کرو''

لڑکی شروع ہوگئی۔ شروع میں آواز کانپی۔ جہالت پر شرمائی پھر ڈھیٹ بن گئی' لہجہ' روانی' تلفظ سب کچھ ٹھیک بلکہ مجنوں صاحب کو قابلِ قبول پڑھتے ہوئے کن انکھیوں سے ان کی جانب دیکھتی جاتی اور سوچ لیا تھا کہ چہرے پر برہمی اور اکتاہٹ کے ذرا سے بھی آثار دیکھے تو صفحے سمیٹ لوں گی حیرت کی بات تو یہ تھی کہ چائے کی پیالی ایک باب میں دومرتبہ خالی ہوچکی تھی لیکن ابھی تک ناگواری کے سائے ان کے چہرے پر رنگ نہیں لائے تھے۔ پھر بھی میں تکلفاً تھوڑی دیر کیلئے خاموش ہوگئی۔ اور یہ محسوس کرنے لگی۔ کہ بس اب وہ خود بھی خوشی خوشی مجھے ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جانے کیلئے کہیں گے۔ مگر واہ رے مجنوں صاحب کا ضبط بولے۔ ''آگے پڑھو''

شوق کا کیا کہنا وہ تو اور بڑھا۔

دوسرا باب شروع ہوا کن انکھیوں سے دیکھنے کا عمل بھی جاری رہا۔ مجنوں صاحب کا ضبط بھی اپنی جگہ قائم' میری شرمندگی میں کمی کے بجائے پھر بھی اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

مگر ''آگے پڑھو'' کے حکم نے کتاب آدھی ختم کرادی۔

جب میں یہ سمجھی کہ وہ تھک گئے ہوں گے۔ میں نے کتاب سے ہٹ کر بات کی ''مجنوں صاحب باقی آئندہ'' -

''نہیں۔ آگے پڑھو'' اب مجنوں صاحب نے سچ مچ کہانی میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ میرا حوصلہ تو کیا بڑھتا۔ اپنی اوقات سے میں بالکل غافل نہیں تھی۔ میں پڑھتی جاتی اور مجنوں صاحب کی جانب چوری چوری دیکھتی

جاتی۔ اب ان کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کا ذرا سا جسم سمٹ کر صوفے میں دھنس چکا تھا۔ چائے کی پیالی خالی تھی۔ میں نے تھرماس سے مزید چائے نہیں انڈیلی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ شاید سو گئے ہیں۔ تھک گئے ہیں یا بور ہو رہے ہیں۔ لحاظ میں یا میری دل شکنی کے باعث شاید پڑھنے سے منع نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ مزید سننا شاید اب ان کے بس میں رہا بھی نہیں۔

میں نے یکا یک پڑھنا بند کر دیا۔ کچھ دیر تو وہ اسی حالت میں رہے میرا یقین پختہ ہو گیا کہ وہ سو رہے ہیں۔ میں آہستگی سے اٹھی۔ ارادہ تھا کہ جا کر پانی پیوں گی اور مجنوں صاحب کو اپنی کسی آہٹ سے چونکنے نہیں دوں گی۔ قالین پر کرسی کھسکانے سے تو کوئی آواز ہوتی نہیں لیکن غیر محسوس طور پر ایسی ضرور کوئی آہٹ ہوئی کہ مجنوں صاحب نے آنکھیں کھول دیں ڈھلکا ہوا سر اپنی سیدھ میں آ گیا۔ میں ڈر کر فوراً کرسی میں دھنس گئی ان کی آنکھیں سرخ اور کسی گہری سوچ میں تھیں۔

''مجنوں صاحب چائے اور دوں'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چائے کا گھونٹ لیکر بولے۔
''کیا پڑھتے پڑھتے تھک گئی ہو؟''
جی جی نہیں میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔
''پھر رُک کیوں گئیں؟'' مجنوں صاحب نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی۔
ان کی آنکھوں میں بہت کچھ تھا۔ لیکن میں پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر تھی ساری ہمت جمع کی۔ اور ایک بار سلسلہ پھر شروع کیا۔ اب میں کتاب کے اس حصے پر پہنچ چکی تھی جہاں سلینا کراس جو میرے ناول کی ہیروئن تھی وہ اس کشمکش میں تھی کہ وہ جس ماحول میں قدرتی طور پر اچانک پہنچ گئی تھی اس ماحول میں رچ بس جائے۔ یا چھوڑ دے۔ اٹھ جائے۔ بھاگ جائے اور بالکل مڑ کر نہ دیکھے۔

میرے لئے بھی ناول کا یہ موڑ مشکل تھا کہ میں سلینا کراس کو کدھر لے کر جاؤں۔ وہ رہنا ایک طرف چاہتی تھی۔ چل دوسری طرف رہی تھی۔ اور جانا اسے کسی

تیسری سمت تھا۔ یہ ایک ایسا موڑ تھا کہ میرا قلم خود بھی سلینا کو کوئی راستہ دکھانے سے قاصر تھا۔ سلینا دراصل مغربی معاشرے کی پیداوار تھی۔ وہیں پلی بڑھی لیکن سوچ میں اپنی ماں کے برعکس تھی۔ وہ معاشرے اور طرز زندگی سے مطمئن نہیں تھی کیونکہ اس کا باپ مشرقی تھا اور اپنا دل دماغ اس میں ڈال گیا تھا۔ مگر وہ تو پھر بھی سلینا کراس تھی۔ انور اختر اور گھر کے مختلف کردار اسے سلینا کراس سے کچھ اور بنا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ کہہ کچھ بھی نہیں رہے تھے لیکن ان کی تہذیب اور وہ ماحول جس میں سلینا کچھ دنوں کے لیے آ گئی تھی اس کی آوازیں سلینا کا بری طرح پیچھا کرتیں۔ وہ انور کے ساتھ دن بھر رہتی اور رات کو اسے سلا کر جب اپنے کمرے میں آتی تب وہ یسوع مسیح کی اس تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی جسے وہ اپنے ساتھ لائی تھی اور کمرے میں آنے کے بعد پہلا کام یہی کیا تھا کہ ایک خالی کیل تلاش کر کے تصویر اس پر آویزاں کر دی تھی۔ صبح ضروریات سے فارغ ہو کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ پوری بندگی کے ساتھ دعا مانگتی۔ ''یسوع مسیح مجھے یقین دے۔ استقامت دے کہ میں اپنے فرائض بہتر طور پر انجام دے کر واپس اپنے اسپتال لوٹ جاؤں اور دوسرے تمام مریضوں کی اسی طرح نرس بن جاؤں کہ جیسے یہاں آنے سے پہلے اپنے فرائض انجام دیتی تھی۔'' لیکن اس دعا میں اب وہ زور رہ نہیں گیا تھا۔ وہ دعا مانگنے میں ہچکچانے لگی تھی۔ واپسی کے تصوّر سے اس کا جسم ٹوٹنے لگتا۔ وہ کمزور پڑ جاتی یسوع مسیح سے نظریں چُراتی اور دھیرے دھیرے کمرے سے نکل جاتی۔

وہ ڈیوڈ کو بھولنا چاہتی تھی۔ وہ جو اس کی زندگی کا سب سے مضبوط رشتہ تھا ڈیوڈ جو اس کا مستقبل تھا۔ وہ تو انور کے گھر بس جانا چاہتی تھی۔ لیکن چاہنے کا فعل آسان اور غیر اختیاری تھا جبکہ نہ چاہنے اور چلے جانے کا تصوّر جبری تھا اور اسے یہی راستہ چننا تھا۔ الٹے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی انور کے گھر کو اپنانے کے تصوّر میں حائل تھی۔ اور غضب تو یہ ہوا کہ ایک دن اس نے اس انگوٹھی کو بیدردی سے اتار کر اپنے سوٹ کیس کے کسی ایک کونے میں رومال سے لپیٹ کر رکھ دیا۔ پھر کئی دن تک وہ یسوع مسیح کا سامنا کرنے سے کتراتی رہی۔ انگوٹھی تو اس نے پھر نہیں پہنی لیکن وہ اپنے باپ کی

بڑی طرفدار بھی نہیں تھی۔ کچھ دن بعد وہ پھر عقیدت کے ساتھ سینے پر صلیب بنا کر آنکھیں موند کے کھڑی ہونے لگی۔ یقین' اعتماد اور ثابت قدم رہنے کی دعا اب بھی اس کے لبوں پر ہوتیں۔ ایسی گھڑی ہر تھوڑی دیر کے بعد اس کی زندگی میں تواتر کے ساتھ آتی جاتی رہتی۔ وہ معافی مانگ لیتی اور پھر صلیب بنا کر یسوع مسیح کو راضی کر لیتی۔

اور یہاں سے میرے لئے بھی گزرنا آسان کام نہ تھا کہ میں نے یہ کہانی سلینا کیلئے ضرور لکھی تھی لیکن سلینا اب میری زندگی کی پرچھائیں بن چکی تھی۔ دائیں بائیں اپنے اردگرد اسے چلتے پھرتے دیکھتی۔

مجنوں صاحب بھی یہاں اس مقام پر آ کر بہت سنجیدہ ہو چکے تھے چائے کی پیالی جو پہلے منٹوں میں خالی ہو جاتی اب اسی طرح پڑی ٹھنڈی ہوتی رہتی۔ میں خاموش ہو جاتی تب وہ بھی چونک جاتے اور پیالی منہ سے لگا کر یکدم خالی کر دیتے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ ٹھنڈی چائے پئیں۔ پیالی اٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھاتی۔ تب وہ دھیمے سے کہتے ''آگے پڑھو''

وہ کہتے کچھ اس طرح کہ جیسے اس میں یہ بات چھپی ہو کہ آگے نہ پڑھو...... وہ آگے کے واقعات سے خوفزدہ تھے۔ کبھی وہ میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیتے۔ کبھی اپنی آنکھیں بند کر کے بے سکت ہو جاتے میں کن انکھیوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی یہ نہیں جان پا رہی تھی کہ مجنوں صاحب کی بے چینی کیوں ہے؟ اور کس لئے ہے۔

صبح سے دوپہر ہو چکی تھی۔ میں اب ایسے مقام پر تھی کہ نہ پڑھنے سے باز آ سکتی تھی نہ آسانی سے جاری رکھ سکتی تھی۔ بس ان کی خواہش کی پابند تھی۔ میں سامنے کی لائین مُنہ سے دہرا رہی تھی اور ذہن اس سوچ میں تھا کہ مجنوں صاحب کیا سوچ رہے ہیں۔ انہیں میری تحریر میں اس قدر دلچسپی کیوں ہے۔ یہ سوال با آوازِ بلند کرنا کچھ ایسا آسان نہ تھا کہ میرا قد بہت چھوٹا اور وہ بڑے ہی دراز قامت تھے۔

صبح سے اب شام ہو چکی تھی۔ صفحے تمام ہو گئے۔ اب ایک آخری صفحہ میرے ہاتھوں میں بچا تھا۔ مجنوں صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ سرخ سرخ

آنکھوں میں خوف، بے بسی، مجبوری، محرومی، یادیں۔ احساس اور آگے جاننے کی تمام تر خواہش رچی بسی تھی۔ میں مجنوں صاحب کی اس کیفیت سے گھبرا رہی تھی۔ میں کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ ایسا کچھ کیوں کر رہے ہیں۔ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ ان پر کیا بیت رہی ہے۔ یہ سوال بھی بڑا اہم تھا مجنوں صاحب کا میرے ناول سے کیا رشتہ ہے۔ وہ کس کردار سے قریب اور کس کردار سے دور ہونا چاہتے ہیں۔ میں یہ سب کچھ کیسے جان سکتی تھی اور یہ سب کچھ جاننا بھی ضروری تھا۔ شاید اس پر ہی اس بات کا انحصار بھی تھا کہ مجنوں صاحب کیا میرے ناول کا مقدمہ لکھنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟

آخری صفحہ میرے لئے لکھنا مشکل بھی تھا اور سنانا بھی کہ ہر بار جب جب میں نے اپنی تحریر دہرائی آنسو میری آنکھوں سے چھلک جاتے۔ میں خود بھی افسردہ ہو جاتی اور میں سوچتی کہ بہت آسان ہے میں سلینا کی ٹرین آگے جانے سے روک دوں۔ اسے اتارلوں، مخالف سمت لے جاؤں اس سمت سے کہ جدھر وہ روانہ ہوچکی ہے۔ لیکن ہر بار میں یہ نہ کر پاتی۔ حالانکہ سلینا بھی مجھے منت کرتی ملتی۔ وہ اپنی صلیب گلے سے اتار دینا چاہتی تھی اور اس کے لئے وہ میری مدد کی طالب تھی۔ مگر میں نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ وہ دور ہوگئی۔ ٹرین کی دو متوازی پٹریاں جو دور بہت دور جاکر آپس میں مل جاتی ہیں سلینا وہاں تک پہنچ چکی تھی۔ حالانکہ ٹرین کی دو متوازی پٹریاں کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل پاتیں۔ یہی تو سراب ہے اور سراب میں سلینا گم ہوچکی تھی۔ وہ ایک انجانے مقام کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں کا کوئی اتا پتا اس نے اپنے میزبانوں کے پاس نہیں چھوڑا تھا۔

اس بار میں نے گلوگیر آواز کے ساتھ باب ختم کیا اور خاموش ہوگئی۔

مجنوں صاحب پسینے میں شرابور تھے۔ ان کا نحیف سا جسم کانپ رہا تھا۔ آنکھیں بند اور دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں گتھم گتھا ان کی گود میں تھے۔ انگلیاں ہل رہی تھیں اور وہ سکتے میں تھے یہ کیفیت دیکھ کر ڈر گئی۔

اگر مجنوں صاحب کو کچھ ہو گیا تو...... آگے میں سوچ بھی نہیں پائی۔

پنکھا تیز کر دیا پیالی میں گرم گرم چائے انڈیلی۔ انہیں قدرے زور سے آواز دی۔

مجنوں صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں سرخ اور ذہن کی ہلچل محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں نے جگ سے پانی نکال کر گلاس ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس تھام لیا اور سارا پانی ایک بار ہی میں پی گئے مجھے غور سے دیکھا۔ میں نظریں چرا رہی تھی۔ امتحان گزر چکا تھا۔ نتیجے کی صبر آزما گھڑیاں تھیں۔

نہیں۔ ہاں۔ مجھے بار بار یہ دونوں فیصلے خاموش آواز میں سنائی دے رہے تھے کہ یکا یک مجنوں صاحب بولے۔

سلینا کے ساتھ تم نے جو کچھ کیا وہ منطقی تھا۔ اگر چہ یہ مشکل کام تھا۔

پھر انہوں نے نتیجہ سنایا۔ ''قلم پکڑو اور لکھنا شروع کرو۔''

یہ وہ جملہ تھا جو میری زندگی میں اس وقت بھی اہم تھا اور آج بھی ہے۔ مجنوں صاحب نے بولنا شروع کیا اور میں لکھتی گئی۔

ناول کیا ہوتا ہے؟ دنیا کے بڑے ناول کون کون سے ہیں؟ اور ان ناول کے نسوانی کرداروں کا تذکرہ کیا۔ اور پھر جب اپنے احساسات کا اظہار کیا کہ اس ناول کو سننے کے بعد میں اپنے ماضی میں چلا گیا تھا کہ آج اس عمر میں اس کی بازیافت میرے لئے بڑی خطرناک تھی۔ میں نے اپنی پوری توانائی کو استعمال کیا۔ ''مجھے فوراً پھر اسے بھلا دینا چاہیے''

یہ کہتے کہتے وہ بڑے دکھی لگ رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی انسان اپنے ماضی میں جا کر بعض اوقات کتنا کمزور ہو جاتا ہے۔ وہ کیسا پل ہوتا ہے۔ وہ کون سا لمحہ ہوتا ہے۔ وہ کون سی کمزوری ہوتی ہے جو برسوں سالوں گزرنے کے بعد بھی آنسوؤں آہوں میں گندھی ملتی ہے۔ جو دل کے کسی کونے دماغ کے کسی گوشے میں محفوظ ہوتی ہے۔ جسے نہ یاد کیا جاسکتا ہے نہ بُھلانے کی سکت ہوتی ہے۔ وہ کرب وہ دکھ وہ احساس انسان کے شریانوں میں سیّال مادّہ بن کر گردش کر رہا ہوتا ہے زندگی آگے بڑھ رہی ہوتی ہے لیکن اس کی گردن پیچھے مڑی اس نشانِ راہ کو تک رہی ہوتی ہے جو معدوم بھی ہو چکا ہے لیکن

پوری طاقت اور توانائی بن کر زندہ بھی ہے۔ مجنوں صاحب ماضی کی کسی ایسی ہی یاد میں جکڑے جاچکے تھے۔ میں ان سے بہت چھوٹی تھی۔ کاش میں اس وقت ان کی ہم عمر اور ان کی دوست ہوتی تو ضرور پوچھتی کیا کوئی سلینا ان کی یاد کا مرکز ہے۔ کیا وہ اتنی اہم تھی جو آج بھی پوری طاقت کے ساتھ موجود ہے۔

میں آج بھی مجنوں صاحب کی وہ کیفیت وہ لمحے وہ دن اور انکا فیصلہ یاد کرتی ہوں تو مجھ پر وہی ساری کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو آج سے تقریباً 33 برس پہلے ایک دوپہر مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ میں اپنی یادوں میں مجنوں صاحب کو تازہ رکھتی ہوں۔ اپنے دل میں انہیں عزیز تر مانتی ہوں اور اپنی دعاؤں میں انہیں سرفہرست رکھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا فضل رکھے۔ (آمین)

نوشابہ صدیقی

(10 جون 2005ء، پروگرام بیادِ مجنوں، آرٹس کونسل آف پاکستان)

١

.....اُس کا انتخاب غلط نہیں تھا۔ وہ لڑکی ذہین بھی تھی
اورخوب صورت بھی اور یہ دونوں باتیں بیمار ذہن کے لیے
اکسیر ہوسکتی ہیں...

چھدرے چھدرے درختوں کے بیچ بنا ہوا وہ مکان کسی پرانے قلعے کی طرح باوقار نظر آرہا تھا۔ سلینا کراس کو یہاں تک کار کے ذریعے پہنچایا گیا تھا جو اسے صدر دروازے پر چھوڑ کر لوٹ گئی تھی اور وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی اس عمارت کو دیکھ رہی تھی جسے جنگل کے بیچوں بیچ بنایا گیا تھا۔ اور جس کے چاروں طرف دور دور کوئی اور مکان نہیں تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اسے خیال آیا کہ اس کے ساتھ شاید دھوکا ہوا ہے۔ مگر وہ ابھی پوری طرح حالات کی نوعیت بھی نہیں سمجھ سکی تھی کہ صدر دروازے سے ایک ملازم نمودار ہوا جس نے اسے ڈرائنگ روم میں لاکر چھوڑ دیا اور پچھلے دروازے سے اندر چلا گیا۔

سلینا نے اپنا نازک سا سوٹ کیس دبیز قالین پر رکھ دیا اور ڈرائنگ روم کے درمیان کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ دیواروں پر ہر طرف آئل پینٹ کی خوش نما تصویریں آویزاں تھیں جن کے بیچ بیچ میں جنگلی درندوں کے سر لگے ہوئے تھے جو اس بات کے گواہ تھے کہ اس کے میزبان کو شکار سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ آتش دان کے اوپر کارنس پر چند فریم کی ہوئی تصویریں بھی تھیں جن میں سے بیشتر فیملی گروپ کی

صورت میں تھیں۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ کہیں اس نے یہاں آ کر غلطی تو نہیں کی؟

وہ ایک پیشہ ور نرس تھی اور یہاں اپنی نئی ملازمت کے سلسلے میں آئی تھی۔ یہ ملازمت اسے عجیب انداز سے ملی تھی۔ شہر کے سب سے بڑے اخبار میں ایک اشتہار چھپا تھا جس میں ایک رحم دل اور خوب رُو نرس کی ضرورت کا اعلان کیا گیا تھا جو ایک مخبوط الحواس مگر بے ضرر مریض کی نگہ داشت کر سکے اور اس نے نہ جانے کیا سوچ کر درخواست دے دی تھی جس کے نتیجے میں اسے شہر سے بیس پچیس میل دور اس سنسان جگہ کا سفر کرنا پڑا تھا۔ اگر اسے ذرا بھی گمان ہوتا کہ اسے ایک ایسی جگہ لے جایا جا رہا ہے جہاں دُور دُور کوئی دُوسرا مکان نہ ہوگا تو وہ ہرگز اس ملازمت کے لیے آمادہ نہ ہوتی۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اور اس دُور افتادہ مکان کے پُر وقار ڈرائنگ روم میں بیٹھی سہمے ہوئے دل کے ساتھ یہ سوچ رہی تھی کہ اُس نے یہاں آ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ بہر حال اسے حالات پر زیادہ دیر غور نہیں کرنا پڑا۔ دبیز پردوں والے دروازے کے پیچھے سے ایک ادھیڑ عمر کا شخص داخل ہوا جس کے بال کنپٹیوں پر سے سفید ہو چلے تھے اور اس کی شخصیت کو مزید پُر وقار بنا رہے تھے۔ سلینا اسے دیکھتے ہی گڑ بڑا کر کھڑی ہو گئی۔

سسٹر کراس'' آنے والے نے مسکرا کر اِستفہامیہ لہجے میں کہا۔ اور جب جواباً سلینا نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

''مجھے افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ مجھے اطہر کہتے ہیں میں انور کا بڑا بھائی ہوں۔

''انور'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔''

''ہاں۔ تمہارے مریض کا نام انور ہے۔'' اس نے سلینا کا مطلب سمجھ کر بات پوری کی۔

''بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں انور کے بارے میں بتاتا ہوں۔ اطہر اس کے بعد صوفے پر سنبھل کر بیٹھ گیا اور اپنا پائپ سلگاتے ہوئے بولا۔

سسٹر میں تمہیں تمہاری ذمہ داریوں سے قبل از وقت آگاہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ میرا چھوٹا بھائی انور تقریباً جوان ہے اور تمہیں چوبیس گھنٹے اس کی خبر گیری کرنا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ رات کو یہ ضد بھی کرے کہ تم اس کے ساتھ اس کے کمرے میں لیٹو۔ اور...

اور.. سلینا سہم گئی۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے سسٹر۔ انور کسی بچے کی طرح معصوم ہے''

اس نے افسردگی سے کہا۔ وہ کسی چیز کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ کسی کو پریشان نہیں کرتا بس وہ دن بھر عجیب وغریب اور مضحکہ خیز حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ راتوں کو جاگا کرتا ہے۔ اور تمہارا کام یہ ہے تم اسے ان عجیب وغریب حرکتوں سے باز رکھو...''

''میں کوشش کروں گی۔'' اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

ویسے آپ کے بھائی کو شکایت کیا ہے؟

کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ وہ اور بھی افسردہ ہوگیا۔

انور فلسفہ پڑھنے لندن گیا تھا اور ہمیں وہاں سے اطلاع دی گئی تھی کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ پھر وہ جس دن سے واپس آیا ہے صحیح الدماغ نہیں ہے۔

''خیر۔ میں کوشش کروں گی کہ انور صاحب کی طرف سے آپ کی فکر کم ہوجائے۔''

شکریہ سسٹر۔ وہ کہنے لگا۔ ''میں نے انور کو اولاد کی طرح پالا ہے اور میں اسے کسی طور پر بھی پاگل خانے نہیں بھیجنا چاہتا۔ اب انور کے مستقبل کا انحصار تمہاری تربیت پر ہے۔''

''میں اپنا فرض اچھی طرح سمجھتی ہوں''

ہاں مجھے اس کا یقین ہے۔ آؤ میں تمہیں دوسرے لوگوں سے بھی ملادوں۔ یہاں تم سب کو اپنا دوست محسوس کروگی۔

اور پھر اطہر اسے گھر کے اندر لے آیا۔ گھر میں اطہر کی بہن تھی اور بیوی بھی۔ اسے پہلی بار یہ اطمینان ہوا کہ اس نے یہاں آکر غلطی نہیں کی ہے۔ اور پھر جب وہ ان دونوں سے تعارف حاصل کرچکی تو اطہر نے کہا۔

''آؤ اب میں تمہارے مریض سے بھی ملادوں''

کیا وہ یہاں نہیں رہتے؟ اس کی پریشانی پھر لوٹ آئی۔

''یہیں رہتے ہیں''۔ اطہر نے کہا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ مگر اس وقت وہ اپنی تجربہ گاہ میں ہوں گے۔

تجربہ گاہ میں۔ کیا آپ کے بھائی سائنس داں بھی ہیں۔

یہ تم خود ہی دیکھ لو گی۔
اطہر اسے مکان کے عقبی حصے میں لے گیا جہاں ایک پھوس کا طویل و عریض چھپر پڑا ہوا تھا۔ اور جب وہ اطہر کی رہنمائی میں چھپر کے اندر پہنچی تب وہاں اس نے جو کچھ دیکھا اس پر اسے بے اختیار ہنسی آتے آتے رہ گئی۔
دبلا پتلا سا تیکھے نقوش والا ایک نوجوان کانچ کے پیالے میں صابن گھولے ہوئے سرکنڈے کی نلکی سے غبارے بنا بنا کر اُڑا رہا تھا۔ وہ سرکنڈے کی نلکی میں صابن کے جھاگ بھرتا پھر پھونک مار کر ایک غبارا سا اڑاتا اور پھر جلدی جلدی اسے دور بین لگا کر دیکھتا اور جب وہ غبارا کچھ دور جا کر پھٹ جاتا تو وہ نئے سرے سے اس عمل کو دہرانے لگتا۔ وہ اپنے اس تجربے میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے کسی کے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔
انور۔ آخر اطہر نے اسے متوجہ کیا۔ دیکھو تو کون آیا ہے۔
ڈونٹ ڈسٹرب می بھائی جان! انور نے سر اٹھانے کی بھی زحمت نہیں کی۔
آج میں اپنا سیارہ چاند پر بھیج کر ہی رہوں گا۔
اطہر اور سلینا نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر سلینا دبے پاؤں آگے بڑھی اور انور کے برابر زمین پر بیٹھ گئی۔
انور چونک کر اس کی طرف پلٹا۔ اور اب سلینا نے دیکھا اس کی آنکھیں بڑی تیکھی تیکھی تھیں۔ اور اس کے گندمی چہرے پر بچوں جیسی معصومیت اور کھویا کھویا پن تھا۔
تم جاسوس معلوم ہوتی ہو۔ وہ سلینا کی طرف غرّا کر بڑھا۔
بھاگ جاؤ یہاں سے۔
نہیں انور۔ میں تو تمہاری مدد کرنے آئی ہوں۔ تم سیّارہ اُڑاؤ گے اور میں دور بین کی مدد سے اس کا رخ معلوم کروں گی۔ اور اس نے انور کے ہاتھ سے دور بین لے لی۔ اس طرح ہمارا وقت بھی بچے گا اور ہم جلد چاند پر پہنچ سکتے ہیں۔
انور نے ایک لحظہ سوچنے کے سے انداز میں اسے دیکھا۔
"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔"
پھر وہ دونوں سنجیدگی کے ساتھ کھیل میں لگ گئے۔ اور واپس ہوتے ہوئے اطہر نے سوچا

ابتدا بری نہیں ہے۔ سلینا کا انتخاب اس نے غلط نہیں کیا تھا وہ لڑکی ذہین بھی تھی اور خوب صورت بھی۔ یہ دونوں باتیں بیمار ذہن پر اچھا اثر ڈالتی ہیں۔

سلینا کو اس وقت تک انور کے ساتھ کھیل میں شریک رہنا پڑا جب تک پیالے میں گھلا ہوا صابن ختم نہیں ہوگیا۔ صابن ختم ہونے پر انور بہت زیادہ مایوس نظر آنے لگا۔

اب مجھے نئے سرے سے محنت کرنا پڑے گی۔ اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

کوئی بات نہیں ہم کل پھر کوشش کریں گے۔

اور اس بار انور نے بھرپور نظروں سے سلینا کو دیکھا۔

تم کون ہو؟

سلینا۔ سلینا کراس

سلینا کراس۔ وہ دہراتے ہوئے بولا۔ کیا تم ریڈ کراس کی لڑکی ہو؟

اوہ نہیں۔ وہ ہنس دی۔

میں ریڈ کراس کی لڑکی نہیں ہوں۔

''گڈ۔'' وہ مطمئن نظر آنے لگا۔ مجھے ریڈ کراس سے بہت ڈر لگتا ہے۔ وہ مجھے اسپتال لے جاتے ہیں۔ میرے سر پر ہتھوڑے چلاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں پاگل ہوں۔

وہ جھوٹے ہیں۔ سلینا نے کہا۔ تم پروا نہ کرو۔ بس تم میری ہر بات مانا کرو پھر تمہیں کوئی نہیں ستائے گا۔

ریڈ کراس والے بھی نہیں۔

نہیں۔ ریڈ کراس والے بھی نہیں۔

اوہ سلینا۔ وہ لپک کر بچوں کی طرح اس سے لپٹ گیا۔

اب میرا سیارہ چاند تک ضرور پہنچ جائے گا۔

سلینا سرتاپا سرخ ہوگئی۔ اسے اپنے مجنوں مریض سے اس بے تکلفی کی توقع نہیں تھی۔ بہرحال اس نے بڑی آہستگی سے انور کو خود سے علیحدہ کیا اور بولی آؤ انور اب اندر چلیں۔ شام ہونے والی ہے۔

ہاں چلو۔ اور انور نے صابن کا پیالہ اور دوربین کو اپنے نئے نئے بلیزر کی جیب میں ٹھونس لیا۔

اوہوانور تم نے سارا کوٹ خراب کر لیا۔ سلینا نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
لاؤ یہ سامان مجھے دے دو۔ انور نے اس بار بھی اس کی بات مان لی۔ سلینا نے دور بین اس کے گلے میں لٹکا دی اور پیالہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر وہ صحن سے گزرتے ہوئے اندر کمرے میں آئے جہاں چائے کی میز پر ان کا انتظار کیا جارہا تھا۔ سلینا انور کو اس انداز میں لے کر داخل ہوئی تو کئی پُر اشتیاق نگاہیں ان کی طرف اٹھ گئیں۔
بھائی جان اب میرا سیارہ چاند پر پہنچ جائے گا۔
بڑی خوشی کی بات ہے۔ اطہر نے کہا آؤ اب چائے پی لو۔
نہیں، میں لیبارٹری میں واپس جارہا ہوں میرے پاس وقت نہیں ہے۔
اطہر نے اس بار سلینا کی طرف نظریں اٹھائیں۔
ضد نہیں کرتے انور۔ آؤ ہم ایک ساتھ چائے پئیں گے۔ سلینا نے انور کا ہاتھ تھام کر اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ اور پھر خود اس کے برابر بیٹھ کر رازدارانہ انداز سے بولی، کیا تمہیں چائے پسند نہیں؟
پسند تو ہے۔ اور انور کے ہونٹ سلینا کے کان سے لگ گئے۔ مگر شکو اس میں زہر جو ملا دیتی ہے۔ اور اس کی بہن شاکرہ سمجھ گئی کہ انور نے کیا کہا ہوگا۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ سلینا نے اشارے سے اسے روک دیا۔
اچھا آج میں چائے بناؤں گی تمہاری۔ لاؤ شاکرہ چائے دانی مجھے دے دو۔ اور اس نے بڑی محبت سے پیالی میں چائے انڈیلی۔
لو انور، اس چائے میں زہر نہیں ہے۔ پی جاؤ اسے۔
اور اس روز انور نے مدتوں بعد چائے کا ذائقہ چکھا۔ پھر جب کھانے کا وقت آیا تو انور ایک بار پھر بدک گیا۔
میں نہیں کھاؤں گا کھانا۔
ارے کیوں؟
انور کے ہونٹ پھر سلینا کے کان سے لگ گئے۔
کھانا کھانے سے آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔

اس بار سلینا نے بھی سرگوشی کی۔ ارے نہیں جو کھانا نہیں کھاتے لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں۔تم خوب پیٹ بھر کر کھاؤ نہیں تو یہ سب لوگ تمہیں پاگل کہتے رہیں گے۔

اور پھر انور نے جو کھانا شروع کیا ہے تو اطہر کو سلینا کی مسیحائی پر ایمان لے آنا پڑا۔صرف چند گھنٹوں کی محنت سے سلینا نے انور کو راہ پر لگالیا تھا اور تو اور اسے خود اپنی کامیابی پر حیرت تھی۔

کھانے کے بعد سونے کا نمبر تھا اور انور بضد تھا کہ وہ نہیں سوئے گا۔

دیکھو انور تم پھر ضد کررہے ہو۔ کیوں نہیں سوؤ گے تم؟

اس بار انور نے اطہر کی نظریں بچا کر سلینا سے کہا۔ یہ لوگ روز مجھے بہلا پھسلا کر سلانا چاہتے ہیں مگر میں ان کی باتوں میں نہیں آؤں گا کیوں کہ تمہیں معلوم ہے اگر میں سوگیا تو بھائی جان مجھے ریڈکراس والوں کے پاس پہنچا دیں گے۔

اوہ انور۔ اچھا چلو ایسا کرتے ہیں کہ تم سو جاؤ۔ میں تمہارے کمرے میں جاگتی رہوں گی اور میری موجودگی میں تمہارے بھائی جان وہاں آنے کی ہمّت ہی نہیں کریں گے۔اور اس بار بھی انور نے اس کی بات مان لی۔ اس نے بچّوں کی طرح اُڑھا کر اسے سلادیا اور خود اس کے پلنگ کے برابر کرسی ڈال کر بیٹھ گئی۔ مگر انور نے اسے زیادہ دیر بیٹھنے نہ دیا۔ گڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

نہیں۔ پہلے دروازہ بند کرو۔ وہ لوگ اندر آجائیں گے اور مجھے زبردستی لے جائیں گے۔

سلینا کے لیے یہ ایک کمزور لمحہ تھا لیکن جب بہت کچھ سوچ کر وہ دروازہ بند کرنے کے لیے بڑھی تو اس نے دروازے کے باہر اطہر، شاکرہ اور اطہر کی بیوی کو کھڑا پایا۔ چناں چہ دروازہ تو اس نے بند کردیا مگر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی بہت بڑی، بے حد شرمناک قسم کی چوری کر رہی ہو۔ دروازہ بند کرکے وہ پھر اپنی جگہ پر آبیٹھی پھر جب کافی دیر بعد اس نے انور کی طرف دیکھا تو وہ جاگتا ہی ملا۔

تم سوتے کیوں نہیں انور۔ میں یہاں موجود ہوں اور میں نے دروازہ بھی بند کردیا ہے۔

''مجھے نیند ہی نہیں آرہی ہے''

کیوں تمہیں نیند کیوں نہیں آرہی؟

مجھے آتی ہی نہیں۔ بس کبھی کبھی سو جاتا ہوں اور میں تو سونا بھی نہیں چاہتا۔

انور سونا تو ضروری ہوتا ہے اس سے پھر صبح کام کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے اور تم تو کام کرنا چاہتے ہو نا۔

ہاں میں اپنا سیّارہ چاند پر بھیجنا چاہتا ہوں۔

اچھا تو تم آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ میں تمہیں سلانے کی کوشش کرتی ہوں۔

اس نے اپنی کرسی انور کے پلنگ کے قریب کھسکا لی اور انور کے بے حد الجھے ہوئے بالوں میں اپنی لانبی لانبی انگلیاں پھیرتے ہوئے پریوں اور نیند کی دیویوں کی کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔ وہ بلامقصد ایک قصّے کو دوسرے قصّے سے جوڑتی چلی گئی اور پھر جب اسے کچھ بھی یاد نہیں آیا تو وہ غیر محسوس طریقے پر کہتی چلی گئی۔

''وہ دو ہزار برس پہلے یروشلم میں پیدا ہوا تھا اور چرواہوں نے آدھی رات کو اس کے مولد پر ستارے کو اُترتے دیکھا تھا''۔

انور سنتے سنتے سو چکا تھا اور جب سلینا نے دن بھر کی اس آخری فتح کو محسوس کیا تو وہ خود بھی اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے انور کا کمبل برابر کیا اور پھر بتی گُل کرنے سے پہلے بھرپور نظروں سے انور کے چہرے کو دیکھا جس پر معصومیت اور کھوئے کھوئے پن کے علاوہ اسے اور کوئی چیز نظر نہ آئی۔ پھر اس نے نہ جانے کس جذبے کے تحت جھک کر اس کے سینے پر اشارے سے صلیب کا نشان بنایا اور باہر نکل آئی۔

دوسرے کمرے میں اطہر، نجمہ اور شاکرہ سب ہی سلینا کے منتظر تھے۔ سلینا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ہاتھ کے اشارے سے انور کے سو جانے کا اعلان کر دیا۔ جس نے سب کو ایک ساتھ مرعوب کر لیا۔

شاکرہ خوش ہو کر بولی۔ سسٹر آپ کو تو جیسے جادو آتا ہے۔ کہاں تو بھیّا کئی کئی راتیں جاگا کرتے تھے اور کہاں وہ دس بجے سو گئے۔

نجمہ نے کہا۔ اب آپ بھی تو آرام کیجیے سسٹر صبح سے اب تک آپ مصروف ہیں۔

اطہر کہنے لگا۔ میں تم سے بہت متاثر ہوا ہوں سلینا۔ اور آج میں بھی نیند بھر سو سکوں گا۔

اطہر کی آواز میں انتہا درجے کی ممنونیت تھی اور اس کی آنکھوں سے نمی جھلک رہی تھی۔

یہ سب میرے فرائض میں داخل ہے اور میں اپنا کام کر رہی ہوں۔ امید ہے آپ لوگوں کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

ہم سب انور کی اس حالت سے بے حد پریشان ہیں۔ نہ پوچھو ہماری زندگی کیسی گزری ہے۔ اور جانے کب تک ہمیں انور کو ایسا ہی دیکھنا پڑے گا۔ وہ کب ٹھیک ہوگا؟

اطہر کے لہجے میں اپنائیت بھی تھی افسردگی بھی اور تشویش بھی۔

ہمیں اچھی امید رکھنی چاہیے۔ سلینا نے آہستگی سے کہا اور اپنے کمرے میں آئی تو وہ تھکن سے چُور تھی۔ پچیس میل کے پہاڑی سفر کے بعد تمام دن اسے دم مارنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ چنانچہ وہ لباس تبدیل کیے بغیر بستر پر گر پڑی اور اس وقت تنہائی میں پہلی بار جب اسے سوچنے کا موقع ملا تو اسے یہ احساس ہوا کہ اس وقت وہ اپنے اسپتال سے بہت دور اجنبیوں کے درمیان تھی۔ لیکن اسے یہ اجنبی یقیناً پسند بھی آئے تھے اور اسے کسی بھی قسم کی الجھن محسوس نہیں ہوئی۔

وہ ایک پیشہ ور نرس تھی اور اس کے لیے اس قسم کی خدمات کوئی نئی بات نہیں تھی۔ لیکن جس انداز میں اسے یہاں اپنایا گیا تھا وہ اس کے لیے بہر حال نئی بات تھی۔ انور کے گھر والے ملنسار اور خلیق تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی تنخواہ بھی اس کی توقع سے بہت زیادہ مقرر ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب وہ ڈیوڈ پر اپنی لیاقت کا رعب جما سکے گی۔ اور پھر ڈیوڈ کا خیال آتے ہی اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی دوسری انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی کو دیکھا جس نے اسے اور ڈیوڈ کو ایک نئے رشتے میں منسلک کر دیا تھا۔ اور یہ سوچ کر کہ وہ بہت جلد ایک ہونے والے ہیں سلینا کو بڑی شدّت سے ڈیوڈ یاد آیا جو اس سے کئی ہزار میل دور گوامیں تمباکو کا اسٹور چلاتا تھا اور اسے ہر ہفتے بے شمار پیار بھرے خطوط لکھا کرتا تھا۔

پُور پُور ڈیوی۔ اس نے انگوٹھی کو بے اختیار چوم لیا اور اسے ایسا لگا جیسے ان کے درمیان کا فاصلہ ایک دم ختم ہو گیا ہے اور وہ ڈیوڈ کے اسٹور میں کاؤنٹر پر کہنیاں ٹیکے اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی ہے۔

اور پھر اپنی ہی مسکراہٹوں میں کھو کر وہ سو گئی۔

۲

.....اُس نے اُسے سامنے کھڑا کر کے اس طرح دیکھا جیسے کوئی ماں اپنے ناسمجھ بچے کو اسکول بھیجنے سے پہلے ناقدانہ نظروں سے دیکھتی ہے... اور وہ ذہنی طور پر بچہ ہی تو تھا...

صبح وہ دیر تک سوتی رہی پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو کھڑکی سے دھوپ چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ اس نے بیدار ہوکر اپنے گردوپیش پر ایک اطمینان کی نظر دوڑائی اور جب اس کی نظریں سامنے دیوار پر لگی ہوئی کنواری مریم کی تصویر پر پہنچیں جسے اس نے کل خود آویزاں کیا تھا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے مریم کی پُر شفقت نظریں اسے خلافِ معمول دیر سے اٹھنے پر سرزنش کر رہی ہوں۔ اور اس نے یہ بات اتنی شدت سے محسوس کی کہ وہ فوراً ہی مریم کے سامنے دوزانو ہوکر دعائیں مانگنے میں مصروف ہوگئی۔

مگر ابھی اس کی آدھی دعا بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے انور کی آواز سُنی ۔

سلینا۔ سلینا کہاں ہوتم؟ ارے بھائی جان۔ شاکرہ۔ شاید وہ چلی گئی۔ اب میرا سیّارہ چاند پر کیسے پہنچے گا؟

اور نہ جانے کیوں سلینا دعا کے درمیان ہی مسکرا پڑی۔ اس نے جلدی جلدی دعا ختم کی اور جیسے ہی وہ باہر نکلی انور اس کی طرف دوڑ پڑا۔

سلینا۔ اوہ سلینا میں سمجھا تھا شاید تم چلی گئیں۔ آؤ ہم تجربہ گاہ میں چلیں۔ تم نے چائے پی؟

سلینا نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا ''نہیں تو''۔

منہ بھی نہیں دھویا؟

نہیں۔

پھر میں تمہارے ساتھ نہیں چلتی۔ اس نے کہا

کیوں؟ کیا تم بھی مجھے پاگل سمجھتی ہو؟

نہیں۔ میں تم سے خفا ہوں

ارے۔ نہ جانے لوگ مجھ سے خفا کیوں ہو جاتے ہیں۔ انور کہنے لگا۔ ضرور شگو کی بچی نے تم سے لگائی بجھائی کی ہوگی۔

نہیں۔ شاکرہ نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ وہ بولی۔

میں تو تم سے اس لیے خفا ہوں کہ تم میری بات ہی نہیں مانتے۔

ہاں جاؤ میں نہیں مانتا۔ میں کسی کی بھی بات نہیں مانتا۔ وہ بدک گیا۔

تمہاری مرضی۔ مگر پھر تمہارا سیارہ زمین سے اوپر نہیں جائے گا۔

اس پر انور نے اسے ایسے دیکھا جیسے سلینا نے اسے کاٹ کھایا ہو۔ وہ تھوڑی دیر ہونٹ کاٹ کاٹ کر اپنے بہکے ہوئے ذہن سے کچھ سوچتا رہا پھر آہستہ سے ہار جانے کے انداز میں بولا۔

اچھا بتاؤ تم مجھ سے کیا کرانا چاہتی ہو؟

سلینا بولی۔ پہلے تم نہاؤ گے۔ تمہارے بالوں میں تیل لگایا جائے گا۔ تم صاف کپڑے پہنو گے اور پھر میرے ساتھ ناشتا کرو گے اور اس کے بعد ہم لیبارٹی میں چلیں گے چلو میں تمہیں غسل خانے میں لیے چلتی ہوں۔

میں نہیں نہاؤں گا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔

کیوں تمہیں ڈر کیوں لگتا ہے۔ مجھے تو نہیں لگتا۔ سلینا نے کہا۔

اس لیے کہ میں ڈوب جاؤں گا؟ وہ بولا۔ اور پھر سلینا سے خوشامدانہ لہجے میں کہنے لگا۔ اچھا دیکھو میں کپڑے بدلے لیتا ہوں۔

نہیں پہلے تم نہاؤ گے۔ سلینا نے ضد کی۔ اچھا چلو میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔ اور تمہیں ڈوبنے سے بھی بچاؤں گی۔ ٹھیک ہے۔

ہاں ٹھیک ہے۔ وہ آمادہ ہوگیا۔
پھر سلینا نے اسے بچوں کی طرح صابن سے مل مل کر نہلایا۔ اس کے بالوں میں تیل لگایا جو بالکل رُوکھے ہور ہے تھے۔ کنگھی کی۔ کپڑے بدلوائے اور پھر جب یہ سب کچھ ہوگیا تو اس نے انور کو اپنے سامنے کھڑا کر کے اس طرح دیکھا جیسے کوئی ماں اپنے ناسمجھ بچّے کو اسکول بھیجنے سے پہلے ناقدانہ نظروں سے دیکھتی ہے۔ انور ذہنی طور پر تو خیر بچّہ تھا ہی مگر عمر کے اعتبار سے بھی یقیناً وہ سلینا سے چھوٹا ہی ہوگا۔ بمشکل اسکی عمر چوبیس سال کی ہوگی جو اس کے چھریرے بدن اور چہرے کی معصومانہ ساخت کی وجہ سے اور بھی کم معلوم ہوتی تھی۔ سلینا نے ان چوبیس گھنٹوں میں پہلی بار انور کو اس کے صحیح خدوخال میں دیکھا تھا۔ جب وہ آئی تھی تب انور گندا لباس پہنے ہوئے تھا اور اس کے جسم پر گندگی کے نمایاں اثرات نظر آرہے تھے۔ اس کے بال گرد سے اٹے ہوئے تھے اور آنکھیں مسلسل بے خوابی کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔ اور آج جب انور نہا لیا تھا اور اس کے بالوں میں سلیقے سے کنگھی کی گئی تھی اور اس کے جسم پر معقول اور صاف ستھرا لباس تھا تو وہ چوبیس گھنٹے پہلے والے انور سے قطعی مختلف نظر آرہا تھا۔ یہ فرق بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی دھول سے اٹے ہوئے شیشے کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا گیا ہو۔ چنانچہ سلینا اس کے لڑکپن کے اس بانکپن سے جو مردانہ حُسن سے گلے مل رہا تھا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

اور پھر اس روز انور نے اچھے بھلے آدمیوں کی طرح ناشتا کیا۔ ناشتے کے دوران ڈاکٹر آ گیا۔ اور خلافِ توقع انور کو صحت مند انسانوں کی طرح کھاتے دیکھ کر متحیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر انور ڈاکٹر پر نظر پڑتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔
مجھے بچاؤ سلینا۔ میں انجکشن نہیں لگواؤں گا۔ یہ مجھے مار ڈالنا چاہتا ہے۔
کوئی انجکشن نہیں لگائے گا۔ تم ناشتا کرتے رہو۔ سلینا نے اسے سمجھایا مگر اس کی نظریں ڈاکٹر کو سمجھانے میں مصروف تھیں۔
نہیں۔ پہلے تم اس سے کہہ دو کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ انور کا اشارہ ڈاکٹر کی طرف تھا جو فوراً ہی دوسرے کمرے میں چلا گیا۔
انور یہ بدتمیزی ہے۔ بڑوں سے اس طرح بات نہیں کرتے۔ سلینا نے اسے ٹوکا۔

تم نہیں جانتیں یہ ڈراکیولا ہے سلینا۔ انور نے اسے رازداری سے بتایا۔
ڈراکیولا؟ سلینا نے حیرت سے پوچھا۔
ہاں یہ ہر صبح میرا خون پینے یہاں آتا ہے۔
بیکار کی باتیں نہیں کرتے انور۔ سلینا نے پھر سمجھایا۔
اچھا چلو میں تمہیں دکھائے دیتا ہوں۔ انور ڈاکٹر کی طرف دوڑ پڑا۔
سلینا نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں کی۔
ڈاکٹر دوسرے کمرے میں اطہر سے باتیں کر رہا تھا۔ مگر انور کے داخل ہوتے ہی گڑ بڑا کر کھڑا ہوگیا۔
ہوشیار۔ انور نے اسے للکارا۔
میں آج تمہیں بھسم کردوں گا۔
سلینا باوجود کوشش کے ہنسی ضبط نہیں کرسکی۔ ڈاکٹر سہمے ہوئے انداز میں انور کو دیکھ رہا تھا اور اطہر کی شرمندگی ناقابلِ بیان تھی۔
آخر سلینا نے آگے بڑھ کر انور کو روکا۔
انور تمہیں ڈاکٹر کا احترام کرنا چاہیے۔ یہ بدتہذیبی ہے جو تم کر رہے ہو۔
شٹ اپ۔ انور حلق پھاڑ کر چیخا۔ انور تمہیں یہ کرنا چاہیے۔ انور تمہیں وہ کرنا چاہیے۔ یہ بدتہذیبی ہے۔ یہ نہ کرو۔ آخر تم مجھے سمجھتی کیا ہو؟
یہ بات ہے۔ سلینا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
تو پھر میں جارہی ہوں۔ میں بہت بُری ہوں۔ میں تمہیں کئی کام سے روکتی ہوں۔ تمہیں تمہاری مرضی کے کام کرنے سے روکتی ہوں۔ پھر میں یہاں کیوں رہوں۔ میں جارہی ہوں۔ ٹھیک ہے نا۔
خلافِ توقع انور کے چہرے سے وحشت کے آثار دور ہوگئے۔ وہ جلدی سے بالکل اضطراری انداز میں اس کی طرف بڑھا اور پھر کچھ سوچ کر ڈاکٹر کی طرف لپکا اور اس سے لپٹ گیا۔ یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ ڈاکٹر کو اپنا چشمہ سنبھالنا مشکل ہوگیا۔
ڈاکٹر صاحب آپ برامت مانیے گا۔ آپ مجھے بُرے نہیں لگتے۔ یہ سب شکو کی شرارت

ہے وہ کہہ رہی تھی کہ آپ ڈراکیولا ہیں۔ شاید وہ یہ کہہ کر سلینا کو منانا چاہتا تھا۔
ڈراکیولا؟ ڈاکٹر جھینپی جھینپی سی ہنسی ہنس دیا۔
تم شکوکی باتوں میں نہ آیا کرو۔ وہ تم سے مذاق کرتی ہے اور تم اسے سچ سمجھ جاتے ہو۔ اب پھر سلینا آگے بڑھی۔
کیا انجکشن لگوانے سے بھی وہ منع کرتی ہے۔
نہیں۔ وہ تو میں خود نہیں لگوانا چاہتا۔ میرے بدن میں اب خون ہی نہیں ہے۔
مگر انجکشن تو تمہارا خون بڑھانے کے لیے لگایا جاتا ہے۔ سلینا نے چال چلی
جھوٹ۔ تم بھی مجھ سے مذاق کر رہی ہو.....
اس بار سلینا نے ٹھوس سیاست کا مظاہرہ کیا۔ اس نے انور کے کان میں کہا۔
ڈاکٹر کے انجکشن کی بات نہیں کر رہی ہوں پارٹنر۔ آج سے میں تمہیں انجکشن لگایا کروں گی۔ میرے پاس خون بڑھانے والے انجکشن ہیں۔
اچھا۔ تمہارے پاس بھی انجکشن ہوتے ہیں۔ انور نے حیرت سے سلینا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
ہاں ہاں۔ میرے پاس بہت سارے ہیں۔ اس نے کہا۔
چلو ناشتا کرو۔ میں انجکشن تیار کر کے لاتی ہوں۔
دھوکا تو نہیں دوگی۔ انور نے شک سے پوچھا۔
اگر تم نے ڈاکٹر کا انجکشن لگا دیا تو میں مر جاؤں گا۔
نہیں انور میں تمہیں دھوکا کیوں دوگی۔ ہم تو اب اچھے دوست بن چکے ہیں۔ میں ہرگز تمہیں ڈاکٹر کا خون چوسنے والا انجکشن نہیں لگاؤں گی۔
اچھا چلو میں تمہاری بات مان لیتا ہوں مگر یاد رکھو اگر تم نے مجھے دھوکا دیا تو میں تمہیں بھی بھسم کر دوں گا۔
منظور۔ سلینا نے کہا۔
انور ناشتے کی میز پر بیٹھ گیا اور جلدی جلدی ناشتا کرنے لگا۔
تھوڑی دیر بعد جب سلینا ڈاکٹر کی مدد سے انجکشن تیار کر کے انور کے پاس لے گئی تو اس

نے بے چوں و چرا بازو آگے بڑھا دیا۔
اب کیا خیال ہے تمہارا؟ میں نے تمہیں دھوکا تو نہیں دیا۔ اچھا انجکشن لگایا ہے نا اس نے انور کا بازو تھپتھپایا۔
تم ٹھیک کہتی تھیں۔ تم میری دوست ہو۔ اور اب تو میرے جسم میں خون بھی بڑھنے لگا ہے۔ اس نے اپنے بازو کو طاقتور محسوس کرتے ہوئے کہا۔
چلو اب لیبارٹری چلیں مجھے اپنا سیارہ چاند پر پہنچانا ہے، دیر ہوگئی ہے۔
چلو۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ دیر ہوگئی ہے۔ ناشتا کرنے کے بعد اور انجکشن لگانے کے بعد جب خون بڑھ جاتا ہے جسم میں، تب ہی سیارہ چاند پر بھیجا جاسکتا ہے ورنہ وہ راستے ہی میں رہ جاتا ہے۔ سلینا نے اسے آیندہ کے لیے بھی سمجھا دیا۔
تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ بات مجھے پہلے معلوم ہی نہیں تھی۔ اور مجھے کسی نے بتایا بھی نہیں تھا۔ جب ہی تو میرا سیارہ راستے ہی میں ٹوٹ جاتا تھا۔ مجھے پھر سے بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔

اور اس روز پھر سلینا کو دیر تک اس کے ساتھ صابن کے غبارے اُڑانے پڑے۔ ان کی واپسی تک دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک تھا۔ اور پھر جب وہ گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ ڈاکٹر کو باہر تک رخصت کرنے آئی تو ڈاکٹر نے چلتے چلتے اسے بتایا۔
سسٹر کراس۔ انور ابھی پاگل پن کی حدود سے بہت دور ہے۔ یہ کسی گہرے صدمے کا ردِ عمل ہے۔ ایک ایسی کیفیت ہے جسے ہم ابھی کوئی نام نہیں دے سکتے۔ اسے صرف شفقت کی ضرورت ہے۔ اور میرا خیال ہے تمہاری کوششیں کامیابی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔
اور تب سلینا نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس گہرے صدمے کی جڑیں تلاش کر کے رہے گی۔

۳

..... کنواری ماں... وہ کسی بھیڑ کے بچے کی طرح معصوم ہے۔
وہ جس نے یَروشلم میں کانٹوں کا تاج پہنا تھا،
وہ جس نے اپنی صلیب کو کاندھا دیا تھا...
کنواری ماں! میں تمہیں اس مقدس دُکھ کا واسطہ دیتی ہوں ۔ اس نے اتنی لگن سے دُعا مانگی کہ اس پر رعشہ طاری ہوگیا...

پاگل پن کی ایک وجہ موروثی اثرات بھی ہوسکتے ہیں یا پھر زیادہ سے زیادہ خانگی بے اطمینانی۔ لیکن سلینا کا اندازہ تھا کہ انور کی ذہنی بے ربطی کی وجہ ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ جہاں تک وہ معلوم کرسکی تھی اس کے والدین نارمل انسان تھے اور صحت مند تھے۔ رہے خانگی حالات وہ اگر رشک انگیز نہیں تو قابلِ ستائش ضرور تھے۔ انور اپنے بڑے بھائی اطہر۔ اس کی بیوی نجمہ اور بہن شاکرہ کا بیک وقت لاڈلا تھا۔ اطہر نے اسے والدین کی وفات کے بعد اولاد کی طرح پالا تھا اور اس کے لیے ہر وہ چیز مہیا کرنے کی کوشش کی تھی جو اس کی استطاعت میں تھی۔ ذاتی طور پر انور کا کردار بھی نارمل تھا۔ اس نے بیس یا اکیس سال کی عمر میں فلسفہ میں ایم اے کیا تھا اور پھر اسی سال وظیفہ لے کر انگلستان چلا گیا تھا۔ وہاں وہ دو سال تک فلسفہ پڑھتا رہا اور پھر وہیں سے اس کے ذہن میں فتور آ گیا۔ سلینا کا بہر حال اندازہ یہی تھا کہ انور کے مرض کی ابتدا کہیں نہ کہیں لندن ہی میں ہوئی تھی۔ وہ گہرا صدمہ جس کا ردِ عمل یہ ذہنی بے راہ روی تھی انور لندن ہی سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور اس صدمے کی واحد وجہ ایک اجنبی ملک میں صرف محبت ہی ہوسکتی ہے۔ ناکام محبت۔ مگر محبت انسان کو پاگل تو نہیں بنا دیتی۔ اور پھر لندن کی محبت اتنی رومانی

کب سے ہونے لگی کہ انور اپنا ذہنی توازن ہی کھو بیٹھے۔
ہاں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انور شاید صحیح الدماغ کی حالت میں بے انتہا حساس ہو۔ اگر وہ شدید حساس قسم کا انسان تھا اور اس نے محبت کی تھی تو پھر اس کی محبت بھی انتہائی شدید ہی ہوگی۔ انتہائی جذباتی اور اگر اس محبت میں اسے بے وفائی ملی ہو۔ ناکامی کا سامنا ہوا ہو تو پھر یہ قطعی ممکن ہے کہ اس حساس انسان نے اپنے دل کا درد، دماغ میں منتقل کر دیا ہو اور یہ ذہنی کرب دماغی اختلال کی صورت میں نمایاں ہوگیا ہو۔

ہاں یہ ممکن تھا۔ انور کے دل کی چوٹ دماغ نے قبول کی تھی۔ اور اس کی چوٹ کا سراغ بھی کہیں نہ کہیں اس کے بہکے ہوئے ذہن ہی میں پوشیدہ تھا۔ یہ سراغ اسے صرف انور ہی سے مل سکتا تھا۔ اور اس سلسلے میں اسے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ باتوں باتوں میں ایک دن اس نے انور سے پوچھ لیا۔

''انور تمہیں اس کا نام یاد ہے۔''

کس کا؟ انور حیران ہوا۔

وہ جو سنہرے بالوں والی لڑکی تھی نا تمہاری کلاس میں۔ سلینا نے قیاس کا تیر پھینکا،

سنہرے بالوں والی لڑکی؟ کب کی اور کس کی بات کر رہی ہو تم؟

اس کے چہرے پر سوالات کی بے شمار پرچھائیاں تھیں۔

میں لندن کی بات کر رہی ہوں۔ سوچ کر بتاؤ۔ سلینا نے غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

لندن کی بات؟ وہ ہنس پڑا۔ صرف اس کی ہنسی ہی سے اس کی ذہنی بے ربطی کا پتہ چلتا تھا۔ یہ شکّو بھی بڑی شریر ہے سلینا۔ سب سے کہتی پھرتی ہے کہ میں لندن سے آیا ہوں۔ بتاؤ کیا یہ صحیح ہوسکتا ہے؟ انور سراپا سوال تھا۔

ہاں کیوں نہیں؟ یہ بات تو سچ ہی ہے کہ تم لندن گئے تھے اور وہاں سے اب آگئے ہو۔ سلینا نے بات آگے بڑھائی یا یہ کہ انور کو یقین دلایا کہ وہ لندن گیا تھا اور وہ وہیں سے آیا ہے۔

فضول۔ میں لندن کبھی گیا ہی نہیں۔ انور جھنجلا گیا۔

پھر پچھلے برس تم کہاں تھے؟ کہاں پڑھتے تھے۔ تمہارا کالج کہاں تھا؟ سلینا نے پوچھا۔
تھا کہاں؟ یہیں تھا۔ وہ بتانے لگا۔ میں کسی کالج والج میں نہیں پڑھتا تھا سلینا۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ تم مجھے کیوں ستا رہی ہو؟
تم تو کہتی ہو کہ تم میری دوست ہو۔ دوست ایسے ہوتے ہیں کیا؟ انور نے الٹا اس سے ہی سوال کر دیا۔
نہیں، دوست ہرگز نہیں ستاتے وہ تو بس اپنے دوست کی بھلائی چاہتے ہیں۔
سلینا نے پیار سے انور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
مگر لندن جانے میں میری کیا بھلائی ہے؟ تم کیوں چاہتی ہو کہ میں کہوں کہ میں لندن سے آیا ہوں؟ انور نے جرح کی۔
سلینا بغور انور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اچھی گفتگو کر سکتا تھا۔ دلیل بھی دے سکتا تھا۔ اچھا برا بھی سمجھ سکتا تھا۔ اسے دوست اور دشمن کی بھی پہچان تھی۔ مگر اس کے ذہن میں کہیں نہ کہیں خرابی ضرور موجود تھی۔ وہ بہک گیا ہے۔ وہ سب کچھ بھول چکا ہے۔ اسے اپنا ماضی بالکل یاد نہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ وہ یہاں تھا تب کیا کرتا تھا۔ اور اگر وہ لندن میں تھا تب وہاں کیا کرتا تھا۔ وہ تو صرف آج میں زندہ تھا۔ صبح سے شام تک بس اس کی دنیا تھی اور بس وہی اس کی گرفت میں بھی تھی۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس کے دل میں تکلیف کی ایک لہر اٹھتی۔ یہ جوان خوب صورت سا لڑکا اپنی زندگی کہیں ڈال کر بھول گیا ہے۔ نہ جانے اس نے اپنی زندگی کے کتنے ہی خوب صورت خواب دیکھے ہوں گے۔ نہ جانے اس نے اس کی کتنی تیاری کی ہوگی۔ وہ کہاں تک پہنچا ہوگا۔ کہاں رک کر رہ گیا کہ اب وہ اس سے آگے جا ہی نہیں سکتا۔ زندگی کا سب سے خوب صورت دور کسی بھی انسان کا ماضی ہوتا ہے وہ اس کے لیے ایک گمشدہ باب بن کر رہ گیا ہے۔ باقی کی زندگی کا اب مقصد کیا ہے؟ کیا وہ ہر صبح اپنی لیبارٹری میں جا کر اپنا سیارہ چاند پر بھیجنے کی کوشش میں فنا ہو کر رہ جائے گا۔ زندگی کی ساری خوب صورت شاہ راہیں اس کے لیے بے معنی ہو گئی ہیں۔ وہ کسی ایک بھی شاہ راہ پر بغیر کسی کی مدد کے نہیں چل سکتا۔ کسی بھی ایک مقصد کو اپنا مقصد نہیں بنا سکتا۔
دن رات صبح شام کیلینڈر کی تاریخیں بدلتی رہتی ہیں۔ پھر کیلینڈر بھی

بدل جاتے ہیں ماہ وسال بدلتے رہتے ہیں۔ جسمانی ساخت میں تبدیلی آجاتی ہے۔ جوانی چلی جاتی ہے۔ بالوں میں چاندی پھیل جاتی ہے۔ قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں۔ ٹانگیں تھک جاتی ہیں۔ ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔ بینائی بھی متاثر ہوجاتی ہے۔ سب کچھ دھندلا دھندلا ہوجاتا ہے۔ اپنے، بہت اپنے قبروں میں چلے جاتے ہیں۔ کہیں سے مدد کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ تنہا انسان جی نہیں پاتا اسے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے بچّوں کی ضرورت ہوتی ہے جو ایسے کمزور لوگوں کا بازو ہوتے ہیں ٹانگیں اور ہاتھ ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی وہ روشنی ہوتے ہیں۔ مگر اس کے لیے انسان کا صحیح الدماغ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس ایک کمی کے باعث کون انہیں اپناتا ہے؟

کون انور کو اپنائے گا؟ اس نے زمانے کے سارے مرتے جاتے سال منٹوں میں طے کر لیے سامنے بھولا بھالا انور بیٹھا تھا۔ میں بھلا کب تک اس کے ساتھ رہوں گی۔ اس نے اس امکان کو بھی تلخی سے سوچا۔ مجھے انور کو ٹھیک کرنا ہے۔ ہر صورت میں اس کی مدد کرنی ہے۔ مگر کیسے؟

اچھا ایسا کرو؟ بہت کچھ سوچ کر اس نے انور سے کہا۔

تم ایک کاغذ پر ان تمام لوگوں کے نام لکھو جنہیں تم جانتے ہو؟

میں کسی کو نہیں جانتا۔ انور نے حتمی جواب دے دیا۔

سلینا نے کچھ سوچا پھر بولی۔

تم کیوں نہیں کسی کو جانتے ہو؟ کیا تم مجھے نہیں جانتے؟ اطہر بھائی جو ہیں۔ شاکرہ تمہاری بھابھی۔ اور۔ ابھی سلینا اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ وہ چہکا۔

اچھا اچھا تو یوں کہو نا کہ تم ان کے نام لکھنے کو کہہ رہی ہو۔ پھر وہ کچھ سوچ کر بولا ان کے نام لکھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ تم جانتی تو ہو ان کے نام۔ میرے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ انور نے پھر جرح کی۔

سلینا یہ سمجھ رہی تھی کہ انور کا ذہن کام کر رہا ہے لیکن صرف موجودہ صورت کی گفتگو میں ماضی کا ذکر آتے ہی وہ بدک جاتا ہے۔

''اچھا لاؤ مجھے کاغذ دے دو'' انور نے گویا نام لکھنے کی آمادگی ظاہر کر دی۔

سلینا نے کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا اور انور سوچ سوچ کر اس پر قلم چلانے لگا۔ سلینا اسے محویت سے لکھتا دیکھتی رہی۔ اس نے قلم اپنی انگلی میں کسی چھوٹے سے بچے کی طرح پکڑا ہوا تھا ایسے جیسے اس نے ابھی ابھی کچھ لکھنا سیکھا ہے۔ وہ پورے کا پورا کاغذ پر جھکا ہوا تھا جیسے بچّے پہلے پہل لکھتے وقت سر نیچے تک جھکا دیتے ہیں۔ اس کے دل میں انور کے لیے پھر رحم کا جذبہ سرابھارنے لگا۔ یہ وہی انور ہے جس نے فلسفہ جیسے مضمون میں ایم اے کیا ہے اور یہ وہی انور ہے جسے وظیفہ ملا اور وہ لندن پی ایچ ڈی کرنے گیا تھا۔ اتنی بلندی سے گر کر وہ پھر اپنی اسی ابتدائی زندگی تک آ گیا جب کہ اس نے پہلے پہل قلم پکڑنا سیکھا تھا۔

اس نے ایک آہ کے ساتھ سوچا آخر قدرت نے اس کے ساتھ ایسا مذاق کیوں کیا؟

وہ خوف سے لرز گئی۔ ایسا تو کسی کے بھی ساتھ ہوسکتا ہے۔ اس نے پھر عقیدت سے اپنے سینے پر صلیب بنائی اور ہر ایک شخص کو ایسے حالات پیش آنے سے روکنے کے لیے اپنے یئسوح مسیح سے دعا کی۔ اس نے تو اب سے جانے کتنی ہی بار چلتے پھرتے انور کا نام لے کر بھی دعا مانگی تھی۔ جذبۂ ہمدردی میں بھی اور اس لیے بھی کہ وہ اب براہِ راست پیشہ ورانہ طور پر اس سے منسلک ہو چکی تھی۔

اچانک انور چیخا میں نے سارے نام لکھ دیے لو تم بھی دیکھ لو اس نے کاغذ سلینا کی طرف بڑھا دیا۔ تب سلینا مسکرادی۔ وہ سمجھی انور اسے ستانا چاہتا ہے کیوں کہ کاغذ پر آڑی ترچھی لکیروں اور چند بے ربط ہندسوں کے علاوہ اور کچھ نہیں لکھا گیا تھا۔

یہ تم نے کیا لکھا ہے انور؟ اس نے ان لکیروں پر اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے سوال کیا

کیوں؟ کیا تم پڑھ بھی نہیں سکتیں؟ اس نے بچّوں جیسی حیرت کے ساتھ پوچھا۔ لاؤ میں پڑھ کر بتاؤں؟ اس نے سلینا پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔ میں تمہیں پڑھنا بھی سکھا سکتا ہوں۔ مجھ سے سیکھو گی؟ اس نے سلینا سے پوچھا۔

کیوں نہیں؟ تم مجھے سکھاؤ گے تب میں کیوں نہیں سیکھوں گی۔ سلینا نے محبت سے جواب دیا۔

مگر تم تو بڑی ہوگئی ہو سلینا، تم نے اب تک کیوں نہیں سیکھا؟ انور نے پوچھا۔ دراصل مجھے

کسی نے کہا ہی نہیں؟ سلینا نے بھولپن سے جواب دیا۔
بُری بات ہے لکھنا تو آنا ہی چاہیے؟ اس نے اپنی آنکھیں بچاتے ہوئے فیصلہ صادر کردیا۔
ہاں یہ بات تو ہے؟ سلینا بھی مان گئی۔
لاؤ مجھے میں تمہیں پڑھ کر بتاؤں۔ انور نے پھر کاغذ اپنی طرف کرلیا۔
اور پھر انور نے اپنے بنائے ہوئے خطوط کی جو تشریح کی وہ کچھ اس طرح تھی۔
ΔW یہ ہے اطہر علی۔ تم جانتی ہونا وہی ہمارے بھائی جان۔
ہاں ہاں میں جانتی ہوں تمہارے بھائی جان کا نام اطہر علی ہی ہے۔
Wox یہ ہے نجمہ بھابھی۔ انہیں بھی جانتی ہونا۔ وہی جو کتنے اچھے اچھے کھانے بناتی ہیں۔
تمہیں اچھی لگتی ہیں وہ؟ اس نے سلینا سے سوال بھی کردیا۔
ہاں میں تمہاری نجمہ بھابھی کو بھی جانتی ہوں۔ وہ مزیدار کھانے بناتی ہیں۔ مگر وہ افسردہ ہوجاتی ہیں جب تم ان کے کھانے، کھانے سے انکار کردیتے ہو۔ وہ تو رونے لگ جاتی ہیں۔ تم ایسا کیوں کرتے ہو انور۔ سلینا نے انور سے پوچھ لیا ہاں میں پہلے نہیں کھاتا تھا مگر اب تو تمہارے کہنے سے کھالیتا ہوں نا۔ اب ضرور کھایا کروں گا۔ پھر وہ نہیں افسردہ ہوں گی۔ ہے نا۔ انور نے کہا۔
اب دیکھو یہ ہے نام شاکرہ کا Ps3
اور ایک تم بھی تو آگئی ہو میں تمہارا نام بھی لکھ لیتا ہوں۔ دیکھو انور نے سلینا کے نام کی طرف اشارہ کیا جو کچھ یوں تھا۔ X8
اور پھر اس طرح کے بے شمار ناموں سے وہ کاغذ بھرا ہوا تھا۔ یہ یقیناً ایسی ہی ایک زبان تھی جو صرف انور کے بہکے ہوئے ذہن کی پیداوار تھی۔ سلینا کو اس روز پہلی بار پتا چلا کہ انور اپنے ماضی کے ساتھ ساتھ سب کچھ بھول بیٹھا ہے حتیٰ کہ لکھنا پڑھنا بھی اس کی سمجھ سے باہر تھا اور یہ احساس اتنا اندوہ ناک تھا کہ سلینا کا دل ہل گیا۔ فلسفہ کا ڈاکٹر انور معمولی الفاظ بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ اور اس روز پہلی بار سلینا نے انور کو ان نظروں سے دیکھا جن میں ماما کے علاوہ بھی ایک جذبہ تھا۔ ایک ایسی ترحم انگیز محبت کا جذبہ جو دیوداسیاں شاید ان دیوتاؤں کے لیے محسوس کرتی ہیں جو ہر چیز پر قادر ہونے کے باوجود اپنے جسم کی

گرد تک نہیں جھاڑ سکتے۔
اس روز سلینا بڑی دیر تک کنواری مریم کے سامنے دوزانو رہی۔
''کنواری ماں۔ وہ کسی بھیڑ کے بچے کی طرح معصوم ہے وہ جس نے یروشلم میں کانٹوں کا تاج پہنا تھا۔ وہ جس نے خود اپنی صلیب کو کاندھا دیا تھا۔ کنواری ماں میں تمہیں اس کے مقدس دکھ کا واسطہ دیتی ہوں۔''
اس نے اتنی لگن کے ساتھ دعا مانگی کہ اس پر رعشہ طاری ہوگیا اور اس کے ہونٹوں پر آنسوؤں کے قطرے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اور ابھی وہ اسی جذبے کے عالم میں تھی کہ کسی نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ جلدی سے چونک کر مڑی تو اس نے اپنے پیچھے انور کو کھڑے پایا۔
سلینا۔ تم رو رہی ہو؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔ تم کیوں رو رہی ہو سلینا؟
میں تمہارے لیے رو رہی تھی انور۔ سلینا کے آنسو ایک دم سے برس پڑے۔
میرے لیے۔ انور نے حیرت سے کہا۔ کیوں مجھے کیا ہوا؟ میں تو ٹھیک ہوں۔
سلینا نے کرب سے ہونٹ کاٹ لیے۔
میں اس لیے رو رہی ہوں انور کہ تم مجھے اچھے لگنے لگے ہو۔ سلینا جانے کیسے کہہ گئی۔
واقعی؟ مگر اس میں رونے کی کیا بات ہے؟
میں اس لیے رو رہی تھی کہ تم صابن کے غبارے اڑاتے ہو اور لوگ تمہیں پاگل سمجھتے ہیں انور۔ اور میں نہیں چاہتی کہ لوگ تمہیں پاگل سمجھیں۔ اس نے اپنی برستی آنکھوں کو مسلا۔
تو مجھ سے یونہی کہہ دیا ہوتا سلینا۔ اب میں نہیں اڑاؤں گا غبارے۔ انور نے معصومیت سے کہا۔
اب سلینا پھر سے ٹھوس سیاست پر اتر آئی۔
اور تم نہانے سے انکار کرتے ہو۔ کپڑے خراب کر لیتے ہو۔ انجکشن سے بھی ڈرتے ہو۔ ناشتا بھی نہیں کرتے۔ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھاتے۔
اچھا اب یہ بھی سب کچھ نہیں کروں گا۔ انور فرماں بردار بچے کی طرح وعدے پر وعدہ کر رہا تھا۔

اور تم سب کچھ بھول گئے ہو۔ تم اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے۔ سلینا نے کہا۔
یہ غلط ہے۔ میں اچھی طرح ہر بات لکھ سکتا ہوں۔ میں نے تمہیں کتنا کچھ لکھ کر دکھایا تھا بھول گئیں کیا؟
نہیں انور تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم کوئی بہت بڑی چوٹ چھپائے ہوئے ہو۔ سلینا نے فکر مندی سے کہا۔
چوٹ۔ کیسی چوٹ سلینا۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔ مجھے بتاؤ نا!
یہی تو میں تمہیں نہیں سمجھا سکتی انور۔ تم کوشش کرو۔ یاد کرو جب تم لندن میں تھے۔
میں کبھی لندن گیا ہی نہیں۔ میں کتنی بار تم سے کہوں۔
نہیں انور تم لندن میں تھے۔ آخر میں جھوٹ کیوں بولوں گی۔
اچھا تم کہتی ہو تو پھر ایسا ہی ہوگا۔ مگر پھر؟
پھر تم یاد کرو کہ جب تم لندن میں تھے تو تم پر کیا بیتی؟
مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ انور نے اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔ جیسے ذہن پر بے تحاشا زور صرف کر چکا ہو۔
میں اسی لئے تو رو رہی تھی انور کہ تمہیں کچھ نہیں یاد۔ سلینا نے غم زدہ ہو کر کہا
تو بتاؤ میں کیا کروں؟ کیا کروں سلینا کہ تم رونا بند کر دو۔ انور جھنجلا گیا۔
آؤ انور تم بھی میرے ساتھ روؤ۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ روئیں اور تو ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ سلینا بس یہی جواب دے سکتی تھی۔
پھر انور بھی سلینا کے برابر کنواری مریم کے روبرو دوزانو ہو گیا اور نہ سمجھتے ہوئے کہ وہ کیا کر رہا ہے اس نے آنسو بہانے شروع کر دیے۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بات آ گئی تھی کہ وہ خود رو کر ہی سلینا کے آنسو روک سکتا ہے۔ لیکن اس کے اس خود سپردگی کے جذبے نے سلینا کو اور بھی جذباتی بنا دیا۔ یہ احساس کہ انور کو اپنی ذہنی بے چارگی کے باوجود بھی اس کی خوشی کا خیال تھا سلینا کو ایک بار پھر رُلا دینے کے لیے کافی تھا۔
چنانچہ وہ دونوں دیر تک آنسو بہاتے رہے اور ان کے سروں پر کنواری مریم کی پُرشفقت مسکراہٹ نور کے ہالوں سے چھن چھن کر برستی رہی۔

اس روز کے بعد سے انور کی حالت میں ایک نمایاں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ سلینا اور انور کے گھر والوں کے لیے یہ بات بڑی امید افزا تھی کہ انور نے صابن کے غبارے اڑانے بند کر دیے تھے اور اس کا حلیہ بھی درست رہنے لگا تھا۔ اسے صفائی اور گندگی کا فرق بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے اب اپنے علاج کے سلسلے میں واویلا مچانا ترک کر دیا تھا۔ اب ڈاکٹر اسے ڈراکیولا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن یہ بات صرف سلینا جانتی تھی کہ انور کی یہ ذہنی تبدیلی کلّی طور پر صحت مندی کی علامت نہیں تھی)۔ بلکہ اس خوش گوار تبدیلی کی تہہ میں شاید وہ جذبہ تھا جو انور کے دل میں سلینا کے لیے پیدا ہوگیا تھا۔ خود سپردگی کا ایک ایسا جذبہ جب دل دماغ پر حاوی ہوجاتا ہے اور جب انسان کی حرکات اس کی عقل سے زیادہ دل کے تابع ہوجاتی ہیں۔ ایک صحت مند انسان کے لیے یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ مگر جب ذہن ناکارہ ہو چکا ہو تو اس کا دل کے تابع ہوجانا ایک خوش گوار بات ہے۔

گھر میں انور کی یہ خوش گوار تبدیلی بڑی اطمینان بخش مسرت کے ساتھ محسوس کی گئی اور اس کامیابی پر جو سلینا کی ذاتی کوششوں سے زیادہ اس تاثر کی رہینِ منّت تھی جو انور نے اس کی شخصیت سے قبول کیا تھا۔ سلینا کو جی بھر کر مبارک باد دی گئی۔ حتیٰ کہ اطہر نے جذبات کی کپکپاتی ہوئی آواز میں سلینا کی خدمات کا یوں اعتراف کیا جیسے وہ اس کی ملازم نہیں محسن ہو۔ چنانچہ سلینا ذاتی طور پر خود بھی اس صورتِ حال سے اس قدر متاثر ہوئی تھی کہ اس بار اس نے ڈیوڈ کو جب خط لکھا تو اس میں اس نے تفصیل کے ساتھ اپنی ملازمت۔ اپنے مریض کی ذہنی حالت اور اس حالت میں ایک معجزاتی تغیر کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھا۔ حالاں کہ وہ جانتی تھی کہ ڈیوڈ کو انور سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ اسے تو صرف ایک بات سے دلچسپی تھی اور وہ یہ کہ وہ کسی طرح اپنا اسٹور ٹھکانے لگا کر سلینا سے آملے اور وہ مل کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں۔ اور سلینا خود بھی تو اس سے ملنے کے لیے کتنی بے چین رہا کرتی تھی۔ اس نے بارہا ڈیوڈ کو اس بات پر اکسایا تھا کہ وہ اپنا اسٹور اونے پونے ٹھکانے لگا کر اس سے آملے۔ کیوں کہ تنہائی کی یہ زندگی اب اسے بری طرح کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ اور اگر ڈیوڈ نے اس کی بات مان لی ہوتی تو آج شاید وہ انور کی تیمار داری کرنے کے

بجائے اپنے پہلے بچے کی نرسنگ کر رہی ہوتی۔ مگر یہاں آنے کے بعد اس نے ڈیوڈ کے لیے پہلے جیسی بے چینی محسوس نہیں کی۔ اور خصوصاً اب جب کہ انور کی حالت ایک خوش گوار موڑ پر آ گئی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر یہ چاہنے لگی تھی کہ کسی طرح ڈیوڈ کم از کم اس وقت تک نہ آ سکے جب تک انور پوری طرح صحت یاب نہ ہو جائے۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے شاہ کار کو نامکمل نہ چھوڑے۔

انور کے لیے اب اس کے دل میں کچھ ایسے جذبات پیدا ہوتے جا رہے تھے جیسے کسی فن کار کے دل میں اس تصویر کے لیے پیدا ہوتے ہیں جس کے خدوخال اجاگر ہونا شروع ہوئے ہوں۔

انور یقیناً اس کے دیگر مریضوں سے مختلف تھا اور اب اس کے لیے ایک چیلنج بن گیا تھا۔ وہ جس قدر اور جس تیزی کے ساتھ سلینا کے قریب آ رہا تھا۔ سلینا کی امیدیں بھی اسی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھیں۔ اسے یہ اعتماد حاصل ہو رہا تھا کہ اس کی کوششیں ضرور رنگ لائیں گی۔ وہ پاگل ہرگز نہیں تھا۔ وہ کسی کو نقصان بھی نہیں پہنچاتا تھا۔ وہ محبت سے بھرا دل اور سوچ بچار والا ذہن بھی رکھتا تھا۔ وہ اپنے کسی فعل سے کسی کو دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ذہن نے اس سے وفا نہیں کی تھی اور وہ گم رہی کا شکار ہو چکا تھا۔ کوئی ایسی چوٹ تھی جو اس کے دل پر لگی تھی اور دماغ تک پہنچ گئی تھی۔ شاید وہ اپنی اصلی زندگی میں بہت جذباتی رہا ہو۔ چھوٹی سے چھوٹی بات کو زیادہ محسوس کرتا ہو۔ بہت حساس رہا ہو۔ اونچ نیچ برداشت ہی نہیں کر پایا ہو۔ مگر جو کچھ بھی ہوا ہو۔ بہت برا ہوا۔ ہنستے بستے گھر کو ویران کر گیا۔

۴

.....نہ معلوم یہ کون سا جذبہ تھا...
اس نے بارہا صبح صبح سلینا کے لیے پھولوں کی کیاریاں کھسوٹی تھیں۔
اس نے دن بھر باغ میں گھوم کر رنگین پرندوں کے پر جمع کیے تھے۔
معصوم تتلیوں کو اسیر کر کے ان کے مخملی پنکھ توڑے تھے اور پھر ان رنگوں کو سلینا کے کمرے میں سجایا تھا۔
اور جب سلینا اس کے ان تحفوں پر اس کا شکریہ ادا کرتی تو وہ بچوں کی طرح کِھل اٹھتا...

رفتہ رفتہ انور نارمل حالت پر آتا جارہا تھا مگر صرف اسی حد تک کہ اس نے عام انسانوں کی طرح زندگی گزارنا شروع کردی تھی۔ ویسے جہاں تک ذہنی صحت مندی کا تعلق ہے۔ اس کی حالت اب بھی ایک معصوم بچے سے زیادہ بہتر نہیں تھی۔ اسکا کھانا پینا، چلنا پھرنا سب نارمل انسانوں کی طرح تھا۔ مگراس کی باتیں اب بھی بے سروپا تھیں۔ وہ اب بھی لکھنے پڑھنے سے قاصر تھا اور اس کی یادداشت پر اب بھی تاریکی کے گہرے سائے چھائے ہوئے تھے۔ اس کی یہ نیم صحت مندی طبعی صحت یابی سے زیادہ مسمریزم جیسی کوئی کیفیت معلوم ہوتی تھی جو غالباً سلینا کی ذات نے اس کے ذہن پر کیا تھا۔

وہ اپنا تمام تر وقت سلینا ہی کے ساتھ گزارتا اور چوں کہ ذہنی طور پر سلینا اس پر پوری طرح حاوی ہوچکی تھی اس لیے وہ سلینا سے بالکل کسی سدھائے ہوئے سمجھدار جانور کی طرح پیش آتا۔ اسکے بھٹکے ہوئے ذہن کی ایک نئی اپج یہ تھی کہ وہ تمام دن اس بات کی کوشش میں صرف کرتا کہ سلینا کے لیے خوشی کا کوئی بہانہ پیدا کرسکے۔ نہ معلوم یہ کون ساجذبہ تھا۔ بہر حال اس نے بارہا صبح صبح سلینا کے لیے پھولوں کی کیاریاں کھسوٹی تھیں اور جب سلینا نے اس کے ان تحفوں پر اس کا شکریہ ادا کیا تھا تو وہ بچوں کی طرح

کِھل اٹھا تھا۔ اس نے دن بھر باغ میں گھوم کر رنگین پرندوں کے پر جمع کیے تھے۔ معصوم تتلیوں کو اسیر کر کے ان کے مخملی پنکھ توڑے تھے۔ اور پھر ان رنگوں کو سلینا کے کمرے میں سجایا تھا۔ اور پھر ایک بار جب باہر تیز بارش ہو رہی تھی اور وہ سلینا کے ساتھ گھر میں مقید بیٹھا تھا تو اسے شاید سلینا کا دل بہلانے کا خیال آ گیا تھا۔ اور وہ پتا نہیں کہاں سے ڈھونڈ کر اپنا پرانا وائلن اٹھا لایا تھا اور پھر دیر تک وہ اپنے طور پر نغمے بکھیرتا رہا تھا۔ مگر یہ نغمے بھی شاید اسی زبان میں ترتیب دیے گئے تھے جس زبان میں انور نے لوگوں کے نام لکھے تھے۔ کیوں کہ اس کے وائلن کے گیتوں میں بے ہنگم تھرتھراہٹ اور بھونڈی چیخوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ شاید ذہن کی بے ترتیبی موسیقی کے ذریعے واضح ہو جاتی ہے۔

اور پھر انور کو زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنے کی دُھن سوار ہو گئی اور ظاہر ہے اس تمام وقت میں سلینا سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ ہوتی۔

وہ دن کا بیشتر حصّہ آس پاس کے کھیتوں اور بے ضرر قسم کے جنگلوں میں آوارہ گردی کرتے اور انور چڑیوں کے گھونسلوں کی تلاشیاں لیتا۔ تتلیوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتا۔ جنگلی پھولوں کو کھسوٹتا اور اس کے اس شغل میں سلینا برابر کی حصّہ دار رہتی۔ مگر یہ دوڑ دھوپ اسے اتنا شل کر دیتی کہ وہ کسی نہ کسی بہانے تھک کر گھاس پر لیٹ جاتی۔ اور پھر انور بھی اس کے پاس آ بیٹھتا اور ان کا انداز کچھ ایسا ہوتا جیسے وہ دو معصوم بچّے ہوں یا ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبے ہوئے ایسے ساتھی جنہیں دنیا کا کوئی غم نہ ہو۔

جہاں تک انور کا تعلق تھا کم از کم اسے کوئی غم نہ تھا کیوں کہ قدرت نے اس سے وہ صلاحیت ہی چھین لی تھی جو خوشی اور غم میں امتیاز کر سکے۔ البتہ سلینا کو ہر لمحے اس بات کا احساس تھا کہ انور کی یہ کیفیت محض ایک سنبھالا ہے اور اس کی مکمل صحت یابی اس وقت تک ناممکن تھی جب تک اس کے غم کو کرید کر اس کے سامنے نہ رکھ دیا جائے۔ جب تک اس کی چوٹ پھر یاد نہ دلائی جائے اور یہ صرف اسی وقت ممکن تھا جب وہ ماضی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے۔ چناں چہ گھوم پھر کے کوئی ایسی بات چھیڑ دیتی جو انور کو اس کے ماضی کی یاد دلا سکے۔ اور اس روز بھی جب وہ تھک کر جنگلی گھاس کے فرش پر لیٹ گئی تھی اور انور اس کے برابر آ بیٹھا تھا تب اس نے بڑے خواب ناک انداز میں کہا

تھا۔

انور کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا جیسے تم کوئی جانا پہچانا کھیل کھیل رہے ہو؟

ہاں۔ بھائی جان کہتے ہیں میں بچپن میں بھی تتلیوں کو پکڑتا رہا ہوں۔

اور سلینا ہنس پڑی۔ انور کی اس معصومیت پر وہ مرمٹتی اگر ڈیوڈ سے اس نے زندگی بھر کا سودا نہ کرلیا ہوتا۔

اچھا یہ بتاؤ۔ اس نے بات بدلی۔ کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت تھی۔ سلینا نے بہت کچھ سوچ کر اس سے سوال کیا۔

کون۔ کون خوب صورت تھی؟ انور کے انداز میں بے پناہ حیرت تھی۔

وہی جس کے بال سنہری تھے جس کی آنکھیں ٹیمز کے پانی کی طرح نیلی تھیں۔ سلینا نے اپنے جانتے میں اس کا نقشہ کھینچا۔

تم کس کی بات کررہی ہو سلینا؟ انور نے گھبرا کر پوچھا۔

اس کی انور جو تم سے بہت قریب رہ چکی ہے۔ جس کی نیلی آنکھوں نے تمہیں ایک مرتبہ کسی پارک یا کسی ریستوران میں دوستی کی دعوت دی تھی اور جس کے ساتھ تم اسکاٹ لینڈ کے سرسبز میدانوں میں پکنک منانے گئے تھے۔ اور پھر جس نے لندن میں تمہیں ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔

پھر لندن۔ وہ چڑ گیا۔ آخر تم مجھے لندن کا نام لے کر چڑھاتی کیوں ہو؟

تو کیا تم کبھی لندن نہیں گئے تھے۔ سلینا نے پھر پوچھنا ضروری سمجھا۔

نہیں کتنی بار تو کہہ چکا ہوں۔ انور نے خفگی سے جواب دیا۔

اور سلینا نے پھر روٹھ جانے کی اداکاری کی۔

تم مجھ سے بات چھپانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ اب میں کچھ نہیں کہوں گی۔

نہیں سلینا۔ میں نے کوئی بات نہیں چھپائی۔ مجھے کچھ یاد ہی نہیں تو میں کیا کروں؟

کوشش تو کرسکتے ہو۔ اپنے دماغ پر زور ڈالو شاید تمہیں کچھ یاد آجائے۔

سلینا ہر حال میں جاننا چاہتی تھی۔

مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ انور نے جھلا کر کہا۔

اب مزید کوشش فضول تھی، اور سلینا نے یہ بھی محسوس کرلیا تھا کہ اس کا انداز بالکل پولیس والوں جیسا ہوگیا تھا۔ ظاہر ہے ماضی کو بھول جانا کوئی جرم تو نہیں تھا جسے انور دانستہ طور پر چھپانا چاہتا ہو۔ اس کی یادداشت پر ضرب لگانے کے لیے کوئی اور ہی راستہ ڈھونڈنا ہوگا۔ وہ راستہ کیا ہوگا؟ ابھی سلینا یہ نہیں جانتی تھی۔

پھر وہ دونوں واپسی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور سلینا تمام راستے اپنے خیالات میں اس طرح گم رہی کہ اسے انور کی موجودگی کا بھی احساس نہ رہا۔

سلینا کیا تم مجھ سے خفا ہو؟ انور نے محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔

اور وہ اتنی دیر میں پہلی بار چونکی۔ نہیں۔ نہیں تو۔ سلینا گڑ بڑا گئی۔

نہیں تم خفا ہو۔ تم اب بھی یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تم سے کچھ چھپا رہا ہوں۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ یقین کرو سلینا تم۔ انور نے اسے یقین دلانا چاہا۔

نہیں انور مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے؟ سلینا نے معاملے کی سنگینی کو ختم کرنا چاہا۔

پھر تم خاموش کیوں ہوگئیں۔ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں؟ خفا تو ہونا، جب ہی تو...

نہیں میں تم سے خفا ہرگز نہیں ہوں۔ دراصل میں یہ سوچ رہی ہوں کہ تمہیں کس طرح ساری باتیں یاددلاؤں جو تم بھول چکے ہو۔ سلینا نے کہا۔

تو تم مجھ سے خفا نہیں ہو۔ انور نے اطمینان کا سانس لیا۔

نہیں۔ میں خفا نہیں ہوں ۔ میں بار بار تو کہہ رہی ہوں۔ سلینا نے آہستگی سے اسے یقین دلایا۔

اچھا تو مسکراؤ۔ انور نے کہا۔

سلینا مسکرادی۔ کئی بار مسکرائی

اب باتیں کروں۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

بتاؤ میں کیا باتیں کروں؟ تم کس بات سے مطمئن ہوگے۔

مجھے لندن کے بارے میں بتاؤ۔ کیسا ہے لندن ۔ لوگ مجھے لندن کا نام لے کر بار بار کیوں چھیڑتے ہیں؟

لندن کے بارے میں۔ سلینا کبھی خواب میں بھی لندن نہیں گئی تھی ایک لمحہ کے لیے وہ گھبرا سی گئی۔ مگر پھر فوراً ہی سنبھل گئی۔ وہ سمجھ دار تھی اور موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

اچھا میں تمہیں لندن کے بارے میں بتاتی ہوں۔ سلینا نے اطمینان سے کہا۔

انور ہمہ تن گوش ہوگیا۔ اور سلینا نے کہنا شروع کیا۔

دریائے ٹیمز اسکاٹ لینڈ کی سرمئی گھاٹیوں سے بہتا ہوا جب ساحل سمندر کی طرف بڑھتا ہے تو کوئی تیس میل پیچھے سے اس کے ساتھ ساتھ آبادی شروع ہونے لگتی ہے یہ آبادی جو اس کے دونوں کناروں پر بسی ہوئی ہے لندن کہلاتی ہے۔ لندن کو نپولین نے ''دکانداروں کا شہر'' کہا تھا۔ مگر لندن اس کے ساتھ ساتھ فواروں، پارکوں عجائب گھروں کا شہر بھی کہلاتا ہے۔ اس کے دل کش پارک، خوب صورت فوارے، ملکہ کا بت۔ یہ سب چاہنے والوں کے لیے ملاقات کی جگہیں سمجھی جاتی ہیں۔ اور ان ہی ملاقات کی جگہوں میں سے کسی جگہ اس کی ملاقات میری سے ہوئی تھی۔ اور میری کے سنہری بال، نیلی آنکھیں اور گلابی رخسار اس کی نظروں میں بس کر رہ گئے تھے اور پھر چند اتفاقات نے انہیں ایک دوسرے سے اتنا قریب کردیا کہ وہ میری کو اپنی منزل سمجھنے لگا۔ وہ تمام وقت میری کو اپنے ملک کے پیمانے پر تولتا رہا۔ وہ میری سے شادی کرے گا۔ اس کے خوب صورت سے بچے ہوں گے۔ وہ انہیں اپنے ملک لائے گا۔ اور نہ جانے کیا کیا نہ سوچا اس نے۔ مگر میری ان تعلقات کو اپنی ملک کے پیمانے پر تولتی رہی۔ اس کے نزدیک اس دوستی کی اہمیت صرف وقت گزاری کی حد تک تھی۔ چنانچہ جب اس کا منگیتر کسی بیرونی ملک کی فوجی خدمات سے واپس آیا تب میری نے اس سے آنکھیں پھیرلیں۔ اور وہ بے چارہ محض آوازیں دیتا رہ گیا۔

سلینا نے انور کے تاثرات معلوم کرنے کے لیے بات ادھوری چھوڑ دی۔ مگر انور کا چہرہ ہر قسم کے احساسات سے اور جذبات سے عاری تھا۔ وہ صرف اسے کہانی ہی سمجھ رہا تھا۔

سلینا جب خاموش ہوگئی تب اس کی محویت ٹوٹی وہ بولا۔

پھر کیا ہوا؟

مجھے نہیں معلوم، میں نہیں جانتی آگے کیا ہوا۔ تم ہی سوچو آخر اس بے چارے کا انجام کیا ہوسکتا ہے؟ سلینا نے اس کے دلی تاثرات جاننے چاہے کہ شاید اس سے وہ کوئی سرا تلاش

کر پائے۔

''اس نے جان دے دی ہوگی'' انور نے ایک دم کہا۔

''انور'' سلینا ساری جان سے لرز گئی۔

اور اس روز پہلی بار سلینا کو پوری طرح اس بات کا یقین ہوگیا کہ انور کے بکھرے ہوئے ذہن کی تہہ میں کوئی نہ کوئی مِیَری ضرور ہے۔

انور اس قدر حساس ہے کہ اس نے کہانی کو کوئی بھی رنگ دینے کے بجائے اس کا اختتام اس قدر سنگین کر دیا۔ گویا وہ غیر ارادی اور غیر محسوس طور پر بھی ایک ایسی انتہائی سوچ رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک ایسی نازک صورتِ حال میں جب کسی کے ہاتھ میں کوئی حل موجود نہ ہو تو بس وہ صرف ایک ہی فعل سے گزر سکتا ہے کہ وہ اپنی جان دے دے اور اس شدید غم سے چھٹکارا حاصل کر لے جو اسے وفا کے عوض خواہ مخواہ ملا ہو۔

۵

.....وہ اس قدر خاموشی سے راستہ طے کرتے رہے جیسے کسی کو دفنا کر لوٹ رہے ہوں، گھر پہنچتے ہی سلینا کسی ممتا کی ماری ہوئی ماں کی طرح بلبلاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی، اس نے دروازے بند کر دیے اور خود کو گھٹنوں کے بل کنواری مریم کی تصویر کے سامنے گرا دیا...

پکنک کا پروگرام اطہر کے خاندان کی روایت میں شامل تھا۔ عموماً سال میں دو بار سب مل کر گھر سے دور قدرتی مناظر کی آغوش میں پکنک مناتے۔ اس طرح گھر والوں کو ماحول کی تبدیلی کا موقع مل جاتا اور اطہر کو جی بھر کے شکار کھیلنے کا۔ مگر اس بار جو پکنک ترتیب دی گئی تھی اس میں نہ گھر والوں کی تفریح کو دخل تھا اور نہ اطہر کے شکاری جذبے کا۔ بلکہ سب انور کے لیے ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اگر انور کو زیادہ سے زیادہ قدرتی مناظر سے قریب رکھا جائے تو اس کے ذہن پر اچھا اثر پڑنے کا امکان ہے۔ چناں چہ انہوں نے یہ پکنک پارٹی ترتیب دے لی تھی۔ پکنک کے لیے اطہر نے اپنے محکمے سے ایک جیپ منگالی تھی جس میں وہ سب سامان سمیت سوار ہو کر علی الصبح روانہ ہو گئے تھے، اور دن چڑھے تک وہ اس جگہ تک جا پہنچے تھے جہاں انہیں قیام کرنا تھا۔ یہ مقام اطہر ہی کا منتخب کیا ہوا تھا اور کم از کم سلینا کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ انہوں نے ایک اونچے ٹیلے پر کیمپ لگایا تھا جس کے ایک طرف کوئی گم نام مگر تیز ندی بہتی تھی اور دوسری طرف جنگلی بیروں کے درختوں کی قطاریں، گیہوں کے وسیع کھیتوں سے مل گئی تھیں۔ جن کے خاتمے پر ایک مختصر سی آبادی تھی جو ان کسانوں پر مشتمل تھی جو سب کے سب قریبی کھیتوں

سے متعلق تھے۔ ارد گرد کا ماحول واقعی بڑا دل خوش کُن تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد سلینا نے ٹیلے کے سب سے اونچے پتھر پر کھڑے ہو کر سورج کو طلوع ہوتے دیکھا تھا اور گہری گہری سانسیں لی تھیں جیسے وہ ارد گرد کی تمام جنگلی خوشبوئیں سورج کی روشنی میں گھول کر اپنے پھیپھڑوں میں بسالینا چاہتی ہو۔ اسے یہ مقام بہت پسند آیا تھا۔

صبح کے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ تین گروپ میں بٹ گئے تھے اطہر اپنے مددگار شکاری کے ساتھ بندوق لے کر جنگل کی طرف نکل گیا تھا۔ شاکرہ اور نجمہ نے کیمرہ اور دوربین سنبھال کر آس پاس کی دیکھ بھال شروع کر دی تھی اور ہر خوب صورت جگہ کی تصویر اپنے کیمرے میں محفوظ کر لینا چاہتی تھیں اور سلینا انور کو ساتھ لے کر ندی کی طرف چلی آئی تھی۔

اس بے نام ندی کا پانی ڈھلوان راستوں پر بڑے پُرشور انداز سے بہہ رہا تھا اور جگہ جگہ جہاں پانی کے ریلے کو چٹان یا قدرتی رکاوٹوں سے ٹکرانا پڑ رہا تھا وہاں پانی اس طرح اچھل رہا تھا جیسے شفاف کانچ کے ٹکڑے فضا میں ٹوٹ ٹوٹ کر منتشر ہو رہے ہوں۔ اس اچھلتے ہوئے پانی کے ساتھ ننھی منی مچھلیاں بھی تڑپتی نظر آتیں اور چشمِ زدن میں پانی میں غائب ہو جاتیں۔

اس منظر نے انور کے موڈ پر بھی بڑا خوش گوار اثر ڈالا تھا کیونکہ سلینا نے اس کے چہرے پر بڑے معقول سے جذبات کے پرتو محسوس کیے تھے۔ اس نے اس منظر کو اس طرح محسوس کیا تھا جیسے ایک بالکل نارمل انسان محسوس کر سکتا ہے اور اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے یہ پہاڑی، یہ ٹیلے، یہ وسیع میدان سب اس کے اپنے ہوں۔

پھر وہ کنارے کے ایک پتھر پر پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے اور دیر تک پانی کے طوفانی بہاؤ کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ پھر پتا نہیں کیا سوچ کر انور نے اپنے پتلون کے پائینچے اوپر چڑھائے اور پانی میں اترنے لگا اور تب پہلی بار سلینا کو یہ احساس ہوا کہ اسے انور کو پانی سے اس قدر قریب نہیں کرنا چاہیے۔

یہ کیا کر رہے ہو انور؟ سلینا کے اس سوال میں تھوڑا سا ڈر بھی پوشیدہ تھا۔

نہ جانے کیوں پانی میں اترنے کو جی چاہتا ہے۔ انور نے عجب سی خواب ناک آواز میں کہا

نہیں۔نہیں اس کی گہرائی کا بھی اندازہ نہ ہوگا۔سلینا نے منع کرنا چاہا۔

میں تیرنا جانتا ہوں۔انور نے بہادری سے کہا۔

تیرنے والا ہی ڈوبتا بھی ہے۔تم پانی میں نہیں اترو گے۔سلینا کا لہجہ حتمی تھا۔

تم منع کرتی ہوتو یہی سہی۔مگر میں اس دریا کو تیر کر بھی پار کرسکتا ہوں۔انور نے کہا اور تب سلینا کے ذہن نے سنبھالا لیا۔

تم تیرنا جانتے ہوانور؟ اس کا یہ سوال معنی خیز تھا

ہاں ہاں کیوں نہیں؟ انور نے اثبات میں جواب دیا۔

تمہیں تیرنا کس نے سکھایا؟ سلینا انور کی یادداشت کی تہہ پر سے پردہ اٹھانا چاہتی تھی۔

اطہر بھائی نے اور کس نے۔انور نے بتایا۔

کب؟ سلینا کا یہ سوال بھی اہم تھا۔

میں بہت چھوٹا سا تھا ان دنوں، بس اتنا بڑا۔اس نے دس بارہ برس کے لڑکے کے قد کا اندازہ بتایا۔

انور کی یادداشت کچھ بہتر ہورہی تھی۔سلینا خوش بھی تھی اور بہت پُر امید بھی کہ وہ آہستہ آہستہ انور کے ذہن کو راہ پر لے آئے گی۔مگر اسی وقت دور کے ٹیلوں سے ایک فائر کی آواز آئی جو خاموش وادی میں دیر تک بازگشت بن کر گونجتی رہی۔

بھائی جان ہیں۔اس نے سلینا کو بتایا۔

آؤ دیکھیں انہوں نے کیا مارا ہے؟ انور نے چلنے کو کہا۔

چلو۔سلینا تیار ہوگئی۔

وہ جس راستے پر دوڑے جارہے تھے وہ ناہموار پتھریلا اور ڈھلوان تھا۔انور نے یکا یک ٹھوکر کھائی اور پھر ناہموار پتھروں پر لڑھکتا ہوا نشیب میں گرتا چلا گیا۔اور اس سے پہلے کہ سلینا اسے سنبھالنے کو بڑھ سکے وہ ایک چٹان سے ٹکرا کر لہولہان ہو چکا تھا۔اور اس بار اس خاموش وادی میں جو آواز گونجی وہ سلینا کی چیخ تھی۔

اطہر اور سلینا مخالف سمتوں سے دوڑتے ہوئے بیک وقت انور کے پاس پہنچے سلینا نے فوراً انور کی نبض تھام لی جو چل رہی تھی اور اطہر نے اس کے سر کو اپنی

آغوش میں رکھ لیا جو خون سے تر بہ تر ہو چکا تھا۔ چٹان نے اس کے سر کو بُری طرح زخمی کیا تھا اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اطہر نے سلینا سے اس حادثے کی تفصیلات پوچھ کر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اس نے انور کو اپنے کاندھے پر لادلیا اور کیمپ کی طرف دوڑ پڑا۔

میں شہر جارہا ہوں تم لوگ واپس گھر آجانا۔ اس نے جاتے جاتے کہا۔

میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ سلینا نے پھنسی پھنسی آواز سے کہا بھی مگر اطہر تو کب کا دور نکل چکا تھا۔ وہ انور کو اپنی اولاد ہی کی طرح چاہتا تھا۔ سلینا صرف بلبلا کر رہ گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور قدم من من بھر کے ہو چکے تھے۔ وہ پاؤں اٹھاتی تو اٹھا بھی نہیں پاتی۔

اس عرصے میں اطہر کا مددگار شکاری بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔

سسٹر یہ چیخ کیسی تھی۔ کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ اس کی آواز میں خوف تھا۔

ہاں۔ تم میرے ساتھ آؤ۔ اس بار سلینا جلدی میں تھی اور پاؤں میں جانے کہاں سے سرعت آ گئی۔

وہ دونوں پتھروں سے ٹکراتے، گرتے پڑتے کیمپ تک پہنچے لیکن ان کے وہاں جانے سے پہلے ہی اطہر کی جیپ شہر کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

سلینا ہانپ رہی تھی لڑکھڑاتی ہوئی خیمے میں داخل ہوئی اور شاکرہ کی گود میں سر دے کر با آواز بلند رونے لگی۔

ارے سسٹر۔ شاکرہ پریشان ہو گئی۔

سلینا پلیز کچھ بولو تو۔ آخر ہوا کیا۔ نجمہ نے گھبرا کو پوچھا۔

وہ دونوں دراصل اس حادثے سے قطعی بے خبر تھیں جلدی میں اطہر نے انہیں مطلع کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

وہ انور... اپنے رونے پر قابو پا کر سلینا بس یہی کہہ سکی۔

کیا ہوا انور کو۔ وہ دونوں ایک ساتھ چیخ پڑیں۔

وہ اسے شہر لے گئے ہیں۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی اور پھر آنسوؤں نے اس کی زبان بند

کردی۔ کافی دیر کے بعد سلینا بہ مشکل انہیں حادثے کی صحیح اطلاع دے سکی۔
تمہیں انور بھائی کو روکنا چاہیے تھا۔ شاکرہ نے صرف اتنا کہا۔
ہاں۔ یہ سب کچھ میری غفلت سے ہوا۔ میرے خدا۔ اگر انور کو کچھ ہو گیا تو میں اطہر کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ وہ دوبارہ رو پڑی۔ اس کے دل میں عجیب سی ندامت پیدا ہونے لگی تھی۔ اسے یہ احساس ہو چلا تھا کہ انور کو حادثے سے بچانے کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی تھی۔ اور اگر وہ اس بات کو یاد رکھتی کہ انور ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہے اور اسے بھاگنے سے منع کرتی تو شاید یہ حادثہ وجود میں نہ آتا اسے اپنی غفلت بڑی مجرمانہ محسوس ہونے لگی اور اس نے محسوس کیا کہ اب وہ کبھی اطہر اور اطہر کے گھر والوں سے آنکھ نہیں ملا سکے گی۔
کسی نہ کسی طرح ان کی واپسی کا بندوبست ہو گیا لیکن وہ اس قدر خاموشی سے راستہ طے کرتے رہے جیسے کسی کو دفنا کر لوٹ رہے ہوں۔
گھر پہنچتے ہی سلینا کسی ممتا کی ماری ہوئی ماں کی طرح بلبلاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے دروازے بند کر لیے اور خود کو گھٹنوں کے بل کنواری مریم کی تصویر کے سامنے گرا دیا۔

''کنواری ماں۔ مجھے معاف کر دو۔ میری غفلت کی سزا اس معصوم کو نہیں ملنی چاہیے۔ میں تمہیں یروشلم میں بہے ہوئے خون کا واسطہ دیتی ہوں کنواری ماں''
وہ سسکتی رہی، فریاد کرتی رہی، دعائیں مانگتی رہی۔ اس کے دل میں انور کی کس قدر محبت تھی آج اسے اس بات کا اندازہ ہوا۔ انور صرف اس کا مریض ہی نہیں تھا اب سلینا اسے اپنا، بالکل اپنا سمجھنے لگی تھی۔ ایسے رشتوں کے کوئی نام نہیں ہوتے مگر یہ رشتے بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ بہت دکھ پہنچاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی سلامتی کے لیے دل سے دعا گو ہوتے ہیں اسی لیے تو سلینا اس وقت تک دوزانو رہی جب تک انور گھر واپس نہیں آ گیا۔
لیکن وہ اپنے پیروں پر چل کر نہیں واپس آیا تھا بلکہ اب انور سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا ایک انسانی جسم تھا جو اسٹریچر پر ڈال کر لایا گیا تھا۔ اور اسے کس طرح اندر لایا گیا۔ کس طرح بستر پر لٹایا گیا تھا یہ سب کچھ سلینا کے لیے ایسی ہی تکلیف دہ باتیں ثابت ہوئیں جیسے انور کو کفن پہنا کر قبر میں اتارنے کا منظر ہو سکتا ہے۔ اور پھر اس کی تہہ میں مسلسل یہ احساس

کہ اس تمام تر تکلیف کی ذمہ دار وہ خود ہے۔ وہ اطہر سے آنکھ ملاتی تو کیسے؟ وہ تو اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی بھی ہمت نہیں کر سکی۔ آخر اطہر ہی اس کے پاس آیا وہ مجرموں کی طرح چھپی بیٹھی تھی۔

خدا کا شکر ہے سلینا کہ انور خیریت سے ہے۔

کس قدر فرشتہ نما انسان ہے یہ اطہر بھی۔ اس نے ذرا بھی میلی آنکھ سے سلینا کو نہیں دیکھا۔

اب سلینا کو بھی بات کرنے کی ہمّت پیدا ہوئی۔

''کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟'' اس نے پھر بھی ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

نہیں۔ چوٹیں زیادہ گہری نہیں ہیں۔ البتہ دماغ پر ضرب آنے سے وہ بے ہوش ہوگیا ہے۔

''دماغ پر'' سلینا دھک سے ہوگئی۔

کیا یہ چوٹیں خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتی ہیں؟ وہ ساری جان سے لرز رہی تھی۔

ہاں بھی اور نہیں بھی۔ اطہر نے کہا۔

ہوسکتا ہے یہ صرف معمولی چوٹ ثابت ہو۔ ہوسکتا ہے انور کی ذہنی حالت مزید خراب ہوجائے۔ اطہر کی آواز میں ارتعاش تھا۔

میرے خدا۔ وہ کپکپا کر رہ گئی۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو۔

یہ سب میرا قصور ہے۔ وہ آنسو ضبط کر ہی نہیں پا رہی تھی۔ صرف میری غفلت سے ہوا ہے یہ سب کچھ۔

اوہ! نہیں سلینا۔ اطہر نے دلاسا دیا۔ تم یہ کبھی سوچنا بھی نہیں۔ یہ تو قدرتی اتفاق تھا بس۔ جو کچھ ہونا ہوتا ہے وہ تو ہو ہی جاتا ہے۔ کون اپنے ہاتھوں اپنوں کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ یہ قدرتی حادثہ ہے بس۔ اطہر نے اسے دلاسا دیا یا نہ جانے وہ خود اپنے آپ کو دلاسا دے رہا تھا۔

لیکن میں نے انور کو روکا کیوں نہیں؟ مجھے روکنا تو چاہیے تھا نا۔ سلینا اب بھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر پا رہی تھی۔

تم اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا! اطہر واقعی بے حد سلجھا ہوا آدمی تھا۔ یہی کیا کم ہے کہ تم انور کے لیے اس کی سگی بہن کی طرح پریشان ہو۔

اور یہ بات نا قابلِ تردید بھی تھی۔

انور کی تکلیف میری تکلیف ہے۔ وہ بس اسی قدر کہہ سکی۔

تو پھر تم نے یہ کیوں فرض کرلیا کہ انور کی تکلیف تمہاری لائی ہوئی ہے۔

اس نے سلینا کے سر پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا۔

''یہ میری غفلت تھی''

فضول۔ جذباتیت بُری چیز ہے۔ اطہر نے کہا۔ میں جانتا ہوں انور تمہیں کتنا عزیز ہے۔ تم بے وجہ خود کو پریشان کررہی ہو۔

اطہر کے الفاظ نے کم ازکم اس کے مجرمانہ احساس کو زائل کردیا اور اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

آج تمہیں تھوڑی سی تکلیف اٹھانا پڑے گی سلینا۔ اطہر نے کہا۔

میں چاہتا ہوں جب تک انور ہوش میں نہ آجائے، تم اس کے قریب ہی رہو۔

ظاہر ہے یہ کوئی کہنے کی بات بھی نہیں تھی۔ اگر اطہر اسے روکتا بھی تو وہ اس کی یہ بات مانتی بھی نہیں۔ بھلا اسے انور کے بغیر اپنے کمرے میں چین آتا بھی کیسے۔ وہ اس کا بہت خاص، بہت معصوم مریض تھا۔

٦

.....انور کے ساتھ صابن کے غبارے اڑانے سے لے کر جنگلی پھولوں کی تلاش تک ہر ایک مرحلے پر اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ انور کی قُربت اسے ایک ایسا سکون دیتی ہے جو ماںتا اور پیار سے ملتی جلتی کسی کیفیت سے پیدا ہوتا ہے...

وہ رات سلینا نے انور کے سرہانے گزار دی۔

انور کا جسم تمام رات بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس کے سر پر سفید پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، جن میں سے جگہ جگہ خون کا رنگ جھلک رہا تھا۔ اس کا ساکت چہرہ خون ضائع ہوجانے کی وجہ سے بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ اس کمزوری نے اس کے خدّ وخال کی نزاکت اور چہرے کی معصومیت میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ سلینا ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو تکتی رہی تھی اور ہر بار جب اس کی سانس میں ذرا سی بھی بے ترتیبی پیدا ہوتی وہ اس کے سینے پر انگلیوں سے صلیب کا نشان بناتی اور کنواری ماں کو یروشلم میں بہے ہوئے خون کا واسطہ دینے لگتی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انور کے دماغ کی چوٹ اس کے دل پر لگی ہو اور اس کی سانس کی بے ترتیبی آری کے دندانوں کی طرح اس کے اپنے حلق میں اٹک رہی ہو۔ انور کی تکلیف اس نے بھرپور انداز سے محسوس کی تھی۔

اتنے عرصے میں جو اس نے انور کے ساتھ گزارا تھا وہ غیر محسوس طور پر انور سے بہت قریب ہوگئی تھی۔ مریض سے ہمدردی ہوجانا اس کے پیشے کی رِوایت تھی۔ مگر مریض کے درد کو اپنا درد بنالینا اس کے لیے بالکل نئی بات تھی۔

اس گھر میں داخل ہوتے وقت اس نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ وہ یہاں کی ہر چیز میں اپنائیت پائے گی۔ یہ راز اس پر آہستہ آہستہ کھلا تھا کہ وہ انور کے لیے ایک نیا درد محسوس کرنے لگی ہے۔ اسے انور کی خبر گیری رکھنے میں ذرا بھی پیشہ ورانہ کوفت محسوس نہیں ہوئی بلکہ آہستہ آہستہ یہ بات اس کی عادت میں داخل ہوتی گئی۔

انور کے ساتھ صابن کے غبارے اڑانے سے لے کر جنگلی پھولوں کی تلاش تک ہر مرحلے پر اس نے یہ محسوس کیا کہ انور کی قربت اسے ایک ایسا سکون دیتی ہے جو ماما اور پیار سے ملتی جلتی کسی کیفیت سے پیدا ہوتا ہے۔

اور یہ اس کے ماما اور پیار کے گڈ مڈ جذبات ہی تو تھے جو اسے رہ رہ کر انور کی صحت یابی کے لیے دعا مانگنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انور اس کی واحد دولت تھا۔ واحد پونجی تھا۔ اگر یہ پونجی بھی لٹ گئی تو وہ کنگال ہو جائے گی۔ اسے رہ رہ کر اپنے آپ پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ انور کو دریا کے کنارے کیوں لے گئی اور اگر یہ ایسا ضروری تھا تو اس نے انور کو بے تحاشا بھاگنے کی اجازت کیوں دی؟ اس کی ہفتوں کی محنت کے بعد انور آہستہ آہستہ راہ پر لگ رہا تھا کہ یہ حادثہ ہو گیا۔ اگر اس کے نتیجے میں انور کی ذہنی حالت اور بھی ابتر ہو گئی تو کیا ہوگا؟ اگر انور کی کل کی بیداری شدید ذہنی بے راہ روی کے ساتھ ہوئی تو وہ کس مسیحا کی تلاش کرے گی؟

انور کا گھرانہ مختصر ہے مگر اس گھر میں محبت کا خزانہ بے انتہا ہے۔ ہر شخص اپنے دل میں محبت اور خلوص کا دریا لیے جی رہا ہے۔ انور کے لیے سب کتنے فکر مند رہتے ہیں۔ اطہر باہر جانے سے پہلے اور باہر سے گھر آنے کے بعد سب سے پہلے انور سے ملتا ہے۔ اسے یوں تھپتھپاتا ہے جیسے وہ کوئی چھوٹا سا منّا سا بچہّ ہو۔ اس کی خوشی کا کس قدر خیال رکھتا ہے۔ اس کی مرضی پر چلتا ہے اور اس پر پیسہ پانی کی طرح بہاتا ہے۔ رات میں بار بار اس کے کمرے میں آتا ہے اسے سوتا جاگتا دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی ایک تکلیف پر اس کے اپنے چہرے پر کتنی ہی کرب ناک لکیریں ابھر آتی ہیں۔ اس کی خوشی کے لیے وہ کیا کچھ نہیں کرتا ہے۔ اس کے بس میں نہیں کہ وہ انور کے لیے آسمان سے چاند تارے نوچ کر لے آئے۔ کس آس اور امید کے ساتھ اس نے انور کو لندن بھیجا تھا۔ کتنے ہی پیسے

خرچ کیے تھے۔ کتنا ارمان رہا ہوگا کہ انور وہاں سے ڈاکٹریٹ کرکے لوٹے گا۔ مگر وہ آیا تو پچھلا بھی سب کچھ بھول بھال آیا۔ وہ کتنے صدمے سے دو چار ہوا ہوگا۔ اور اب وہ اس کی صحت مندی کے لیے کتنے پیسے خرچ کر رہا تھا۔ میرے بھی اخراجات برداشت کر رہا ہے۔ کتنی آس بندھ گئی ہوگی اس کی کہ یہ ناگہانی حادثہ ہوگیا۔ اس کی اس ساری سوچ میں کوفت ہی کوفت تھی۔ وہ بس اپنے آپ کو ہی مُوردِ الزام ٹھہرا رہی تھی۔

شاکرہ اور نجمہ نے بھی اپنی ساری خوشی بس انور تک محدود کر رکھی ہے۔ طرح طرح کے کھانے پکاتی ہیں۔ خوشامد کرکر کے کھلاتی ہیں۔ اس کے سونے جاگنے اور ہر خوشی کا کس حد تک خیال رکھتی ہیں۔ کیسے ملتے ہیں ایسے رشتے؟ انور بڑا خوش نصیب ہے۔ مگر پھر انور پے در پے حادثات کا شکار ہوتا گیا۔ اگر اسے کچھ اور بُرے حالات کا سامنا کرنا پڑا تب...

اور یہ سوچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

میرے خدا۔ انور، اطہر، شاکرہ اور نجمہ کے معبود۔ وہ گڑگڑائی۔

انور کی بیداری، صحت مندی کی بیداری ہو۔

پھر اس نے بہت کچھ سوچ کر اپنے گلے سے آبنوسی صلیب اتار کر انور کے سینے پر رکھ دی۔ اور جھک کر بڑی احتیاط کے ساتھ انور کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ جیسے وہ انور کے ذہن کے روگ کو چوس لینا چاہتی ہو۔

باہر دُھندلکا چھٹ رہا تھا اور جنگلی پرندے صبح کے گیت گانے لگے تھے۔

۷

.....اس کی آدرش مزاجی لندن جا کر بھی نہیں بدلی اس نے پکاڈلی اور سوھو کی دس دس شلنگ والی لڑکیوں کے پیچھے دوڑنے کی کوشش نہیں کی...

انور نے کراہ کر کروٹ لی۔

اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بڑی دیر سے تاریکی میں غوطے کھا رہا ہو۔ کبھی وہ محسوس کرتا جیسے وہ سمندر کی سیاہ طوفانی موجوں پر بے نام سمت میں بہا چلا جا رہا ہو۔ یہ لہریں کبھی اسے بے تحاشا اوپر اُٹھا دیتیں اور کبھی نیچے ہی نیچے گراتی چلی جاتیں۔ اور وہ ان جھکولوں میں اس قدر شدّت سے گھرا ہوا تھا کہ اس میں کچھ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں رہ گئی تھی۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے اس کے دماغ میں بے شمار ننھی ننھی سوئیاں چبھو دی گئی ہوں۔ بے شمار سیٹیاں گونج رہی ہوں اور پھر اچانک اس نے محسوس کیا جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہو اور وہ لہروں کے جھکولوں اور سوئیوں کی چبھن سے بہت دور نکل آیا ہو، جہاں چاروں طرف سناٹا تھا۔ دُھند تھی، اکیلا پن تھا اور پھر اسی سناٹے میں اسے دور سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی جیسے کوئی آہستہ آہستہ اس کی طرف آ رہا ہو اور پھر جب آنے والا بالکل اس کے سامنے آ گیا تو اس نے دیکھا کہ یہ آنے والا کوئی اور نہیں بلکہ وہ خود تھا۔

وہ جو رات گئے کسی بار سے نکل کر آ رہا تھا۔ شراب اور تھکن سے چُور، نیند سے بدمست اور دنیا سے بے زار۔ اس کی چال میں بہکا پن تھا۔ اس کے چہرے

پر کئی راتوں کی بے خوابی کی پرچھائیاں تھیں اور دماغ میں بے شمار یادیں تھیں۔ اچھی اور بُری یادیں اور یادیں کسی نہ کسی رخ سے میبل میکنزی تک پہنچ کر ختم ہو جاتی تھیں۔

میبل نے اسے بڑے دکھ دیے تھے۔

لڑکیوں کے معاملے میں وہ بڑا محتاط رہا تھا ورنہ اگر وہ چاہتا تو اپنی پُرکشش شخصیت اور قابلِ رشک ذہانت کے بل بوتے پر بے شمار وقتی محبتوں سے ہاتھ رنگ چکا ہوتا۔ جب تک وہ کالج کا طالب علم رہا۔ بے شمار لڑکیاں اس سے دوستی کی خواہش مند رہیں اور مختلف بہانوں سے اس کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرنے کی کوشش کرتی رہیں مگر وہ کسی پر بھی ملتفت نہ ہوسکا۔ جب وہ یونی ورسٹی میں تھا تو اس کی کلاس فیلو ایک لڑکی نے تو یہاں تک کیا کہ اسے مختلف بہانوں سے اپنے گھر مدعو کیا۔ اس کے ہمراہ بیشتر شامیں گزاریں۔ مگر اس نے ان تعلقات کو کبھی وقتی دوستی سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ وہ جمالیاتی حِس سے محروم تھا بلکہ وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جو مرد کی عصمت کے بھی اسی قدر قائل ہوتے ہیں جس قدر ایک لڑکی کی عصمت کے۔ پھر اس کے ذہن میں اپنی شریکِ زندگی سے متعلق ایک ذاتی معیار بھی قائم تھا اور یہ تمام لڑکیاں اس معیار پر پوری نہیں اُترتی تھیں۔

اس کی یہ آدرش مزاجی لندن جا کر بھی نہیں بدلی اور اس نے کبھی پکاڈلی اور سُوہو کی دس دس شِلنگ والی لڑکیوں کے پیچھے دوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن میبل سے ملنے کے بعد اسے اپنا انداز تبدیل کرنا پڑا۔

میبل ایک عام لڑکی ہرگز نہیں تھی۔ اخروٹ کے رنگ جیسے بالوں والی وہ اِسکاچ لڑکی اس کے ذہن میں اس وقت سے بسی ہوئی تھی جب اس نے پہلی بار زندگی کے بارے میں بالغ نظری سے سوچنا شروع کیا تھا۔

ان کی پہلی ملاقات یونی ورسٹی ہال میں ہوئی تھی۔ جب اس کے شعبے کے صدر نے اپنے نئے طلبہ کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا تھا۔ یہ تعارفی جلسہ عموماً سمندر پار سے آنے والے طلبہ کو مقامی طلبہ سے متعارف کرانے کے لیے کرایا جاتا تھا۔ اور بیشتر حالات میں اس جلسے میں آئے ہوئے ساتھی بقیہ تمام زندگی کے ساتھی بن کر ہی یونی ورسٹی سے باہر آتے۔

میبل کی سب سے بڑی خرابی اس کی خودسری تھی جس کا اندازہ اس نے اس جلسے ہی میں لگالیا تھا۔ جلسے کے بعد مختلف جنسوں کے طلبہ دو دو کے گروپ میں بٹ کر ایک دوسرے کو مزید سمجھنے کے لیے اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے تب میبل نے اس سے سوال کیا تھا۔

تو تم ہندوستانی ہو۔

نہیں میں پاکستانی ہوں۔ انور نے پاکستانی پر زور دے کر کہا۔

اُونھ، پھر بھی تم ہندوستانی ہی کہلاؤ گے۔ ہم اِسکاچ سمندر پار کر کے انگریز ہی کہے جاتے ہیں۔

لیکن ہندوستان اور پاکستان دو علیٰحدہ علیٰحدہ ملک ہیں۔ انور نے اسے مطلع کیا۔

تو کیا فرق پڑتا ہے؟ سیاسی حد بندیوں سے قوموں کے نام نہیں بدل جاتے وہ بہ ضد تھی۔

اچھا یہی سہی لیکن پھر بھی میں پاکستانی ہی کہلانا پسند کروں گا۔ انور نے کہا۔

اور تم شاید اسکاٹ لینڈ کی ہو؟ اس نے پوچھا۔

ہاں میں اِسکاچ ہوں۔ نسلاً۔ قومیت کے اعتبار سے میں انگریز ہی ہوں۔

میرا نام انور علی ہے۔ میں اور سیز ہوسٹل کے پانچویں کمرے میں مقیم ہوں۔

میرا نام میبل ہے۔ میبل میکنزی۔ میرے والد سر چارلس میکنزی اِسکاچ شعراء میں اہم مقام رکھتے ہیں اور ایڈنبرگ میں رہتے ہیں۔ میں براڈوے کی تیسری عمارت• کے گیارہویں فلیٹ میں رہتی ہوں۔

آؤ میں تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔ میبل نے کہا۔

انور کو میبل سے اس قدر بے تکلفی کی توقع نہیں تھی۔ مگر یہ لندن تھا۔ اس روز اس نے میبل کا فلیٹ دیکھا پھر انہوں نے ایک ساتھ دو پہر کا کھانا کھایا۔ اور شام تک ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ ہاں یہ سچ ہے انور کو اس کا ساتھ اچھا لگا۔ وہ یقیناً بے تکلف لڑکی تھی لیکن اس کی بے تکلفی میں بھی ایک اچھا تاثر پایا جاتا تھا۔

میبل نے اسے انڈیا آفس دکھایا۔ برٹش میوزیم کی سیر کرائی۔ عجائب گھر لے گئی۔ پارلیمنٹ کی عمارت اور ڈاؤننگ اسٹریٹ کی روایت پر لکچر بھی دیا۔ حتیٰ کہ وہ جلد ہی لندن سے ایسا مانوس ہوگیا جیسے وہ برسوں سے دھوئیں، کُہر اور سردی سے گھری ہوئی اس بستی میں رہتا چلا آیا ہو۔

۸

......سرخ سرخ بالوں والی وہ اسکاچ لڑکی آہستہ آہستہ اس کی زندگی میں یوں داخل ہوتی جارہی تھی جیسے روزنِ دیوار سے کوئی کرن گزر کر اندر پھیلتی جائے...

اس روز کے بعد سے میبل کے ساتھ شام کا وقت گزارنا اس کا معمول بن گیا۔ وہ صبح نو بجے سے لے کر کم و بیش چار بجے تک یونی ورسٹی میں مصروف رہتا۔ مختلف مفکرین کو پڑھتا۔ ان کے تصوّرات کا جائزہ لیتا اور اپنے مقالے کے لیے مواد جمع کرتا رہتا۔ چار بجے وہ اور میبل یونی ورسٹی سے ایک ساتھ باہر آتے اور کسی قریبی کیفے میں ایک کپ کافی پر دن بھر کی مصروفیات کا جائزہ لیتے۔ اس کے بعد میبل کے ساتھ اُس کے گھر آتا، لکھنے پڑھنے کا سامان چھوڑ کر پھر باہر آجاتے اور ان کی واپسی عموماً رات کے کھانے کے بعد ہوتی۔ واپسی میں وہ اکثر ایک کپ کافی کے لیے میبل کے فلیٹ پر ٹھہر جاتا اور پھر جب وہ میبل سے رخصت ہو کر ہوسٹل کی طرف لوٹتا تو عموماً اس کا ذہن میبل کے بارے میں ہی سوچ رہا ہوتا۔

سرخ سرخ بالوں والی وہ اسکاچ لڑکی آہستہ آہستہ اس کی زندگی میں یوں داخل ہوتی جارہی تھی جیسے روزنِ دیوار سے کوئی کرن گزر کر اندر پھیلتی چلی جائے۔ چناں چہ آہستہ آہستہ اس نے میبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کردیا۔ وہ لڑکی اچھی ہے۔ بالکل ایسی ہی جیسا کہ میں اکثر سوچا کرتا تھا۔ اس کی بہت

ساری خصوصیات بڑی خصوصی تھیں اور وہ ان کو بہت پسند بھی کرتا تھا اور انجوائے بھی کرتا تھا۔ بس فرق تھا تو یہ کہ وہ اسے اپنے وطن سے بہت دور آ کر ملی تھی۔ اگر وہ اسے اپنے وطن ہی میں مل جاتی تب اور بھی اچھا ہوتا۔ وہ شاید اتنا انتظار کیے بغیر اپنے گھر والوں سے فوراً ہی ملا دیتا اور جلد ہی ایک نئی زندگی شروع کر دیتا۔ ایسی زندگی جو صدیوں پر محیط ہوتی۔ وہ اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی بغیر کسی واضح مقصد کے گزارنا پسند نہیں کرتا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ زندگی کے دن مختصر بھی ہوتے ہیں اور غیر یقینی بھی۔ پھر وہ کسی بھی تاخیر سے کیوں کام لیتا۔ وہ ہر اچھی اور پسندیدہ بات کو اپنا لینے اور ہمیشہ کے لیے اپنانے کا قائل تھا۔ مگر یہ سب کچھ اس کے اپنے وطن میں ہوتا۔ وہ اب اپنے گھر سے بہت دور تھا۔ درمیان میں سات سمندر بھی حائل تھے وہ بہت جلدی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہاں کے حالات اور وہاں کے معاشرے میں بہت فرق تھا وہ بخوبی جانتا تھا۔ یہی کچھ سوچ کر اس نے انتظار کرنا صحیح سمجھا۔ ابھی انہوں نے ایک دوسرے کو پوری طرح سمجھا بھی تو نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے اگر وہ اس سلسلہ میں جلد بازی سے کام لے تو وہ انکار ہی کر دے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ اسے انتظار ہی کرنا چاہیے۔ وہ انتظار کرے گا۔ پھر اسے اپنے گھر والوں کو بھی تو ہموار کرنا ہے لیکن اسے اس سلسلے میں زیادہ پریشانی تھی بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس کی اس حرکت پر اطہر بھائی اس سے دو چار روز خفا رہتے۔ وہ جانتا تھا کہ انہیں منا لینا کس قدر آسان ہے۔ ہاں اصلی بات تو میبل کو ہموار کرنا تھا اور اس سلسلے میں اسے کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔

پھر جب ایسٹر کی تعطیلات آئیں تو میبل اسے اپنے ہمراہ ایڈنبرگ لے گئی۔ وہ اونچے اونچے کلیساؤں والے اس اسکاٹ شہر سے زیادہ چارلس میکنزی کو دیکھنے کا خواہش مند تھا جس کی شاعری کے بارے میں اس نے میبل کی مدد سے کافی معلومات حاصل کر لی تھیں اور وہ اس کے اندازِ فکر، اس کے اشعار، اس کے آدرش پر بلا تکان گفتگو کرنے کا اہل تھا۔

میکنزی عام اِسکاچ دانشوروں کی طرح جذباتی ثابت ہوا۔

اس کا گھر شہر کے آخری کناروں پر بہنے والی ندی کے کنارے واقع تھا اور بہت پرانی وضع کے ستونوں والی حویلی میں جو وکٹورین عہد کی یادگار سمجھی جاتی تھی، اپنے کتوں اور ملازموں

کی فوج کے ساتھ تنہا رہتا تھا۔
'سر' کا خطاب اس کے پرداداجیمز میکنزی کو جو ایک بحری ملاح تھا ملکہ وکٹوریہ کے دربار سے ملا تھا۔ اور اس تک نسل بہ نسل منتقل ہوتا آیا تھا۔
لیکن دولت کی فراوانی اور عزت افزائی نے اسے ذاتی نمائش کی طرف راغب نہیں کیا تھا بلکہ اس میں چھپے ہوئے اسکاچ شاعر نے رفتہ رفتہ اسے گوشہ نشین بنادیا تھا۔
انور سے مل کر اس نے کوئی خوشی ظاہر نہیں کی کیوں کہ اس کے نزدیک انور عام قاریوں میں سے ایک تھا جو اس کی ایک آدھ نظم پڑھ کر اس کے پاس دوڑے چلے آتے تھے۔
لیکن جب انور نے انگریزی شاعری کے مختلف مکاتیبِ فکر پر بحث شروع کی۔ شیلے اور کیٹس کی یاسیت اور بائرن اور ورڈزورتھ کی آفاقیت کا تذکرہ نکالا تو اس میں چھپا ہوا عام اسکاچ جوعموماً جذباتی ہوتا ہے جلد ہی انور کا معترف ہوگیا۔
اس نے بطورِ خاص انور کو اپنی زیرِ تصنیف اور نامکمل نظمیں سنائیں۔
انور کو ان کے تکنیکی حُسن و قبح پر بحث کرنے کی دعوت دی۔ اسے اپنے تازہ ترین مجموعہ کا ایک نسخہ دستخطوں کے ساتھ پیش کیا اور رات کو کھانے کے بعد اسے بڑی رازداری سے لائبریری کے ریکوں کے پیچھے چھپی ہوئی شراب نکال کر پیش کی جو پُرتگال میں اٹھارویں صدی میں کشید کی گئی تھی۔ اور جب انور نے شراب نوشی سے معذوری ظاہر کی تو وہ اس کا اس طرح مضحکہ اُڑانے پر اُتر آیا جیسے انور کسی نعمت کی اہمیت سے ناواقف ہوتے ہوئے اسے ٹھکرار ہا ہو۔
میرے بچے! میں نہیں سمجھ سکتا تم پیے بغیر کس طرح شاعری کی اتنی اچھی پرکھ رکھتے ہو؟
میرے ملک میں ایسے بھی شاعر ملیں گے جو صرف شراب پر شعر کہتے ہیں اور اس کی بوتک سے ناواقف ہیں۔ انور نے بتایا۔
حیرت ہے، سخت حیرت ہے۔ تم ہندوستانی بہت پُراسرار ہوتے ہو۔ میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ لوگ آتے ہی نہیں۔
سر میں پاکستانی ہوں۔ انور کی قومیت نے اُسے للکارا۔

اچھا اچھا پاکستانی ہی سہی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ تم لوگ حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہو۔ اس نے کہا۔

''ہاں ہم ذہین ہوتے ہیں مگر ہمارے ذہن عموماً سازشوں کو تخلیق کرنے میں صرف ہوتے ہیں''۔ انور نے پرانی تاریخ کی طرف اشارہ کیا۔

میں سمجھا نہیں! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

میں میر جعفر اور میر قاسم کی ذہانت کی بات کر رہا ہوں۔ انور نے یہ الفاظ چباتے ہوئے ادا کیے۔

اوہ! تم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اب تک معاف نہیں کیا۔ تمہاری نفرت اب تک تازہ ہے۔ اس نے بھی سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

یہ نفرت نہیں۔ یہ پوری چار نسلوں کی غلامی کا تلخ احساس ہے۔ بات معمولی بھی نہیں اور بھول جانے والی بھی نہیں۔ تاریخ تو انسان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

انور برابری سے جواب دے رہا تھا۔

میں سمجھتا ہوں۔ اور شاید تم جو کچھ کہہ رہے ہو، سچ بھی ہو۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہم صرف ماضی پر ہی گفتگو کریں اس نے کہا۔

تم ہمارے تعلقات کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور تاج برطانیہ کے ہی زاویے سے دیکھتے رہو گے یا اپنی سوچ کبھی بدلو گے بھی؟

نہیں یہ ضروری نہیں ہے۔ مگر جب میں کسی انگریز شاعر کو پڑھتا ہوں جو آزادی اور حُریت کے ترانوں کو ہر گیت پر ترجیح دیتا ہے تو میں اپنا ماضی یاد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں۔ یہ سب بناوٹ ہے۔ انگریز زندگی کے بارے میں دو تصورات رکھتے ہیں ایک وہ جو صرف اس کے جزیرے تک محدود ہے۔ اور دوسرا وہ جو تمام دوسری قوموں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ اپنے جزیرے کے لیے حُریت کے ترانے لکھتا ہے اور جزیرے کے باہر کی قوموں کے گلے میں غلامی کا پٹّا ڈالتا ہے۔ انور نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی جو نہ صرف جذباتیت سے بھرپور تھی بلکہ حقیقت بھی یہی تھی۔

اُصولی طور پر میں تم سے متفق ہوں۔ نظریاتی اعتبار سے برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کو میں نے کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا ہے۔ مگر اس کے کچھ عملی پہلو بھی ہیں اس نے کہا۔ تاج

برطانیہ نے تمہیں غلامی کے ساتھ ساتھ مادّی ترقی بھی دی ہے ورنہ آج تم افغانستان اور ایران کی صف میں ہوتے۔

''میں اسے بہتر سمجھتا ہوں۔'' انور کا لہجہ اب بھی تلخ تھا۔

وہ ہنسا۔ میرے بچے! تمہیں ابھی تجربے کی پختگی کی ضرورت ہے۔ دیکھو غلامی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک براہِ راست غلامی جو انتظامی ہوتی ہے۔ اور ایک وہ غلامی جو صرف تصوراتی ہے۔ تمہاری انتظامی غلامی ختم ہوگئی اس لیے کہ تم نے غلامی میں وہ کچھ حاصل کرلیا تھا جو اور قومیں آزاد رہ کر بھی نہ حاصل کرسکیں۔ اب ان قوموں کی غلامی کا دور ہے جو انتظامی اعتبار سے آزاد ہیں۔ مگر پھر بھی فکری لحاظ سے غلام ہیں۔ یہ غلامی کالی اور گوری چمڑی کے باہمی رشتوں کا نام نہیں ہے۔ بلکہ تجربات اور ترقی کے باہمی تناسب کا نام ہے۔ یہ صرف انگلستان اور افریقہ کا سوال نہیں ہے یہ سوال عالم گیر ہے۔ یہ امریکہ اور ویت نام کا مسئلہ ہے۔ یہ روس اور ہنگری کا مسئلہ ہے۔ یہ چین اور تبت کا مسئلہ ہے۔ یہ ہندوستان اور کشمیر کا مسئلہ ہے۔ ہم اب ایک ایسے سامراجی دور میں داخل ہورہے ہیں جہاں کئی کئی قوموں کو ایک رشتے میں منسلک کرکے غلامی پر مجبور کردیا جاتا ہے۔

پرتگالی شراب اس پر اثر کرتی جاری تھی۔

آج آزادی۔ خودمختاری اور غیر جانب داری کا تصور ایسا ہی ہے جیسے کسی فاحشہ پر پاک دامن ہونے کا شبہ۔ آج کی آزادی تو امریکی طرز کی ہے یا روسی طرز کی۔ آج قوموں کو زندہ رہنے کے لیے صرف ایک راستہ اپنانا ہے۔ وہ امریکی بلاک میں شامل ہوجائیں یا روسی بلاک میں۔ اس کے بیچ میں غیر جانب داری کا کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔ اور میں کہتا ہوں کیا یہ غلامی نہیں ہے؟ یہ وہ غلامی ہے جو قوموں میں دردِ مشترک پیدا کرکے پروان چڑھائی گئی ہے۔ سامراج کی یہ نئی شکل ہے جو انیسویں صدی کے سامراج سے زیادہ بھیانک ہے۔

جوں جوں اس پر نشہ بڑھتا جارہا تھا اس کی آواز تیز ہوتی جارہی تھی۔

میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ مگر یہ صورتِ حال ناگزیر ہے۔ انور نے کہا۔

''وقتی طور پر'' اُس نے کہا۔

اس کا علاج آزادی کی تحریکیں جنگی یا سیاسی سودے بازیاں نہیں ہوسکتیں۔ اس کا صرف

ایک علاج ہے۔ نفرت کو کم کرو۔ دوسروں کے درد کو پہچانو۔ مگر یہ ناممکن ہے تاوقتیکہ تمام قومیں ایک عالمی حکومت کے زیرِ نگیں نہ ہو جائیں۔

عالمی حکومت کا قیام صرف خیالی خوش فہمی ہے۔ اس نے کہا۔ اور اقوامِ متحدہ اس کا مضحکہ خیز تجربہ ہے۔

ہاں یہ صحیح ہے۔ مگر میں مستقبل سے نا اُمید نہیں ہوں۔ انسانی برادری کا دردِ مشترک یقیناً اسے ایک دن ایک پلیٹ فارم پر لے آئے گا۔

مگر میں نہیں سمجھتا کہ برطانیہ والے تاج کی عظمت کیسے گنوا دیں گے۔ جاپانی، سورج کی پرستش کس بنا پر ترک کر دیں گے۔

اس نے کہا۔ عالمی حکومت کا تصور ہماری عقل کی سطح سے ابھی بہت بلند ہے۔

اس کے لیے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دماغ اور عیسیٰؑ کے دل کی ضرورت ہے۔

اس بحث میں بڈھے کو شاید مزا آنے لگا تھا چناں چہ وہ جذباتی ہوتا چلا گیا۔

اس نے پرتگالی شراب کے بے شمار جام پیے۔ حتیٰ کہ وہ بولتے بولتے صوفے پر ڈھیر ہو گیا اور خراٹے لینے لگا۔ اس روز انور کو پتہ چلا کہ میبل کو خودسری کا جذبہ باپ سے ورثہ میں ملا ہے۔

بہر حال میبل کا باپ انور سے بہت متاثر ہوا۔ اور اس کی بناء پر انور کی تعطیلات بڑی عیش سے گزریں۔ اس نے میبل کے ساتھ گھنٹوں کشتی رانی کی۔ میلوں گھڑ سواری کی اور اسکاٹ لینڈ کے سنہرے میدانوں میں کلیلیں کرنے والے خرگوشوں کا شکار کیا اور رخصت ہوتے ہوتے سر چارلس میکنزی نے از راہِ مہربانی انہیں اپنی پرانی کار دے دی اور انور سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

مجھے امید ہے ہم پھر ملیں گے اچھے لڑکے۔ مجھے تم بہت پسند آئے۔

اس پسندیدگی نے انور کی ہمت بھی بڑھا دی۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ میبل سے جلد ہی اپنے دل کی بات کہہ دے گا۔

۹

.....اس کے ذہن میں لاوے کی طرح کوئی مادہ بُری طرح
پکنے لگا تھا۔ گرم گرم آگ تھی جو اس کے دماغ میں بہہ رہی
تھی۔ سیسہ تھا جو پگھل رہا تھا...

تعطیلات سے واپس آنے کے بعد وہ پھر اپنی کتابوں میں گُم ہو گئے۔ مگر ان کے روز کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پھر جب کرسمس کا تہوار آیا تو انہوں نے مل کر اس کا استقبال کیا۔ وہ مل کر بازار سے کرسمس کا درخت خریدنے گئے اور انہوں نے ایک دوسرے کی مرضی سے اُسے سجایا بھی۔ اور پھر جب کرسمس کی رات آئی اور میبل کے گھر پارٹی میں آنے والے تمام مہمان رخصت ہو گئے تب میبل نے پہلی بار اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

انور ذرا سا ہچکچایا بھی۔ میبل اس کے بچپنے پر ہنسی بھی۔

انور، مجھے کرسمس کی مبارک باد دو۔

میری کرسمس، میبل۔ انور نے خلوصِ دل سے کہا۔

نہیں۔ یوں نہیں۔ اس نے انور کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

انور نے نظریں بچالیں۔ اور کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے سوچا یہ اچھا موقعہ ہے میں اس سے اپنی خواہش کا اظہار کر دوں۔

اس نے نظریں چُراتے چُراتے کہا۔

میبل مجھ سے شادی کرو گی۔ اور پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ یہ لمحہ اس کی زندگی میں پہلی بار آیا تھا۔ اس سے پہلے بہت ساری لڑکیوں نے اس سے یہ جملہ کہا تھا اور وہ کترا گیا تھا۔

میں تمہارے لیے زہر بھی کھالوں گی۔ مگر پہلے میرے پاس آؤ۔ مجھے میری طرح کرسمس کی مبارکباد دو اس نے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

میبل آؤ آج ہم شادی کا وعدہ کریں۔ اس سے بڑھ کر اس موقع پر اور کیا ہوسکتا ہے۔ انور نے تقریباً گڑگڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

کرلیں گے ہم شادی بھی کرلیں گے۔ مگر میں محسوس کرتی ہوں انور کہ تم بہت بزدل ہو۔ میبل ہر طرح سے انور کا گھیرا تنگ کر رہی تھی۔

نہیں میبل۔ میرا خیال ہے میں بزدل نہیں ہوں۔ ہماری اپنی ایک روایت ہے۔ اور ہم اس پر سختی سے عمل کرتے ہیں اور یہ ایک خوش گوار طریقہ ہے۔

تم جسے خوش گوار طریقہ کہتے ہو میری سمجھ میں یہ طریقہ آ ہی نہیں رہا ہے۔ میبل آج اس سے بحث کرنے کے موڈ میں تھی۔

ہم دو تہذیبوں کے لوگ ہیں۔ بے شک تمہیں ہمارا طریقہ ابھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ لیکن جب ہم دونوں ایک ہوجائیں گے تم بہت خوش ہوگی ہمارے رسم و رواج میں ایک دھیما پن ہے اور دھیمے پن میں بہت رومان ہوتا ہے اور رومان کسے پسند نہیں ہوتا۔ انور نے اسے سمجھانا چاہا۔

تم لوگ دھیما چلتے ہو۔ دھیمے بولتے ہو۔ رومان میں بھی دھیما پن رکھتے ہو شاید جب ہی تم لوگ ترقی بھی نہیں کرپاتے۔ ترقی کی ہر سیڑھی پر سالوں سوچتے ہو۔ آگے قدم بڑھائیں یا نہیں۔ میبل نے مذاق اڑایا۔

تم غلط سمجھ رہی ہو اور دو باتوں کو ملا کر کوئی کلیہ بنا رہی ہو۔ ایسا نہیں ہے۔

انور نے پھر اسے سمجھانا چاہا۔ مگر میبل تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ انور اپنے آپ کو بہت دیر سے بچا رہا تھا لیکن اب وہ بچا نہیں پایا۔ مگر پھر بھی جلدی سے رخصت پا کر وہ اس کے فلیٹ سے چلا آیا۔

کرسمس کا ہنگامہ ختم ہوا تو نئے سال کی آمد آمد کا غُل ہوا۔ انور نے نئے سال کی تمام تر تفریح بھی میبل کی مرضی سے ترتیب دی۔ اس بار بھی ۳۱ر دسمبر کی شب میبل کے فلیٹ پر ایک ہلکی سی پارٹی ہوئی۔ اور جب تمام مہمان رخصت ہوئے اور رات گہری ہونا شروع ہوئی تب میبل نے لندن کی آوارہ گردی کا پروگرام بنایا اور وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لندن کی نیم تاریک اور پُر شور سڑکوں پر گھومتے پھرے۔ انہوں نے لوگوں سے بھونڈے مذاق کیے ناچنے والوں کے ساتھ شریک بھی ہوئے اور اس طرح گھومتے پھرتے وہ ٹریفلگر اسکوائر کے فواروں کے پاس پہنچ گئے جہاں لندن کی روایت کے مطابق ٹھیک آدھی رات کو بے شمار لڑکے لڑکیاں حوضوں میں کپڑوں سمیت کود کر نئے سال کا استقبال کرتے ہیں اور لندن کے اس مذاق میں جسے بھی گھسیٹا جائے اسے احتجاج کا موقع نہیں مل پاتا۔ میبل ان کے ہتھے چڑھ گئی، اور جیسے ہی آدھی رات کا گھنٹہ بجا کسی نے میبل کو پکڑ کر حوض میں گرا دیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد انور کو بھی کپڑوں سمیت اس کی تقلید کرنی پڑی اور بہ مشکل تمام وہ میبل کو اس کے فلیٹ تک واپس لا سکا۔

فلیٹ میں داخل ہوتے ہی میبل نے ہیٹر آن کیا اور انور نے عجلت سے آتشدان کو دہکانا شروع کر دیا۔ پھر دونوں نے الگ الگ کمروں میں جا کر الٹا سیدھا لباس تبدیل کیا۔ کافی بنائی اور آتش دان کے قریب بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے اپنے جسم کو گرمی پہنچانے لگے پھر جب انور کا لباس خشک ہو گیا اور وہ جانے کی تیاری کرنے لگا تب میبل نے کہا۔

جانا ضروری ہے کیا۔ باہر دیکھو سردی کتنی ہے۔

مگر جانا تو ضروری ہے ہی۔ انور نے گڑ بڑا کر کہا۔

اب اتنا بھی ضروری نہیں ہمارے پاس دو کمرے ہیں میں تمہارا بستر ٹھیک کر دیتی ہوں میبل نے شرارت سے کہا۔ مجھ سے ڈر لگ رہا ہے کیا؟

نہیں۔ نہیں یہ بات تو نہیں۔ مگر میں جانا چاہتا ہوں۔ انور پھر گڑ بڑا رہا تھا۔

میں پھر یہی کہوں گی کہ تم بزدل ہو بہت بزدل۔ میبل نے مذاق اڑایا۔

تم بار بار مجھے بزدل کا طعنہ کیوں دیتی ہو۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے کہ میں تمہیں

پسند کرتا ہوں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔
پھر وہی شادی۔ میں بھی تو تم سے کہہ چکی ہوں شادی تو کیا میں تو تمہارے لیے زہر بھی کھا سکتی ہوں۔اب اس سے زیادہ میں تمہیں کیا یقین دلاؤں۔
اور پھر میبل نے اس کے کمرے کی لائٹ بند کردی اچھے بچّوں کی طرح سو جاؤ۔
انور بستر پر اوندھا گر پڑا تھکا ہوا تھا سو گیا۔مگر کافی میں کیا تھا وہ یہ نہ جان سکا تھا۔میبل نے اسے دھوکا دیا تھا۔
جب وہ صبح اُٹھا تب وہ بدلا بدلا سا تھا میبل بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ وہ اسے بہت خوب صورت لگی جی چاہا وہ اس کے پاس چلا جائے مگر وہ کوشش کر کے بیٹھا ہی رہا۔اسے میبل پر غصہ تھا۔
میبل خود اس کے پاس آ گئی۔اس کی نظریں کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں۔
ہلو بے بی شرما رہے ہو۔کوئی بات کرو۔
میبل۔انور تقریباً روتے ہوئے بولا۔تم مجھ سے شادی کا وعدہ کرو میبل!
شادی، شادی، شادی کتنی بار تم یہ دہراؤ گے۔صبح صبح کیوں میرا موڈ خراب کر رہے ہو۔ ابھی میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا ہے۔میبل کا لہجہ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔
تو اب سوچ لو۔انور نے زور سے کہا۔اور یاد رکھو اگر تم نے کوئی گڑ بڑ کی تو میں تمہیں اغوا کر کے اپنے ملک لے جاؤں گا۔
تو مجھے اغوا کر لو۔شادی کی کیا ضرورت ہے۔میبل اب بھی اس بات کی طرف نہیں آ رہی تھی اور انور اب اس راستے سے ہٹنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس روز بات اس سے آگے نہیں بڑھ سکی لیکن اب انور بہت اَپ سیٹ تھا۔اسے اس روز میبل کے یہاں نہیں رُکنا چاہیے تھا۔ وہ خود سے بھی خفا تھا۔ وہ ایسا نہیں تھا جیسا کہ وہ بن چکا تھا۔اس کے ساتھ دھوکا ہو چکا تھا اور اس کا ازالہ بس اسی میں تھا کہ وہ جلد از جلد اس سے شادی کر لے۔
وہ اکثر اس سے تقاضا کرنے لگا مگر میبل بات گول کر جاتی۔ اور ایک دن یونی ورسٹی سے واپسی پر جب وہ انور کو نہیں ملی تب وہ سیدھا اس کے گھر پہنچا۔

حسبِ عادت دستک دیے بغیر اندر چلا آیا۔ اور تب اس نے دیکھا کہ میبل ایک اجنبی نوجوان کی کمر میں ہاتھ ڈالے قہقہے لگا رہی تھی۔

آئی ایم سوری۔ وہ گڑ بڑا کر پلٹ پڑا۔

اِٹس آل رائٹ۔ میبل نے کہا۔ مسٹر انور علی۔ مسٹر بیڈن۔ بُرا ہو بدیسی اخلاق کا، انور نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

ہاؤ ڈو یو ڈو۔

ہاؤ ڈُو یو ڈو۔ کا تبادلہ ہوا۔

بیڈن۔ میبل نے اس اجنبی نوجوان سے کہا۔ یہ میرے کلاس فیلو ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔ میرے سب سے اچھے دوست ہیں۔

اور انور ان سے ملو یہ میرے شوہر بیڈن ہیں جو آج ہی جنوبی افریقہ سے تجارتی دورے پر لندن آئے ہیں۔

میبل شادی شدہ بھی ہو سکتی ہے۔ انور بھلا یہ سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔

اور میبل ہنس ہنس کر اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی انور بہت بھولے ہیں۔ دوستی دوستی میں محبت کر بیٹھے روز تقاضا کرتے ہیں کہ میں ان سے شادی کرلوں۔

کیوں انور؟ اب کے اس نے براہِ راست انور کو مخاطب کیا۔

آج تو تم اس ارادے سے نہیں آئے ہونا۔

میبل کا یہ مذاق انور کو زہر معلوم ہوا اسے ایسا لگا جیسے وہ ابھی ابھی کسی آتش گیر مادے کی طرح بھک سے اُڑ جائے گا۔

وہ اُلٹے پاؤں وہاں سے لوٹ آیا۔ آج میبل اسے کسی ڈائن جیسی لگ رہی تھی۔ اسے اپنی سمجھ پر بڑا ناز تھا اور آج وہ اپنی عقل اور سمجھ کی تمام بازی ہار چکا تھا۔ سرخ سرخ بالوں والی وہ حسینہ اسے جھوٹ اور مکر کی چڑیل محسوس ہو رہی تھی۔ یہ کیا ہوگیا۔ وہ تو بے عزت ہوگیا۔ اب اس کے پاس قسم کھانے کو عزت بھی باقی نہیں بچی تھی۔ وہ ہر ایک سے منہ چھپا رہا تھا بالکل ایسے ہی جیسے کوئی لڑکی اپنی بربادی پر پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے وہ بھی رو پڑا۔ زور زور سے۔ میبل کے قہقہے اور اس کا مذاق اڑانے کا انداز اسے خودکشی پر اکسا رہا تھا۔ اس

کے ذہن میں لاوے کی طرح کوئی مادہ بری طرح پکنے لگا۔ گرم گرم آگ تھی جو اس کے دماغ میں بہہ رہی تھی۔ سیسہ تھا جو پگھل رہا تھا۔ اور پھر وہ اس رات ایک شراب خانے میں گھس گیا اور دیر تک مختلف النوع شرابیں حلق سے اُتارتا رہا۔ یہاں تک کے اس کے منہ سے کف بہنے لگا اور ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا پھر وہ لڑھکتا ہوا باہر نکلا اور ابھی وہ تاریک گلی کے اختتام تک پہنچا ہی تھا کہ اٹھائی گیروں نے اسے پکڑ کر اس کی جیبیں خالی کردیں اور اس کے سر کو پتھریلی سڑک پر پٹک پٹک کر اتنا لہولہان کیا کہ وہ بالکل بے ہوش ہوگیا۔

اسے صرف اتنا یاد رہ گیا تھا کہ جب وہ بے ہوش ہوا تھا تو اس کے سر میں ہزاروں سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ بے شمار سیٹیاں بج رہی تھیں اور اس کے بعد تاریکی چھا گئی تھی اور اسے کچھ یاد نہ رہا۔ اور اِس وقت بھی اس کے دماغ میں ویسی ہی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی میبل سے رخصت ہو کر آیا تھا اور ابھی چند ہی لمحوں پہلے اُچکوں نے اس کے سر کو پتھریلی سڑک پر لہولہان کیا تھا۔

۱۰

.....اور اس کے ذہن کی تاریکیوں میں مہینوں کی رات
کے بعد ہوش مندی کی سحر طلوع ہونے کو تھی...

اس نے کراہ کر کروٹ بدلی۔
میبل یہ تم نے کیا کیا؟ وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ مگر اس بار اس نے جو زبان استعمال کی وہ انگریزی تھی۔

پھر اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اپنا نازک ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا ہو۔ اور پھر اس نے اپنے بالوں میں کسی کی انگلیوں کی گردش محسوس کی وہ سوچنے لگا سڑک پر چلنے والی کسی لڑکی کو شاید اس پر رحم آ گیا ہے۔ مگر جب اس کی آنکھیں کھلیں اور اس نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو منظر بدلا ہوا تھا۔ وہ ایک آرام دہ کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور سفید لباس والی ایک لڑکی اس کے برابر بیٹھی تھی۔
میں کہاں ہوں؟ اسے یہ کمرہ دیکھا بھالا سا لگ رہا تھا لیکن وہ پہچان نہیں پا رہا تھا کہ اس نے کب اور کہاں یہ کمرہ دیکھا تھا۔ شاید اسے دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کئی بار اپنی آنکھیں مسلیں۔ میں کہاں ہوں۔ کہاں ہوں میں؟ اس کی آواز آہستہ تھی اور وہ خاصا گھبرایا ہوا سا تھا۔ وہ انگریزی بول رہا تھا۔
تم اپنے گھر میں ہو انور۔ ایک ٹھہری ہوئی مترنم آواز میں اسے جواب ملا۔

کس کے گھر میں؟ یہ میبل کا گھر تو نہیں۔ یہ میرا ہوسٹل بھی نہیں ہے؟ آخر میں کہاں ہوں؟ میں نے کہا نا تم اپنے گھر میں ہو اپنے گھر میں ہو اپنے خاندان والوں کے ساتھ۔ سلینا اس کے سرہانے کھڑی تھی اور اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ دو۔ اس بار سلینا کا جواب اُردو میں تھا۔

اور تب انور کچھ ہوش میں آیا۔ ہندوستان میں؟

نہیں پاکستان میں۔ جواب ملا۔

ہاں میرا وہی مطلب تھا۔ مگر تم کون ہو؟ سامنے تو آؤ۔ انور نے کمزور سی آواز میں کہا۔

''میبل'' سلینا کے لہجے میں بے اندازہ دکھ اور بہت خوشی: دونوں جذبے ایک ساتھ سمٹ آئے تھے۔

''میبل''۔ اور انور نے سلینا کے ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگالیا۔ جیسے اسے سکون آ گیا اور وہ خاموشی سے پھر سو گیا۔

سلینا جیسی ذہین لڑکی کو یہ اندازہ لگانے میں قطعی دیر نہ لگی کہ انور کی یادداشت ایک امید افزا موڑ پر آ گئی ہے۔ اور اس کے ذہن کی تاریکیوں میں مہینوں کی رات کے بعد ہوش مندی کی سحر طلوع ہونے کو ہے۔ ابھی ابھی اس نے کسی میبل کو یاد کیا تھا۔ میبل کا گھر اس کا اپنا ہوسٹل اور پھر یہ احساس کہ وہ کسی تیسری جگہ پر ہے۔ یہ سب ہوش مندی کی باتیں ہیں۔ وہ سوچنے لگی۔ شاید اس کا ذہن جس نازک جھٹکے سے بے قابو ہوا تھا اس روز سر کی چوٹ نے اس کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا اور یہ شاید قدرت کی بہت ساری غیر متوقع عنایات میں سے ایک معمولی سی مہربانی تھی کہ اس رگ کا چھڑنا ہی اس کے حق میں مفید ثابت ہوا تھا۔ ظاہر ہے یہ احساس اس کے لیے کس قدر خوشی کا باعث ہوسکتا تھا۔ اس نے اس لمحے کو اپنے ذہن میں پھر تازہ کیا جس لمحے انور پتھریلی زمین پر گر پڑا تھا۔ اس کے سر پر چوٹ آئی تھی اور اس کا سارا چہرہ خون سے نہا گیا تھا۔ اسے وہ تمام لمحات یاد آ رہے تھے اطہر کا اسے اٹھا کر کیمپ کی طرف بھاگنا۔ گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے جانا خود اس کا کیمپ تک پہنچتے پہنچتے حواس باختہ ہوجانا۔ شاکرہ کی گود میں سر رکھ کر خوب رونا۔ اپنے آپ کو مجرم گردانا۔ وہ اب سے پہلے تک کتنی ہی بار اپنے آپ کو الزام

دے چکی تھی۔ وہ تو اپنے آپ کو کبھی بھی معاف کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھی۔ وہ کس قدر روئی تھی کنواری مریم کے آگے اس نے خود کو گرا دیا تھا۔ ڈھیر ہوگئی تھی وہ۔ تڑپ تڑپ کر اس نے کتنی ہی دعائیں مانگی تھی اس کی صحت یابی کے لیے کتنے ہی واسطے دیے تھے اس نے کنواری مریم کو اور پھر اس وقت سے اب تک وہ انور کے ساتھ تھی۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہ سو نہیں پائی تھی۔ وہ چپکے چپکے بس دعا ہی مانگتی رہی تھی۔ اس نے تو اپنی صلیب بھی اس کے سینے پر رکھ دی تھی: پورے خلوص اور پوری عقیدت کے ساتھ رات کس مشکل سے کٹی تھی۔ صبح کس امید پر ہوئی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی کتنی ہی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہم ان سے دل شکستہ ہو جاتے ہیں۔ سمجھتے ہیں سب کچھ ہمارے ساتھ برا ہی ہوا ہے۔ ہم خدا سے بھی لڑ پڑتے ہیں۔ شکوہ کرنے لگ جاتے ہیں مگر ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کتنی ہی خرابیوں میں کتنی تعمیر کے پہلو چھپے ہوتے ہیں۔ خدا کا پیغام سامنے آجاتا ہے۔ جو ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے تمہاری عقلیں وہاں تک نہیں پہنچ سکتی ہیں۔ لہٰذا ہر حال میں اُمید کا دامن تھامے رہو۔ خدا بہت فضل کرنے والا ہے۔

انور نے پھر کروٹ بدلی۔ میبل تم کہاں ہو؟ یہ آواز بہت دھیمی تھی مگر سلینا نے سن لی۔ اور اس نے پھر اپنا ہاتھ انور کے ماتھے پر رکھ دیا اور انور پھر سکون سے سو گیا۔

انور کی یادداشت واپس آچکی ہے۔ یہ احساس اس کے لیے کس قدر خوشی کا باعث تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بات بھی فوراً ہی محسوس کر لی تھی کہ میبل اس کی زندگی میں اس حد تک دخیل رہ چکی ہے کہ مہینوں کی ذہنی تاریکی کے افق پر جو پہلا نام طلوع ہوا ہے وہ میبل کا ہی ہے۔

میبل یہ تم نے کیا کیا میبل؟

اور سلینا نے بغیر کسی اور تفصیل کے یہ اندازہ لگا لیا کہ اس کے اندازے کے مطابق وہ سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی میبل ہی ہے جس نے اسے کسی دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اور پھر سلینا واقعات کے تانے بانے بُننے لگی وہ جوں جوں سوچتی جا رہی تھی انور کے ذہنی صدمے کی جڑوں تک پہنچ رہی تھی۔

انور بے خبر سو رہا تھا یا بے ہوش تھا یا ان دونوں کیفیتوں کے درمیان کہیں تھا۔ مگر ابھی پوری طرح وہ بیدار نہیں تھا۔ جب ہی تو وہ اپنے گھر کا وہ کمرہ نہیں پہچان رہا تھا، جو اس کا اپنا کمرہ تھا۔ جہاں آج بھی اس کی میز، کرسی، الماری اور مسہری اسی انداز سے رکھی تھیں جب وہ لندن نہیں گیا تھا۔ میز پر اور دیوار پر ٹنگی ایک پر ایک اس کی ڈھیروں کتابیں ویسی ہی رکھی تھیں۔ ڈھیر سارے قلم۔ دیوار پر لٹکا کیلینڈر جو اب نئے سالوں کے مطابق کئی بار بدل چکا تھا۔ الماری میں لٹکے ہوئے اس کے کپڑے۔ جسے اب وہ استعمال ہی نہیں کرتا تھا۔ بہترین سوٹ یونہی الماری میں پہنے جانے کے انتظار میں تھے۔ مسہری کے سامنے اس کی خوب صورت تصویر۔ اس فریم کی ہوئی تصویر میں وہ کالج کے بلیزر میں کس قدر شان دار لگ رہا تھا۔ کھڑکی پر خوب صورت پردہ جو پنکھے کی ہوا سے ادھر اُدھر ہوتا تب باہر کا حسین اور دل کش منظر خود بہ خود اس کے کمرے میں چلا آتا۔ مگر سب کچھ تو یونہی تھا۔ صرف کمرے کا مالک سب کچھ بھول چکا تھا۔ اسے قلم کاغذ کا استعمال بھی نہیں معلوم تھا۔ وہ اپنی ہی پڑھی ہوئی کتابیں نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس نے کتنے ہی عرصے سے اپنی الماری کھولی بھی نہیں تھی۔

اس وقت انور سر پر سفید پٹیوں میں جکڑا بے سدھ پڑا ہے۔ اس کی سانسیں چل رہی ہیں دل دھڑک رہا ہے لیکن ہاں ابھی ابھی اس نے کسی میبل کو یاد کیا تھا۔ یعنی اس کا ذہن بھی کام کر رہا ہے۔ وہ اپنی دنیا میں شاید لوٹ آئے گا۔

لیکن... یہ سوچتے ہوئے سلینا پھر سے خوف زدہ ہوگئی۔

١١

.....ان کی آنکھوں میں کاجل کے ڈورے کے ساتھ ساتھ
حیا کی پتلی سی لکیر بھی ہوتی ہے اور جانتی ہو یہ لکیر ہی تو ہے
جو کنوار پن کی دلیل ہے...

وہ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے تھکی ہوئی تھی اور اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی بس سوچے جارہی تھی۔ میبل نے انور کو کتنے دکھ دیے۔ اتنے دکھ کے وہ اپنے آپ کو بھول گیا۔ یہ حساس سا نوجوان مغرب سے کس قدر کرب لے کر لوٹا ہے۔
ذہنی تاریکی چھٹ جانے کے بعد جو نام سب سے پہلے اس کے لبوں پر آیا ہے وہ میبل ہی کا ہے۔ وہ اسے نہیں بھول پایا ذہنی گمرہی میں بھی اور ہوش مندی میں بھی۔
میبل ہی اس کے وجود میں سمائی رہی کبھی اسے دنیا سے بیگانہ کردیتی ہے اور کبھی جگا دیتی ہے۔ اور دونوں طرح وہ اس کا تماشہ دیکھ رہی ہے اور دونوں طرح سے اس نے اس کا تماشا بنادیا ہے۔
مگر کیا قصور اس میں انور کا نہیں ہے؟ اس نے انصاف کے ساتھ سوچا۔ نہیں دراصل ایسی سوچ انور کے لیے صحیح نہیں ہے دراصل یہ مشرقی لوگ محبت کے معاملے میں ہوتے ہی شدید ہیں۔

آج اچانک اسے اپنا باپ یاد آگیا۔ یہ کہانی برسوں پُرانی تھی۔ مگر سلینا کی روح میں اس کے سارے وجود میں دل و دماغ میں ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی۔ اپنی

مضبوط جڑیں رکھتی تھی۔ سلینا اس کہانی کو یاد کرے یا یاد نہ کرنے کی ایکٹنگ کرے۔ اس وقت یہ کہانی اپنی پوری طاقت سے سلینا کے ذہن میں اتر آئی۔

اس کا باپ بھی مشرقی تھا۔ ہندوستانی یا شاید پاکستانی۔ وہ بھی اسکاٹ لینڈ آیا تھا اور اسے اس کی ماں مل گئی۔ اسے شاید کالے بالوں والی لڑکی عام لڑکی لگتی تھی۔ جب ہی تو اس نے سنہرے بالوں والی اس کی ماں کو جھٹ پسند کرلیا۔ اور پھر فوراً ہی شادی کرلی۔ اور خود اس کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔ گویا وہ اسکاٹ لینڈ صرف ان ہی دو مقاصد کو لے کر آیا تھا۔ اسے جانے کیا جلدی تھی۔ کوئی پتا نشان باقی نہیں چھوڑا اُس نے۔ اور اس نے تو اپنی بیٹی کو بھی ابھی جی بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھلا سلینا اپنے باپ کو کیسے دیکھ پاتی لیکن اپنی ماں سے اس نے نہ جانے کتنے ہی قصے سنے تھے۔ اس کی ماں واقعی اس کے باپ سے بہت محبت کرتی تھی جب ہی تو وہ اپنی آنکھوں میں خواب سمیٹے کہا کرتی وہ بڑا وجیہہ نوجوان تھا۔ اسے جو بھی دیکھ لیتا ہزار جان سے فریفتہ ہوجاتا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ہزار جان سے خود فریفتہ ہوگیا۔ وہ اسے اس قدر چاہتا تھا کہ بعض اوقات وہ سوچتی کہ شاید مشرق کی تمام تر محبت وہ تنہا اپنے دل میں اس کے واسطے چرالایا ہے۔

ماں بتاتی کہ وہ اپنے ملک کی ہمیشہ تعریف کرتا اور جب بھی اپنے وطن کی بات کرتا تو بے تکان بولے ہی جاتا کبھی وہاں کے کھیتوں کا ذکر کرتا۔ اور کبھی وہاں کی تہذیب اور تمدن کی کہانیاں سناتا۔ اپنے ملک کی لڑکیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ بڑا جذباتی ہوجایا کرتا۔

ہمارے ملک کی لڑکیاں تم لوگوں سے یک سر مختلف ہوتی ہیں۔ وہ لمبے لمبے بال رکھتی ہیں۔ ان کے بالوں میں بہت سارا رومان چھپا ہوتا ہے ان کی اوڑھنیوں کے رنگ موسم کی مناسبت سے بدلتے رہتے ہیں۔ جنہیں وہ خود بڑے ارمانوں سے رنگتی ہیں۔ ان پر گوٹے ٹانکتی ہیں۔ کرن لگاتی ہیں اور جب انہیں سر سے اوڑھتی ہیں تو چہرے جیسے بھی ہوں بدلی میں چاند کی مانند چمک جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کاجل کے ڈورے کے ساتھ ساتھ حیا کی پتلی سی لکیر بھی ہوتی ہے اور جانتی ہو یہ لکیر ہی تو ہے جو ان کی کنوارپن کی دلیل ہوتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کا برسوں انتظار کرتی ہیں۔ اس محبوب کا جسے انہوں نے خواب میں

بھی کبھی نہیں دیکھا ہوتا ہے۔ وہ دروازے کی دستک سے اپنے دل کی دھڑکنوں کو جوڑ کر رکھتی ہیں۔ وہ اپنے محبوب کو گرم گرم روٹیاں پکا کر کھلاتی ہیں اور اسے عبادت کا درجہ دیتی ہیں۔ ہمارے یہاں کی لڑکیاں غیر مردوں کے سائے سے بھی دور ہوتی ہیں اور ہمارے یہاں کی لڑکیاں اور ہاں لڑکے بھی اپنی قسمت پر شاکر ہوتے ہیں اور یہ ایمان رکھتے ہیں کہ ہر ایک کی قسمت میں اللہ نے ایک نہ ایک مرد یا لڑکی لکھ دی ہے جو اسے ضرور ملنی ہے۔ اور اسی لیے وہ اپنی قسمت کی لڑکی یا لڑکے ڈھونڈنے نہیں نکلتیں۔ بس انہیں آپ ہی آپ مل جاتی ہے۔

پھر ماں پوچھتی۔ تم اپنی قسمت کی لڑکی چھوڑ کر یہاں کہاں آ گئے۔

تب وہ جواب دیتا۔ یہ بھی قسمت کی بات ہے ایلوینا۔ میری قسمت میں تم تھیں اور میں اپنی قسمت کی لڑکی چرانے یہاں آ گیا۔

پھر وہ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا کرتا۔

میں تمہیں اپنے دیس لے جاؤں گا۔ تم ان لڑکیوں سے مختلف سہی اور میرے ماں باپ تمہیں فوری پسند بھی نہیں کریں گے لیکن پھر بھی وہ تمہیں قبول کر لیں گے۔ پرانے بکس میں چھپے کسی خاندانی زیور کو تمہارے جسم پر سجا دیں گے، اور گھر بھر کی چابی تمہارے ہاتھوں میں تھما کر ریٹائر ہو جانے کا اعلان کر دیں گے۔ پھر تم ان کے گھر کی ملکہ بن جاؤ گی۔ ہم لوگ تقدیر کے قائل ہوتے ہیں ایلوینا اور تمہیں میری تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا جائے گا۔ وہ ہماری تمہاری نسلوں کے انتظار میں اپنا سارا دن گزاریں گے اور پھر انہیں پا کر ابا گھوڑا بن جائیں گے اور اماں چوڑیاں، اوڑھنی اور کھلونے دینے میں اپنی ساری ممتا لٹا دیں گے۔ تم دیکھنا۔ تمہیں بہت مزا آئے گا۔ وہ دنیا اس دنیا سے بہت مختلف بھی ہے اور خوب صورت بھی۔ تمہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ میں کئی بچوں کا باپ ہو کر بھی اپنے باپ کے سامنے جھک کر کھڑا ہوں گا۔ گھر میں دیر سے آنے پر ڈانٹ سنوں گا۔

اماں سے دھیمی آواز میں بولوں گا۔ اور جب اماں بے خبر سو رہی ہوگی تب میں ان کے پاؤں کے نیچے اپنی جنت ڈھونڈ رہا ہوں گا۔ بس یہی ہے ہماری ریت مگر تمہیں تو اپنے ہی دیس کی لڑکی سے پیار کرنا چاہیے تھا نا؟ سلینا کی ماں چمک کر کہتی پھر تمہیں کوئی اور لے

اڑتا تب؟ بس میں تمہیں ہی پانا چاہتا تھا۔تم میرے خوابوں میں آیا کرتی تھیں۔ پھر وہ کہتا ہم لوگ خواب بہت دیکھتے ہیں۔ دیکھوتم مغرب میں پیدا ہوئیں۔ میں کتنا سفر مخالف سمت سے طے کرتا تمہارے پاس آ گیا۔ بس پہلی ہی نظر میں تمہیں دیکھ کر اپنا دل ہار بیٹھا۔ ہم لوگ ایک نظر میں سب کچھ ہار دیتے ہیں ایلوینا۔ وہ بڑے مزے سے کہتا۔

بہت جذباتی ہوتے ہوتم لوگ۔ ایلوینا کہتی۔

مگر یہ جذباتیت بڑی دائمی ہوتی ہے۔ ہم لوگ تجربات کے قائل ہی نہیں ہوتے۔ تقدیر میں جو کچھ ہوتا ہے اسے بخوشی اپنے لیے قبول کر لیتے ہیں ۔ یہی بس ہماری محبت ہے ایلوینا۔ اس کوتم قناعت کا نام بھی دے سکتی ہو۔ بہت کچھ پانے کے چکر میں ہم نہیں پڑتے جو کچھ ملتا ہے اسی کو بہت کچھ جان لیتے ہیں تم میرے لیے سب کچھ ہو۔ بہت کچھ ہو اور پھر وہ اپنی محبت کا نہ ختم ہونے والا خزانہ لٹانے لگتا۔

اور اس کی ماں اس دیس کی خوب صورتی کے خواب دیکھا کرتی۔

اسے اپنے شوہر سے بہت محبت تھی۔ لیکن اس کے خواب پورے نہ ہوئے۔ اس کا باپ ایک دن کار کے حادثے میں ختم ہوگیا۔ اس کی ماں کے صندوق میں چھپا ہوا زیور بس وہیں پڑا رہ گیا۔ گھر بھر کی چابی لیے اس کی ماں شاید اسے ڈھونڈتی ہی رہ گئی۔ اور اس ایک اکلوتی تصویر کو سینے سے لگائے روتی رہی جس میں اس کا بیٹا سنہرے بالوں والی خوب صورت لڑکی کے ساتھ بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ نہ اس کے گھر والوں کے پاس اس کا پتا تھا اور نہ ایلوینا کے پاس۔

سلینا پیدا ہو چکی تھی لیکن وہ کہاں کی تھی اسے نہیں معلوم ہوسکتا تھا۔

ہاں ماں جو محبت کی عادی ہو چکی تھی اسے اپنی تنہائیاں بری طرح کاٹنے لگیں وہ مرے ہوئے شوہر کی محبت کی یاد میں زندگی بتانے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے پانچ برس تک اپنے بدیسی شوہر کا سوگ منایا۔ پھر اسکاٹ لینڈ میں ماں کا یہ سوگ مذاق کا نشانہ بن گیا۔ کیوں کہ اب بھی ماں کا حُسن اپنی مثال آپ تھا۔ اور جب سلینا نے چھٹے سال میں قدم رکھا تو ماں نے اسمتھ سے شادی رچالی۔

اگر میرا باپ زندہ ہو کر آ جائے اور میری ماں کو اسمتھ کے ساتھ دیکھ

لے تو وہ بھی انور کی طرح ذہنی توازن کھو دے..... وہ یہ سب کچھ بارہا سوچ چکی تھی اس بار بھی اس کہانی کو دہرا کر سسک پڑی۔

''یہ مشرقی لوگ اپنے قاتل آپ ہوتے ہیں''

۱۲

.....میرا نام سلینا ہے اور میں سلمیٰ کا دل رکھتی ہوں۔ میں سلینا ہوں یا سلمیٰ؟ میں کون ہوں؟ کتنی بدنصیب ہوں کہ اپنے آپ کو ہی نہیں پہچانتی...

صبح کے دس بج رہے تھے اور انور اب بھی سو رہا تھا۔ سلینا نے سوچا وہ اپنی تمام تر بے خوابی کا بدلہ لے رہا ہے اس نے کئی بار اس کے کمرے کا چکر لگایا اور اسے سوتا ہی پایا۔ اس کے پاس کوئی اور تو کام تھا ہی نہیں۔ اس نے کھڑکی کا پردہ سرکایا باہر کی فضا اسے اچھی محسوس ہوئی وہ چاہتی تو باہر باغ میں جاسکتی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ خوش رنگ پھول اور ہری ہری گھاس اسے ایک دم سے تازہ کردیتی لیکن اسے اس وقت انور کا خیال تھا۔ جانے وہ کب اٹھ جائے۔ کوئی اور دن ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ اب انور کی طبیعت نے پلٹا کھایا تھا۔ اسے ذرا ذرا اپنا ماضی یاد آنا شروع ہوا تھا۔ جانے اٹھتے ہی وہ کیا کہے۔ اس کا طرزِ عمل کیا ہو۔ خاموش رہے یا ماضی کی باتیں دُہرائے۔ جانے کسی عذاب سے گزرنے کی تفصیل اسے یاد آجائے وہ اس کرب ناک لمحے میں اسے اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ پھر اس کی سر کی چوٹ اپنی جگہ تھی، جانے اس میں کتنی تکلیف ہو۔ شاید فوراً ہی اسے درد کی دوا دینی پڑے۔ یہی سب کچھ سوچ کر وہ برابر اس کے کمرے کا چکر لگا رہی تھی۔ اسے اپنے کمرے میں ہرگز بھی قرار نہیں تھا۔

وہ بھی تو ماضی کی بے شمار یادوں کی شکار تھی اور رات تو اس نے اپنا تمام ماضی کنگھال ڈالا

تھا جو تمام کا تمام اس کے باپ اور ماں سے متعلق تھا۔اور وہ بھی کون سی خوش گوار یادیں تھیں۔ جب بھی وہ انہیں یاد کرتی عجیب قسم کے جذبے سے دو چار ہو جاتی۔ اس کی زندگی کا اکیلا پن اسے کب خوش رہنے دیتا۔ وہ اب بھی انور کے ہی کمرے میں تھی۔ طشت اور لوٹا اس کی پائینتی رکھ کر خود سر ہانے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ انور اپنی آنکھیں کھولے تو اسے دیکھے۔ جانے اس کے نئے اور بدلے بدلے ذہن پر اس کا کیا اثر پڑے۔

گھر کے سب لوگ معمول کے مطابق جاگ رہے تھے۔ اطہر دفتر جا چکا تھا اور جانے سے پہلے انور کے کمرے میں بھی آیا تھا۔ اس نے انور کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور جانے کیسے اس کی پیشانی کی گرمی اس کی آنکھوں میں اتر آئی۔ کئی قطرے آنسو اطہر کی آنکھوں سے ٹپک پڑے جسے اس نے مردانگی کے منافی جانتے ہوئے سلینا سے چھپانے کی بھی کوشش کی۔ مگر سلینا تو اطہر کی آنکھوں کی سرخی بھی دیکھ چکی تھی، جو ساری رات کی بے چینی کی غماز تھی۔ سلینا تو اس کے چہرے پر بھی نظر ڈال چکی تھی جو بے حد اترا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ اطہر فکروں اور اندیشوں کی زد میں ہے۔ آج اطہر نے بے ترتیب سے کپڑے پہنے ہوئے تھے یہ بھی اس بات کی گواہی تھی کہ کل سے آج تک کی پریشانی نے اس کے لباس پر کئی شکنیں ڈال دی ہیں۔ اسے بس دفتر جانا تھا کہ اس کے کندھوں پر اس کے گھر والوں کی ذمّہ داری تھی ورنہ وہ تو شاید انور کے کمرے سے ہی نہ نکلتا۔ باپ کی محبت تو خیر جانی جا سکتی ہے۔ لیکن بھائی کی فکر اور بھائی کی محبت کی یہ ایک ایسی مثال تھی جو کم از کم سلینا کے لیے نئی تھی اور شاید اسی لیے جب بھی وہ اطہر کے سامنے جاتی یا اطہر اس کے پاس آتا وہ تعظیم کے لیے اپنا سارا وجود اس کے سامنے ڈھیر کر دیتی۔ وہ اسے آسمان سے اترا ہوا کوئی دیوتا محسوس ہوتا جس کے پاس دینے کے لیے اس کی جھولی میں بہت سی اَن مول چیزیں ہیں اور لینے والے ہاتھ یک سر غائب ہیں۔ کیسا بے غرض انسان ہے وہ بھی۔ سلینا نے رات کی کیفیت سے اسے آگاہ کیا۔ یہ بھی بتایا کہ اس نے آنکھیں کھولی تھیں مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ کسی میبل کو یاد کر رہا تھا۔ وہ ابھی خود بھی حالات کو زیادہ نہیں سمجھ پائی تھی لیکن جس قدر بھی وہ جان پائی تھی اس کے لیے اب

یہ لازم قرار پا گیا تھا کہ وہ انور کے راز کو اس حد تک راز رکھے جہاں تک انور کی عزت کے داغ دار ہونے کا خدشہ ہو۔ اطہر نے کئی بار اس سے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا وہ ہوش میں آنے کے بعد اور زیادہ تو گمرہی کا شکار نہیں ہوجائے گا؟ سلینا اطہر کو یقین نہیں دلانا چاہتی تھی وہ پہلے خود انور کی راز دار بنا چاہتی تھی۔ اس میں سلینا کی خود غرضی شامل نہیں تھی بلکہ وہ عزت جو اس گھر میں اسے ملی ہے اور مل رہی ہے اسے بھی تو اس کا معاوضہ ان لوگوں کو ادا کرنا ہے۔ اسے ہر حال میں اس گھر کی اس پاکیزگی اور تقدس کے اس ماحول کو برقرار رکھنا ہے جو وہ یہاں رہ کر محسوس کرتی رہی ہے۔ وہ کنواری مریم کی دل و جان سے پجاری تھی اور کنواری مریم تقدس اور پاکیزگی کا سمبل ہی تو ہے۔ اس نے اطہر کو اس حد تک اطمینان دلا دیا تھا کہ وہ آرام سے دفتر چلا جائے اور اپنے دن بھر کے معمولات کو بہتر طور پر ادا کرے اور یہ کہ وہ ہر دم انور کے ساتھ ہے فکر نہ کرے۔

اطہر نے جذبات کی بے انتہا شدت کو روکتے ہوئے اپنا کانپتا ہاتھ سلینا کے سر پر رکھ دیا تھا جو اس کے اعتماد کا اظہار تھا۔ رہے الفاظ تو وہ بے معنی تھے۔ اور ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہی الفاظ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

شاکرہ اور نجمہ نے گھر کی ساری ذمہ داریاں اپنے سر لی ہوئی تھیں۔

صبح ہوتے ہی گھر کی صفائی چیزوں کا اپنی جگہ رکھنا گھر کو دن بھر کی بے قاعدگیوں کے بعد قاعدے میں لانا اور پھر کچن کا کام سنبھالنا۔ جو مشکل بھی ہوتا ہے اور کم از کم سلینا کے مطابق تھکا دینے والا بور کام بھی ہوتا ہے۔ روزانہ یہ سوچنا کہ آج کیا پکایا جائے اپنی جگہ خود سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ مگر وہ اتنے دنوں میں دیکھتی آئی تھی کہ یہ دونوں بڑی خوش اسلوبی سے اس اہم فریضے کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ دونوں کے درمیان کام کی ایسی ہم آہنگی ہے کہ ذرا بھی تکرار سنائی نہیں دیتی بلکہ اکثر دھوئیں سے بھرے اس کچن سے دونوں کے قہقہے باہر نکل کر گھر کے تمام در و دیوار سے ٹکراتے ہوئے آتے جاتے کان میں پڑتے۔ وہ کن باتوں پر چہک رہی ہوتی ہیں، وہ یہ تو نہیں جان پائی تھی کیوں کہ وہ ہر دم انور کے پیچھے بھاگتی پھرتی تھی۔ کہیں انور گر نہ پڑے۔ کہیں اکیلے دور نہ نکل جائے۔ کسی چیز سے اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچالے۔ اب نہالے، اب کھالے، اب سوجائے۔ سلینا انور کی

دوست، اس کی تنہائی کی ساتھی بن جانے کے ساتھ ساتھ اپنے دل میں اس کے لیے ماتا کے کسی جذبے کو بیدار کر چکی تھی۔ اسے اپنا بھی کوئی کام اب یاد نہیں رہتا تھا وہ تو جب انور سو جاتا تب نہانے جاتی۔ کپڑے تبدیل کرتی یا کپڑے استری کر کے رکھ لیتی۔

اس وقت بھی نجمہ اور شاکرہ کچن میں تھیں آج کے گھر کے معمول میں فرق آ گیا تھا۔ انور کی وجہ سے ناشتے کی میز پر کوئی بھی جمع نہیں ہوا۔ نجمہ نے شاید اطہر کو اکیلے ہی ناشتہ کرا کے دفتر بھیج دیا تھا اور شاکرہ دو مرتبہ سلینا کے کمرے میں آئی تھی کہ وہ بھی ناشتہ کرے لیکن ہر بار سلینا اسے انور کے کمرے میں ملی اور اس نے گردن ہلا کر ناشتے کے لیے منع کر دیا۔ اور شاکرہ چپ چاپ واپس چلی گئی۔

سلینا اس وقت بھی انور کے سرہانے بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہ پاکستانی لڑکیاں صبح سے شام تک گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر کچن میں اپنی زندگی کے بہترین دن گزار دیتی ہیں۔ صبح سویرے ناشتہ تیار کرنا اس سے فراغت پاتے ہی دوپہر کے کھانے کی فکر پھر کچھ ہی دیر آرام کے ملتے ہیں کہ شام کی چائے اور پھر رات کے کھانے کا انتظام سنبھال لیتی ہیں۔ ان کی زندگی میں گھر اور کنبہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

یہ رشتوں پر بھرپور یقین رکھتی ہیں اور خوش اسلوبی سے ہر رشتہ نبھاتی ہیں۔

نجمہ اور شاکرہ اچھے خاصے کھاتے پیتے گھر کی لڑکیاں ہیں چاہیں تو باورچی خانے میں جھانکیں بھی نہیں۔ بیٹھے بیٹھے نوکروں سے کام کرا لیں لیکن ان کے ملازموں کو تو آرام کا وقت مل بھی جاتا ہے مگر یہ خود بے آرام رہ کر بھی خوش رہتی ہیں۔

اسے انور کے حوالے سے یہ ماحول نزدیک سے دیکھنے کو ملا۔ اسے ایسے میں اکثر اپنی ماں کا خیال آ جاتا جو اسے اس کے باپ کے حوالے سے یہ ساری انہونی اور دیومالائی کہانیاں سناتی رہتی تھی۔ ماں کو ہمیشہ اپنے آپ پر ترس آیا کہ وہ ایک ایسے شخص سے وابستہ ہو کر بھی ایسا ماحول اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں پائی اور محروم ہی رہ گئی۔ سلینا سوچتی اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تب ضرور وہ اس کے گھر جاتی ان تمام رشتوں کو دیکھتی اور محظوظ ہوتی۔ وہ اپنے بارے میں اکثر خود سے سوال کرتی کہ وہ آخر ہے کون وہ خود اپنے آپ کو پہچان نہیں پائی۔ اپنے باپ کے دیس میں ہوتے ہوئے بھی اس کے

معاشرے سے مختلف زندگی گزار رہی ہے۔ وہ دو تہذیبوں کے بیچ پس کر رہ گئی ہے۔
ماں کی طرف دیکھے تو ایک دنیا، باپ کی طرف دیکھے تو دوسری دنیا۔ باپ کی تہذیب اپناؤں تو ماں سے دقیانوسی کا خطاب پاؤں۔ ماں کے اصولوں پر چلوں تو باپ کا معاشرہ تسلیم کرنے سے انکار کردے۔ اف یہ میرے باپ اور ماں کی غلطیاں۔ وہ سوچتی میں کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب مغربی لڑکی اور مشرقی لڑکے مل کر شادی کرتے ہیں تو اپنی اولاد کے مستقبل کا ذرا سا بھی خیال نہیں کرتے۔ وہ سوچتے ہی نہیں کہ ان کی اولاد دو تہذیبوں میں پس کر کیسے جی پائے گی؟ آخر وہ دونوں ہی اپنی آیندہ نسلوں کے بارے میں اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں؟
وہ آج ہی جذباتی نہیں ہو رہی تھی بلکہ وہ اکثر ہی ایسے ایسے سوال کر کے اپنے آپ کو پریشان کرتی رہتی تھی اور آج تک وہ اس بات کا تعین کر ہی نہیں پائی تھی کہ وہ خود کون ہے وہ کہاں اور کس تہذیب سے متعلق ہے؟
میرا نام سلینا ہے۔ وہ یہ جانتی تھی مگر وہ اپنے آپ سے کہتی لیکن میں تو سلمیٰ کا دل رکھتی ہوں۔ میں سلینا ہوں یا سلمیٰ، میں کون ہوں؟ اس بات کا اسے کون جواب دے گا اور کب دے گا۔ میری بدنصیبی کی بھی کوئی حد ہے؟
اسی سوچ کے بیچ انور نے کروٹ بدلی اور سلینا سنبھل گئی۔ اس نے آپ ہی آپ زیرِ لب کہا میں کوئی بھی نہیں میں بس ایک نرس ہوں اور میرا مذہب خدمت ہے۔ نہ میں سلینا ہوں نہ ہی سلمیٰ۔ وہ جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیتی تھی اس بار بھی اس نے سارے جذبات گردن کی ایک جنبش سے جھٹک دیے۔
انور نے بے چینی سے دوسری بار کروٹ لی۔
سلینا نے اپنے مذہب کے مطابق اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے سینے پر صلیب بنائی۔
''انور'' اس کے اس تخاطب میں دنیا جہان کا پیار تھا۔
''ہاں'' انور نے اُسی جذبے سے اس پیار بھرے لہجے کا جواب دیا۔ اس نے اس بار پلکیں بھی جھپکیں اور یک بارگی آنکھیں کھول دیں۔ وہ سیلنا کو حیرت سے دیکھ رہا تھا جو اپنا ہاتھ

اب بھی انور کی پیشانی پر رکھ کر اس پہ جھکی ہوئی تھی۔
سلینا نے جھٹ اپنا ہاتھ پیشانی سے ہٹایا اور سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے چہرے کے تاثر کو بھی بدلنے کی کوشش کی۔ وہ جان گئی کہ انور اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ تب ہی اس کے دل میں کانچ کا کوئی نکیلا سا ٹکڑا دھنس کر ٹوٹ گیا۔

''تو انور اب مجھے بھول گیا''

میں، میں سلینا ہوں وہ آپ ہی آپ بولی۔ مگر اپنی یہ پہچان بتا کر سلینا اپنے وجود کو ٹوٹ پھوٹ سے نہ بچا سکی۔

اچھا۔ انور نے یوں کہا جیسے بس وہ یہی سننا چاہ رہا تھا۔ اور پھر اس نے اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

انور تم پہچان کی منزل میں داخل ہو رہے ہو لیکن مجھے بھول گئے ہو۔ یہ یاد بھی نہیں اب تمہیں کہ میں تمہارے ساتھ تمہاری پھُونس کی بنی لیبارٹری میں کتنے ہی عرصے صابن کے غبارے اڑانے میں تمہارے مدد کرتی تھی۔ تمہاری زندگی کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ تمہارا سیّارہ چاند پر پہنچ جائے اور تم یہ جان گئے تھے کہ میری مدد کے بغیر تمہارا سیارہ اڑتے ہی فضا میں پھٹ جایا کرتا تھا کہ تم تو سرکنڈے کی اس نلکی کو جس میں صابن بھرا ہوتا تھا زور سے پھونک بھی نہیں مار پاتے تھے۔ اور اکثر غبارا جسے تم سیارہ کہتے تھے تمہارے کوٹ یا پینٹ سے ٹکرا کر وہیں ڈھیر ہو جاتا اور تمہاری دوربین سامنے رکھی رہ جاتی اور تم اس کی اڑان بھی نہیں دیکھ پاتے تھے۔

تمہیں تو انور نہ وہ جنگلی پھول یاد ہوں گے جنہیں تم اپنے بلیزر کی جیب میں بھر کر میرے لیے لایا کرتے تھے۔ تم صرف مجھے خوش کرنے کے لیے نہا بھی لیتے تھے۔ کنگھی بھی کرا لیتے تھے۔ ناشتہ بھی کر لیتے تھے اور پیٹ بھر کر کھانا بھی کھا لیتے تھے کہ تمہیں ڈر تھا کہ کہیں میں ناراض نہ ہو جاؤں اور تمہیں چھوڑ کر چلی نہ جاؤں۔

تم وہ تکلیف دہ انجکشن آنکھیں بند کر کے اور دانت پیس کر چپ چاپ لگوا لیتے تھے کہ جس کے عوض رات میں تمہارے کمرے میں آ کر تمہیں کہانی سناتی تھی اور اس وقت تک تمہارے پاس رہتی تھی جب تک تمہیں نیند نہیں آ جاتی۔ اور صبح تمہارے اٹھنے سے پہلے میں

تمہارے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی کہ جب تم آنکھیں کھولو تو تمہیں مایوسی نہ ہو اور میں تمہیں یہ یقین دلا سکوں کہ میں تو گئی ہی نہیں تھی۔

انور میں نے یہ سب کچھ کیوں کیا تھا؟ یہ میرے ان فرائض سے بہت زیادہ تھا جس کے عوض میں یہاں سے معاوضہ پاتی تھی۔ جذبوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی انور اور شاید یہ بات تم مجھ سے بھی بہتر جانتے ہو کہ تم میرے باپ کے دیس والے ہو۔

سلینا یہ سب کچھ سوچ رہی تھی ادھر انور نے بظاہر اپنی آنکھیں تو دوبارہ بند کر لی تھیں لیکن اس کا ذہن پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ وہ دیکھے اَن دیکھے شخص کی پہچان رکھتا تھا۔ جب ہی تو یہ سوال اس کے سامنے تھا۔ یہ لڑکی کون ہے؟

یہ لڑکی میبل ہرگز نہیں ہے؟ میبل ہی وہ آخری لڑکی تھی جو ذہنی گمرہی سے کچھ لمحے پہلے اسے ملی تھی اور ایک انتہائی بے وفا اور ظالم لڑکی کے روپ میں۔

یہ شاکرہ بھی نہیں اور نجمہ بھی نہیں کہ اس کے خدوخال ان دونوں سے مختلف ہیں۔

آخر یہ کون ہے۔ کون ہے جو اس سے اس وقت اتنی قریب ہے؟ یہ سوچ یہ کھوج اس کے تازہ تازہ بیدار ہوئے ذہن پر بوجھ تھی۔

سلینا نہیں جانتی تھی کہ انور اس وقت کیا سوچ رہا ہے؟ سوچ رہا ہے یا بالکل خالی ہے۔ پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ انور آنکھیں کھولے۔ اسے پہچانے یا نہ پہچانے اپنی پہچان اس سے ضرور کرا دے۔

اس نے آواز دی۔ انور۔ اٹھو ہاتھ منہ دھولو۔ پھر میں ناشتہ لاؤں۔

انور نے یہ مہربان آواز سنی اور جواب بھی دیا۔ بالکل ایک سعادت مند بچے کی طرح اس نے اچھا کہا اور ساتھ ہی آنکھیں بھی کھول دیں۔

اور پھر سلینا بالکل نرس بن گئی۔ اس نے انور کے سر کے نیچے کئی تکیے لگا کر اسے تقریباً بٹھا دیا اور خود اس کے ہاتھ منہ دھلانے لگی۔

انور۔ اس نے پیار سے اسے مخاطب کیا۔ میں تمہاری نرس ہوں۔ یہاں کئی مہینے سے تمہارے ساتھ ہوں۔ تم بیمار تھے اور اب اچھے ہو رہے ہو۔ وہ اسے اپنی باتوں میں مصروف رکھنا چاہتی تھی۔

انور چپ چاپ تھا وہ کسی سیدھے سادھے بچے کی طرح ہاتھ منہ دھلاتا رہا اور اس کی بات سُنتا رہا۔

سلینا چپ ہوگئی تو اس پھر اسی اپنے پرانے لہجے میں اچھا کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔

اس بار سلینا نے تشویش ناک انداز سے انور پر بھرپور نظر ڈالی اور اس نے محسوس کیا کہ وہ بے حد کمزور ہوگیا ہے اور یہ کہ وہ بہت کچھ سوچتا بھی رہتا ہے۔ کیا کچھ وہ یہ تو نہیں جانتی تھی لیکن یہ ضرور جان رہی تھی کہ اس کی سوچ اس کے لیے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔

چائے پی لو انور۔ سلینا نے اسی لمحے اس کے لیے چائے منگائی تھی۔ چائے کی پیالی انور کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے اسے شانے سے ہلایا۔

میں اٹھتا ہوں۔ اس نے پھر آپ ہی آپ اٹھنے کی بھی کوشش کی۔

نہیں۔ تم یونہی لیٹے لیٹے پی لو۔ سلینا نے ہٹائے ہوئے تکیے اس کی پیٹھ کے نیچے دبا دیے۔

پیالی انور کے ہاتھ میں تھما کر سلینا نے ایک توس پر مکھن لگا کر انور کی طرف بڑھا دیا۔

پہلے یہ توس کھالو۔ سلینا نے کہا۔

میں صرف انڈا نہ کھالوں؟ اس نے فرائی کیے ہوئے انڈے کی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

اور سلینا کو یوں محسوس ہوا کہ انور کی آواز کہیں بہت دور سے آرہی ہے۔

کیوں؟ تمہیں توس مکھن پسند نہیں۔ سلینا نے انڈے کی پلیٹ اسے پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

پسند کی کیا بات ہے۔ پسند سے کیا ہوتا ہے؟

اور پھر سلینا نے دیکھا انور کے ہاتھ کانپ گئے۔ اس نے جلدی سے پیالی اور پلیٹ اس کے ہاتھوں سے لے لی۔ اور انور کو سہارا دے کر لٹا دیا۔ اس پر غنودگی کا پھر غلبہ ہو چکا تھا۔

اسی اثناء میں نجمہ اور شاکرہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پر فکریں ہی فکریں پھیلی ہوئی تھیں۔

سلینا نے اشارے سے انہیں سمجھایا کہ وہ کمزور ہے اور بہ مشکل صرف چائے پی سکا ہے۔ اسے ابھی سونے ہی دیا جائے۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ناشتے کی ٹرے لے کر کمرے سے نکل گئیں اور جاتے جاتے سلینا کو تاکید کرتی گئیں کہ وہ آکر میز پر رکھا ناشتہ کرلے۔

دونوں کے جانے کے بعد سلینا اس کے چہرے پر جھک گئی۔
اُف انور تم ایک ہی دن میں کس قدر کمزور ہو گئے ہو۔ یہ میری ہی غلطی ہے کہ تمہیں تھکا دیا۔ مجھے تم سے اتنی باتیں بھی نہیں کرنی چاہئیں تھیں۔ وہ انور کی کمزوری پر دکھ محسوس کرنے لگی۔
انور سو رہا تھا اور وہ انور کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی وہ جانتی تھی پُرانا انور جو اس کا مریض تھا اسے ایسا کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ پھر وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں پا سکی۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ انور میں کیا کروں۔ تم دکھی ہو میں یہ جانتی ہوں۔ مگر میں تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتی۔ کیوں نہیں دیکھ سکتی یہ میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتی میں تمہیں یہ سب کچھ کیسے بتا دوں؟
اسی لمحے نجمہ کمرے میں داخل ہوئی اس نے سلینا کو روتا دیکھا، جب کہ سلینا برابر اپنی آنکھوں کو رگڑ رگڑ کر آنسو چھپانے کی کوشش میں تھی۔
سلینا۔ تم ابھی تک یہیں ہو۔ چلو ناشتہ ٹھنڈا ہو گیا اور تم نے اب تک چائے بھی نہیں پی ہے۔ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کر رہی ہو؟ شاید تم پر اب بھی یہ جنون سوار ہے کہ اس حادثے میں تمہارا ہاتھ ہے۔ نہیں سلینا اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ ہم تمہیں قصور وار سمجھ رہے ہیں تو یقین کرو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ بس یہ ایک حادثہ ہے۔ یہ حادثہ پہلی بار تو ہوا نہیں ہے۔ پہلے بھی تو انور کے ساتھ ایسا ہی کچھ ہوا تھا کیا اس حادثے کی بھی تم ہی ذمہ دار ہو۔ تم بڑی بے وقوف لڑکی ہو سلینا اور اتنی ہی جذباتی بھی۔ جانے کس نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ تم نرس بن جاؤ۔ اس نے پیار سے سلینا کے سر پر تھپکی دی۔
نجمہ کے ہمدردانہ جملے سن کر سلینا پھر جی بھر کے روئی۔ وہ آنسو جنہیں وہ اب تک پی جانے کی کوشش میں آنکھوں سے گرنے نہیں دے رہی تھی ایک دم سے ہی چھما چھم برس پڑے۔ وہ نجمہ کے کندھے پر سر رکھے ہوئے تھی۔ یہ سہارا اسے بڑا سکون بھی دے رہا تھا۔ بڑی دیر بعد نجمہ نے اسے آہستگی سے اپنے آپ سے جدا کیا اور اس کے کمرے تک لائی باتھ روم میں ہلکا سا دھکا دے کر خود باورچی خانے کی طرف بڑھی۔ میں تمہارے لیے تازہ چائے بناتی ہوں جلدی سے آ جانا۔

سلینا دیر تک اپنے چہرے پر پانی ڈالتی رہی۔ ٹھنڈے پانی نے اسے کسی قدر سکون بخشا وہ ناشتے کی میز پر اکیلی ہی تھی۔ نجمہ نے اسے چائے کی پیالی پکڑا دی تھی۔

آج وہ پہلی بار اس گھر میں اپنے آپ کو پریشان محسوس کر رہی تھی۔

انور ابھی تک آنکھیں بند کیے پڑا تھا وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اور دیر تک سکون کی خاطر ڈیوڈ کے پُرانے خطوط پڑھتی رہی۔ لیکن آج تو اسے ان خطوط میں بھی اپنے دل کی بے چینی کی دوانہیں ملی۔

۱۴

.....اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس پر پھر سے غنودگی طاری ہو رہی ہے۔ اس کا اپنا دل بھی بھاری ہو رہا تھا...

چلتے پھرتے تاج محل! تم صحت یاب ہو جاؤ۔

اُس نے جُھک کر اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے...

تازہ خوشنما پھولوں کوگل دان میں سجا کر جب وہ انور کی طرف پلٹی تو انور کو اپنی ہی جانب دیکھتا پا کر وہ جھینپ گئی۔

''لو یہ دوا پی لو۔'' اس نے جلدی جلدی دوا تیار کر کے انور کی طرف بڑھا دی۔

تب انور مسکرا پڑا۔

آپ کی گھڑی کبھی غلط وقت نہیں دیتی سسٹر کراس؟ انور نے دوا تھامتے ہوئے کہا۔

نہیں۔ وہ اب اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

بیٹھ جایئے نا۔ آپ کھڑی کیوں ہیں؟ انور نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ سلینا بیٹھ گئی سرہانے رکھے پھولوں سے کھیلتے ہوئے اس نے دوا پینے کی تاکید کی جسے وہ اب تک اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا۔

اور انور نے جلدی سے دوا پی کر پیالی میز پر رکھ دی۔ سلینا نے اسے آہستہ سے لٹا دیا اور خود چپ چاپ بیٹھ گئی۔

کچھ باتیں کیجیے سسٹر کراس۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔

وہ خود بھی گھبرا گئی۔ کہیں انور کی طبیعت تو خراب نہیں۔ ابھی تو وہ بشاش نظر آ رہا تھا۔

''انور'' اب تم صحت یاب ہوتے جا رہے ہو کچھ دن بعد چلنا پھرنا شروع کردو گے۔ تمہارے بھائی بہت خوش ہوں گے۔ اس نے اسے بہلانے کے لیے کہا۔

انور تمہارے یہاں سب لوگ بہت اچھے ہیں نجمہ بھی شاکرہ بھی۔ تم کیوں اداس ہوتے ہو، آخر تمہارے یہاں کے لوگ اس قدر بے غرض ہو کر کیوں جیتے ہیں انور؟

اس نے بے خیالی میں الٹا انور ہی سے سوال کر دیا۔

ہم لوگ بے وقوف جو ہوتے ہیں سسٹر کراس۔ انور نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

اس بار سلینا نے محسوس کیا کہ جیسے انور کوسوں میل دور سے بول رہا ہے۔ اس پر جذباتیت کا پھر سے دورہ پڑ چکا ہے۔

سلینا نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔

تم نے تو فلسفہ پڑھا ہے مگر کیا تمہیں تاریخ سے دلچسپی ہے؟

اسے یاد آیا پہلا انور تو پڑھنا لکھنا جانتا ہی نہیں تھا۔ اسے وہ کاغذ بھی یاد آیا جس پر اس نے آڑی ترچھی لکیروں کے ذریعے تمام گھر والوں کے نام لکھے تھے۔

ہاں تاریخی عمارتوں کی حد تک۔ انور نے جواب دیا۔

اچھا۔ سلینا خوش ہوگئی۔ انور اب نارمل ہوتا جا رہا تھا۔

تب پھر تم نے تو بہت ساری عمارتیں بھی دیکھی ہوں گی۔

ہاں میں نے بہت ساری عمارتیں دیکھی ہیں۔ انور نے کہا۔

تمہیں سب سے زیادہ کس عمارت نے متاثر کیا؟ سلینا کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

آپ نے کبھی تاج محل دیکھا ہے سسٹر؟ انور نے سلینا ہی سے سوال کر دیا۔

اور سلینا کے دل پر پھر سے چوٹ پڑی۔ انور اپنی محبت کو بھول کیوں نہیں پا رہا ہے۔ اس نے اب تک کتنی بھاری قیمت ادا کی ہے اپنی محبت کی۔ اس نے سوچا جب تک کہ انور میبل کی محبت کو اپنے دل سے کھرچ نہیں پائے گا پوری طرح صحت یاب ہونا اس کے لیے مشکل ہے۔ اس کے ذہن میں محبت کا تاج محل اب بھی زندہ ہے وہ زندگی کی دوسری صداقتوں سے کیوں کر مقابلہ کر پائے گا۔

کیا سوچ رہی ہیں سسٹر آپ؟ انور نے سوچتا پا کر سوال کیا۔

کچھ بھی نہیں۔ میں نے تاج محل دیکھا تو نہیں ہے لیکن دیکھنے کا ارمان ضرور ہے۔
ہر مشرقی کو دیکھ لیں سسٹر وہ چلتا پھرتا تاج محل ہوتا ہے۔ اور انور نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں آنکھیں بند کر کے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔
شاید انور اس وقت بند آنکھوں سے وہی دیکھنے والی چیز دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر سلینا کو جانے کیوں یہ محسوس ہوا کہ جیسے انور پر پھر سے غنودگی طاری ہو رہی ہے۔
اس کا اپنا دل بھی بھاری ہو رہا تھا۔ آج کل بات بات پر اس کا دل پریشان ہو جاتا، وہ بے چین ہو جاتی۔ اپنے آپ کو بہلا ہی نہیں پاتی۔ اس نے سوچا سوتے ہوئے یا مدہوش انور کی پیشانی پر ہونٹ رکھنے سے شاید اس کا اداس اور پریشان دل سکون پا جائے۔ اس نے جھک کر اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔
چلتے پھرتے تاج محل تم صحت یاب ہو جاؤ۔
جانے انور سو رہا تھا یا یونہی آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ مگر سلینا کرسی سے ٹیک لگا کر کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئی۔

پھر اس نے سُنا بند آنکھیں اور ہلتے ہونٹ کہہ رہے تھے۔

یہ سترھویں صدی کی ابتدا تھی جب ایک مینا بازار میں جہانگیر کی نظر مرزا غیاث بیگ کی بیٹی مہرالنساء پر پڑی جو شادی شدہ تھی مگر جہانگیر دل ہار بیٹھا۔ اور اس نے پھر بھی اسے حاصل کرلیا وہ ہندوستان کی عظیم ملکہ نور جہاں کہلائی۔
وہیں ایک دوسرے دل کی داستان اور بھی رقم ہوئی۔ جہانگیر کے انتقال کے بعد شہزادہ خرم جو شاہ جہاں کہلایا اس نے ارجمند بانو پر اپنا دل ہار دیا اور اسے حاصل کر کے ممتاز محل کا نام دیا۔ بیس سال کی طویل رفاقت کے بعد ممتاز محل کا انتقال ہوگیا۔ اپنی ملکہ کی موت پر شاہ جہاں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ کتابوں میں ہے کہ شاہ جہاں نے ایک سال تک گوشۂ تنہائی میں اپنی ملکہ کا سوگ منایا۔ جب وہ دوبارہ نمودار ہوا تو اس کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے تھے اور کمر جھک گئی تھی۔
غم و اندوہ اور سوگ سے جب اسے کسی حد تک نجات ملی تب اس نے ایک خواب دیکھا۔
ایک مقبرے کا خواب جہاں وہ اپنی ممتاز محل کو دفن کر کے امر کر سکے۔

اپنے خواب کے مطابق اس نے خود ہی مقبرے کا ایک نقشہ بنایا اور چار باغ پر مشتمل اس مقبرے کے اطراف بڑا ہال۔ نہریں، فوارے انتظار گاہ اور مسجد بھی بنائی گئی۔

دنیا جہان کے ہیرے جواہرات اعلیٰ اقسام کے پتھر سے مزّین یہ عمارت تاج محل کہلائی۔ محبت کی یہ علامت آج سات عجائباتِ عالم کے علاوہ یونیسکو ورلڈ ہیری ٹیج سائٹس میں شامل ہے۔ تاج محل کے ڈیزائن، لے آؤٹ اور تعمیر میں جیومیٹری اور ریاضی کے اصولوں کو مکمل طور پر مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ تاج محل کے وسیع گنبد کے نیچے ممتاز محل کی قبر ہے اور جب شاہ جہاں کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے اورنگ زیب عالمگیر نے اسے بھی ممتاز محل کے بازو میں دفن کر دیا۔

دو محبت کرنے والے ساتھ ساتھ سو رہے ہیں لیکن مرنے کے بعد ساتھ کا کتنا تصوّر ہے اور کیسا تصوّر ہے اس کا پتا نہیں؟ انور دھیرے دھیرے سب کچھ کہہ گیا مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کس سے کہہ رہا ہے۔ سلینا سن رہی تھی مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اسے یہ کہانی کیوں سنا رہا ہے؟ کہیں وہ نیند میں تو نہیں بول رہا ہے۔ یہ جاننے کے لیے اس نے اسے آواز دی۔

انور تم جاگ رہے ہو؟

ہاں میں جاگ رہا ہوں اور مجھے سوتے میں بولنے کی بیماری نہیں۔ انور نے آنکھیں کھول دیں، شاید یہ یقین دلانے کے لیے کہ وہ واقعی جاگ رہا ہے۔

سسٹر مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں شاعری سے دلچسپی ہے کہ نہیں مگر جہاں تم نے تاج محل کی مختصر کہانی سنی ہے نہ چاہتے ہوئے بھی، وہاں تم شعر بھی سُن لو، میں نے کبھی پڑھا تھا اور مجھے آج تک یاد ہے۔

سلینا کا سر اب بھی کرسی سے ٹکا ہوا تھا۔ لیکن وہ انور کی ایک ایک بات سن بھی رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی۔

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

سلینا کو یہ شعر یاد تھا۔ اور اسے یہ بھی یاد تھا اسپتال میں ایک شخص کی نرسنگ کرتے ہوئے

اس مریض نے اسے یہ شعر سنایا تھا اور سلینا کو فوراً ہی یہ یاد بھی ہو گیا تھا اور اس وقت اس نے یہ شعر سنا کر انور پر اپنا رعب بھی جما دیا تھا۔ مگر انور نے کہا میں تمہیں ایک اور شعر سنا رہا ہوں جو تمہارے شعر کی نفی کر دے گا۔

سناؤ۔ سلینا نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

اک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل
ساری دنیا کو محبت کی نشانی دے دی

پھر نہ جانے کیا ہوا انور نے دوسری طرف کروٹ لی اور خاموش ہو گیا

سلینا چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

۱۴

..... پہلی بار اسے اس کے خط میں کوئی دل کشی محسوس نہیں ہوئی۔اس نے جانا کہ اس کے دل میں تو کوئی انتظار ہے ہی نہیں۔اب وہ غیر محسوس طور پر یہ چاہنے لگی تھی کہ کم از کم وہ اس وقت تک نہ آئے جب تک کہ اس کا شاہ کار مکمل نہ ہو جائے...

اس روز جب ڈیوڈ کا خط آیا تو وہ اسے دیر تک پڑھتی رہی۔ ڈیوڈ نے لکھا تھا کہ وہ اب سنجیدگی سے سوچ رہا ہے کہ اپنے اسٹور کو ٹھکانے لگا کر اس کے پاس آجائے اور سلینا کو اپنا لے۔ اب تمبا کو کے کاروبار اور گوا کے اس شہر میں اس کے لیے کوئی جاذبیت نہیں رہ گئی ہے۔ جہاں اس کا وسیع و عریض کاروبار پھیلا ہوا ہے۔

اس نے پوچھا تھا کہ وہ اپنی موجودہ ملازمت سے کب سبک دوش ہو رہی ہے۔ کسی کے گھر رہنا اب اسے پسند نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب وہ اپنا گھر بنا لے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب گوا کے اس شہر کو چھوڑ کر سلینا تک پہنچ جائے۔

ڈیوڈ کے خط میں مستقبل کے تمام سنہرے خواب سجے ہوئے تھے اور جس کے خواب اس نے بھی دیکھے تھے۔ اسپتال کی غیر رومانی زندگی اسے بہت بور لگنے لگی تھی۔ ایسی زندگی میں یکسانیت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ صبح اور شام ایک انداز سے آتی جاتی اور وہ ایک مشین کی طرح حرکت کرتی رہتی۔ مہینے بعد اسے ایک مقررہ تنخواہ ملتی اگرچہ وہ اس کے لیے کافی ہوتی کہ اس نے زندگی میں کسی آسایش سے دوستی ہی نہیں کی تھی۔ ہاں کبھی کبھی وہ کسی گھر بھیج دی جاتی جسے وہ بہت مشکلوں سے بُھگتاتی۔ اکثر اسے ایسے گھر ملتے جہاں وہ اپنے آپ کو قیدی اور ملازم محسوس کرتی۔ اس کی بے پناہ خدمت اور توجہ اس معاوضے سے بہت

زیادہ ہوتی جسے وہ ایک پیشہ ور نرس کے برخلاف ادا کرتی۔ اسے ملا ہوا بھاری معاوضہ بھی اسے اور ٹھہرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ وہ کام ختم کرتی اور بھاگ کر پھر اسپتال آ جاتی اور اسی مقررہ تنخواہ پر کام کرنے لگ جاتی۔ مگر اب تو اسے بھاگ کر اسپتال جانے کی بھی جلدی نہیں تھی۔

ڈیوڈ کا خط اس نے بار بار پڑھا تھا۔ ایک ایک لفظ پر وہ رک گئی تھی۔ ہر ایک جملے کو اس نے بہت سے معنی دیے تھے۔ اسے اس خط میں ڈیوڈ کی وہ بے چینی بھی ملی تھی کہ جس کی آس پر اس نے اس کی دی ہوئی انگوٹھی کو اپنی انگلی کی زینت بنا رکھا تھا۔ وہ انگوٹھی اس کی طاقت بھی تھی اور جینے کی تمنا بھی، یکسانیت سے بور ہو کر دل کش خواب دیکھنے کی وجہ بھی۔

پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ پہلی بار ڈیوڈ کے خط میں اسے کوئی دل کشی محسوس نہیں ہوئی۔ اس نے جانا کہ اس کے دل میں تو کوئی انتظار ہے ہی نہیں۔ وہ یہاں کی ملازمت سے اب تک اکتائی بھی نہیں۔ اس نے یہاں سے بھاگ جانا بھی نہیں چاہا۔ وہ غیر محسوس طور پر یہ چاہنے لگی تھی کہ ڈیوڈ کم از کم اس وقت تک نہ آئے جب تک انور کُلّی طور پر صحت یاب نہ ہو جائے۔ ڈیوڈ کے خط نے اسے یہ محسوس کرا دیا کہ انور اس کا شاہ کار ہے اور شاہ کار کو ادھورا چھوڑنا اب اس کے بس میں نہیں تھا۔

انور کے لیے اس نے سردی کی طویل راتوں اور گرمی کی چلچلا دینے والی دوپہروں میں لحہ لحہ صحت یابی کی دعا مانگی تھی۔ اور یہ حقیقت تھی کہ سلینا کو اس دوران اپنے لیے کوئی دعا مانگنی یاد ہی نہیں تھی۔ وہ انور کو اپنے سے جدا کوئی اور وجود سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ اور یہی اس کی بے لوث خدمات تھیں جس سے اطہر، نجمہ، شاکرہ سب ہی متاثر تھے۔ وہ سب سلینا کی عزّت بھی کرتے تھے اور اس سے محبت بھی کرتے تھے۔ سلینا الگ سے کوئی نہیں تھی بلکہ اب وہ اس گھر کا فرد تھی اور بہت اہم فرد۔ انور کے گھر والے اتنے محسن کش نہیں تھے کہ پیسے اور خلوص کو ایک ہی ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ کر تولتے۔ وہ دیکھتے تھے، جانتے تھے کہ سلینا دن رات میں کوئی تمیز نہیں رکھتی تھی اور انور کو ایک مریض کے بجائے اپنا کوئی بہترین ساتھی سمجھتی تھی۔ اس کی بھرپور نگرانی کرتی۔ اس کی جی

جان سے خدمت کرتی اور اس کی بے جا فرمائشوں کو بھی خوش دلی سے پورا کر دیتی۔ کبھی اُکتاتی نہیں تھی۔ کبھی تھکن کا بھی اظہار نہیں کرتی۔ اپنی نیند کو بھی قربان کر دیتی۔ وہ اس گھر کے ہر فرد کو اپنا سمجھتی ہر ایک کے درد کو اپنا درد جانتی۔ اس کی بے شمار راتیں جاگتے گزری تھیں اور اس فعل کو بھی اپنے فرض کا ایک حصّہ جانا ہوا تھا۔

ابھی انور تندرست نہیں ہوا تھا اور ڈاکٹر کی ہدایت بھی تھی کہ انور کو مکمل آرام کرنا چاہیے۔ اس کے ذہن پر کسی قسم کا کوئی بوجھ نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ بہت زیادہ سوچے نہیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ بولے نہیں۔ وہ تھکے نہیں۔ اور کوئی بھی بداحتیاطی نہ کرے۔ ہر ایک اس کا کچھ یوں ہی خیال کر رہا تھا کہ وہ پھر سے تاریکی کے مہیب غار میں نہ چلا جائے۔ سلینا تو اپنی ذمہ داریوں سے خود ہی آگاہ تھی۔ اور وہ اس کی رکھوالی کسی ننھے منے بچے کی طرح کر رہی تھی۔ پہلے وہ بچہ ضدی تھا اور اس کی اوٹ پٹانگ خواہشیں تھیں۔ سلینا انہیں بھی پورا کرتی تھی۔ اب وہ ایک بے حد حساس بچہ تھا۔ جو کہتا کچھ نہیں تھا لیکن جسے توجہ کی بے پناہ ضرورت تھی۔ سلینا یہ سب کچھ اپنی ملازمت کی شرائط سے بالاتر ہو کر کر رہی تھی۔ جس کا احساس گھر کے ہر فرد کو بھی تھا۔ یہ گھر وہ گھر نہیں تھا جہاں سے سلینا بھاگ کر اسپتال جانے کی تمنا کرنے لگے۔ بلکہ یہ گھر تو وہ گھر تھا جہاں سے جانا سلینا کے لیے دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔

شاید اسی لیے ڈیوڈ کے خط میں اسے وہ دل کشی محسوس نہیں ہوئی جو اس کے دل کو چھو لے بلکہ یہ کہنا سچ ہوگا کہ ڈیوڈ کا خط ایک ڈراؤنا خواب تھا، جسے حقیقت سے دوچار ہونے پر آنکھوں میں نمی آ جائے۔ دل اچھل کر حلق میں آ جائے اور طبیعت میں اداسی پھیل جائے۔

اسے خط کا جواب تو دینا ہی تھا۔ اس نے قلم کاغذ سنبھالا۔ پہلے اپنی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کو دوسرے ہاتھوں کی انگلیوں سے جلدی جلدی گھمایا۔ پھر اس نے جذبات کو کمرے کے کسی کونے میں احتیاط سے رکھ دیا اور اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔ پھر ایک ایسا خط تحریر کیا جو اس کے پیشے کے تمام لوازمات اور ضروریات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ اسے خود بھی محسوس ہوا کہ یہ محبت نامہ نہیں۔ کسی محبت نامے کا جواب بھی نہیں بلکہ ڈاکٹر کا نسخہ ہے تمام تر ہدایات لیے ہوئے ہے۔

۱۵

.....میں جانتی ہوں اپنا دُکھ ایک ایسا بوجھ ہوتا ہے جسے
دوسرے بانٹ نہیں سکتے... لیکن پھر بھی تم مجھے آزماؤ تو...
شاید میں تمہارا دکھ کچھ کم کرسکوں...

پانی... سسٹر پانی۔
انور سوتے سوتے اچانک بول پڑا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ سلینا اونگھتے اونگھتے چونک پڑی۔
کیا بات ہے انور۔ کیا ہوا۔ وہ انور پر جھک گئی۔
پانی.. انور اسی قدر کہہ سکا۔ اور اس کی آنکھیں پھر سے بند ہونے لگیں۔
سلینا نے انور کے سر کو ذرا سا اٹھا کر گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ وہ سارا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر گیا۔
اور۔ انور کے ہونٹ اب بھی خشک تھے۔
سلینا نے دوسرا گلاس بھی اس کے ہونٹوں سے لگا دیا اور پھر یوں انور تین گلاس پانی پی گیا۔
سلینا گھبرا گئی۔ اس نے انور کے سر کو تکیہ پر رکھ دیا اور خود اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔
تمہیں کیا ہو رہا ہے انور۔ کچھ کہو۔ کچھ بتاؤ۔ کہو کہ کہنے سے دکھ ہلکا ہوتا ہے۔ پھر وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھی۔ میں جانتی ہوں کہ اپنا دکھ ایک ایسا بوجھ ہوتا ہے جسے دوسرے

بانٹ نہیں سکتے۔ لیکن تم مجھے آزماؤ تو انور۔ شاید میں تمہارے دکھ کچھ کم کرسکوں۔ میں تمہیں ہلکا پھلکا دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں تم ہر غم سے آزاد ہوجاؤ۔ تمہارے ذہن میں کوئی خلش نہ رہے... وہ بولتی جارہی تھی۔

انور کا چہرہ زرد ہورہا تھا اور سلینا اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اس کے بس میں نہیں تھا کہ وہ انور کے چہرے کی زردی کو اپنی آنکھوں سے پی جائے اور اس کے معصوم سے اداس چہرے پر دنیا جہان کی شگفتگی بکھیر دے۔ مگر اس نے دکھ سے سوچا۔

میرے بس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر میرا بس چلے تو میں اس معصوم انسان سے اس کا سارا تلخ ماضی نوچ کر پھینک دوں۔ اور اسے ایک خوش باش سا انور بنادوں جو اس گھر کا سب سے لاڈلا فرد ہے۔

''میبل'' انور نے کراہ کر کروٹ بدل لی۔ اس کی آواز میں کوسوں میل دور کی تھکن تھی۔

جیسے وہ بھاگا بھاگا چلا آرہا ہو۔

سلینا کی آنکھیں ایک دم سے اُمنڈ آئیں۔

کیا ہے انور، کچھ کہو تو۔

لیکن انور پھر بھی چپ تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئی اور اس کے بالوں کو برابر کرتی رہی وہ اسے ایک چھوٹا سا معصوم سا بچہ لگ رہا تھا۔ سلینا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کس طرح سکون دے۔ وہ اپنے آپ کو بے حد بے بس پارہی تھی۔ اس کی آنکھیں شدتِ جذبات سے چھلک رہی تھیں۔ اس کے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے اور اس کی پیشانی کو تر کررہے تھے۔ وہ بالکل ہی بے سدھ تھی۔

انور نے اس کی جانب کروٹ بدل لی اور اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کی انگلیاں سلینا کے آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ تب وہ چونکا اور آنکھیں کھول دیں۔

اس نے دیکھا سلینا آنکھیں بند کیے آدھی جھکی اسی کے تکیے سے ٹکی بیٹھی تھی اور اسے کچھ بھی ہوش نہیں تھا۔

سسٹر تم رو رہی ہو۔ تمہیں کیا ہوا؟ انور نے سلینا کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹا کر ہاتھ میں لے لیا۔ کیا ہوا سسٹر؟

سلینا چونک گئی۔ اتنی سی دیر میں وہ درد کی پگڈنڈی پر چلتی ہوئی کہیں دور پہنچ چکی تھی۔ اس کا ہاتھ انور کے ہاتھ میں تھا۔

یہ کیا ہو گیا۔ یہ کیسے جذبات تھے۔ میں کیا کیا کچھ سوچ گئی۔ میں کہاں جا پہنچی تھی۔ اس نے آپ ہی آپ سوال کیا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا آہستگی سے اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

کچھ نہیں انور۔ میرا جی بھر آیا تھا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ میرے آنسو تمہاری پیشانی پر گر رہے ہیں۔ آئی ایم سوری انور۔ اس نے جلدی جلدی اپنی آنکھیں رگڑیں۔

تمہیں پانی تو نہیں چاہیے؟ وہ ماحول بدلنا چاہتی تھی۔ اپنی خفت بھی مٹانا چاہتی تھی۔

انور نے سنی اَن سنی کر دی اور بولا۔

تمہیں کون یاد آیا سسٹر؟ انور اب سلینا کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ جانتا تھا سلینا شاید اپنے فعل پر شرمندہ ہے۔ وہ اسے کسی شرمندگی سے دوچار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔

انور کا سوال سادہ نہیں تھا۔ وہ اس کے کسی کمزور لمحے سے آگاہ ہو چکا تھا۔ سلینا کی مصنوعی مضبوطی کام آئی۔

مجھے تم سے شکایت ہے انور۔ تم اپنے دل کی بات مجھ سے چھپاتے ہو جب کہ میں تو تمہاری دوست ہوں۔

ایسا تو نہیں ہے سسٹر۔ میں جو بھی کہنا چاہتا ہوں بے دھڑک تم سے کہہ دیتا ہوں۔ واقعی تم تو میری دوست ہو جب ہی تو ہر وقت میرے پاس رہتی ہو۔ میری دیکھ بھال کرتی ہو۔

نہیں انور۔ میں نہیں مانتی۔ تم اس وقت سچ نہیں بول رہے ہو۔ ہم اگر دوست ہیں تب ہمارے درمیان کوئی جھوٹ نہیں ہونا چاہیے۔ سلینا کے لہجے میں اپنائیت بھی تھی اور شکوہ بھی۔

انور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سچ نہیں بول رہا ہے۔ اس شخص سے جو اس کا بے حد خیال رکھتی ہے۔ اور ہر خوشی دینے پر ہر دم آمادہ رہتی ہے۔

اس نے دکھ سے سوچا مگر میں بھی کیا کروں ذہن پر ایک پرچھائیں آتی ہے ایک جاتی

ہے۔اور مجھے واضح طور پر کچھ بھی یاد نہیں آتا۔ میری ہر سوچ تھوڑی تھوڑی دیر میں کٹ جاتی ہے۔اس کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ میں اس کا سرا تھام ہی نہیں پاتا کہ مجھ پر غنودگی اپنا قبضہ جمالیتی ہے۔

میں تمہیں کیا بتاؤں سسٹر مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ میں تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔

انور کا چہرہ پھیکا پڑنے لگا تھا۔سلینا گھبرا گئی۔

تمہیں کچھ یاد نہیں انور؟

سلینا نے تشویشناک انداز سے انور کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔

تو ابھی تمہارے ذہن کے دریچے پوری طرح کھلے ہی نہیں۔ اسے انور کے زرد، پھیکے اور پژمردہ چہرے کو دیکھ کر اپنے جسم میں کچھ ٹوٹتا محسوس ہوا۔

انور کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

۱۶

..... تمہارے ایک شاعر نے کہا ہے...
''تمہارے خوش گوار ترین لمحے وہ ہیں جن میں ہمارے انتہائی غمگین جذبات شامل ہیں''...

کئی دن گزر گئے۔ تمام گھر والے امید اور ناامیدی کے بیچ اپنے آپ کو لٹکا محسوس کرتے رہے۔ انور ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں۔ کبھی کبھی وہ سب کو پہچان جاتا اور کبھی وہ ہر ایک کو اجنبی نظروں سے دیکھنے لگتا۔ وہ کسی سے بھی بات نہیں کرتا۔ ڈاکٹر کے سامنے تو وہ بالکل ہی نہیں بولتا۔ اس کے ہزار سوال کے جواب میں اس کی ایک چپ برقرار رہتی وہ تھک کر آنکھیں بند کر لیتا کہ اسے کسی بھی سوال کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مگر ہر ایک اور بالخصوص ڈاکٹر چاہتا تھا کہ انور کچھ بھی بولے۔ کوئی بھی جواب دے۔ وہ کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ مگر انور کی خاموشی ان کے ذہنوں کو اور بھی اُلجھا دیتی۔

وہ بارہا سلینا سے بھی سوال کر چکا تھا۔ کیا انور اس سے کوئی بات کرتا ہے؟ کچھ ماضی یا حال کی بات کرتا ہے یا نہیں؟ سلینا کیا جواب دیتی۔ وہ یہ تو جانتی ہی تھی کہ انور یادداشت کی ایک آدھ منزل طے کر چکا ہے۔ مگر پوری طرح وہ بھی اپنا ماضی یاد نہیں کر پایا ہے۔ یا اگر وہ یاد بھی کر چکا ہے تو اسے چھپا رہا ہے۔ اس کے پاس ماضی کا کوئی سنگین واقعہ کوئی ڈراؤنی داستان یا جان لینے والی کہانی اسے ڈرا دیتی ہے۔ اسے اپنے چُنگل میں دبوچے ہوئے ہے۔ میبل ایک تلخ یاد کا نام ہے۔ وہ اس حد تک تو جان ہی چکی تھی مگر وہ اس یاد کو

دوسروں تک پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے پاس انور کا ایک یہی راز تھا جس کی وہ امین تھی اور کسی صورت اس میں خیانت کی مرتکب نہیں ہونا چاہتی تھی۔

وہ اپنے آپ کو خوش کیے رہتی کہ وہ انور کی دوست ہے۔ یہ درجہ اس نے اپنے آپ کو خود ہی دے دیا تھا اور انور نے بھی اسے تسلیم کرلیا تھا۔

ایک دوپہر جب اطہر آفس جا چکا تھا۔ نجمہ اور شاکرہ کمرے کے بے شمار چکر لگانے کے بعد کچن میں مصروف تھیں وہ انور کے کمرے میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔

انور جاگ رہا تھا اور اس کا ذہن اور دنوں کے مقابلے میں زیادہ ہلکا پھلکا ہو رہا تھا جسے سلینا اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے محسوس کرلیا کرتی۔ اس نے انور سے سوال کردیا۔

کیا سوچ رہے ہو انور؟

انور نے فوراً ہی جواب دے دیا۔ سسٹر میں سوچ رہا ہوں۔ اس دنیا سے باہر، ماضی اور حال سے باہر، اپنے وجود سے باہر، میں کہیں بھی نہیں ہوں۔ حالاں کہ میں موجود ہوں۔

انور نے بڑی بے چارگی سے یہ جملے ادا کیے۔

سلینا دم بخود رہ گئی۔ یہ معصوم سا فلسفی، کیسی سوچ ہے اس کی؟ اس نے محسوس کیا کہ جیسے انور نے آج اپنی سوچوں کو بے نقاب کردیا ہے۔ اسے زبان مل گئی ہے۔ وہ کچھ کہنے کے قابل ہوا ہے۔ وہ سوچ سکتا ہے۔ وہ محسوس کرسکتا ہے وہ بول سکتا ہے۔ سلینا بہت خوش ہوئی۔

ہاں اس دنیا سے باہر ماضی اور حال سے باہر۔ اپنے وجود سے باہر میں بھی کہیں نہیں ہوں حالاں کہ میں موجود ہوں۔ میں اپنے آپ کو چھو کر محسوس کرسکتی ہوں۔ میں اپنے آپ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی ہوں۔ پھر بھی میں کہیں نہیں ہوں۔ میرا کوئی بھی تو نہیں ہے۔ میں سلینا کراس ہوں۔ میں نے اپنی ذات کا ایک سفر طے کیا ہے۔ لیکن پھر بھی کسی سے بھی پوچھو۔ بھلا میں کون ہوں اور کہاں ہوں!

وہ شاید اس وقت بالکل اسی راستے پر کھڑی تھی۔ جہاں ایسی ہی کسی سنسان سڑک پر کھڑے کھڑے انور نے اپنے بارے میں کچھ کہا ہے۔

سلینا کو سوچوں میں گم پا کر اب کے انور نے اس سے سوال کردیا۔

کیا سوچ رہی ہو سسٹر؟

سلینا یک بارگی اپنی سوچوں سے باہر آ گئی۔

انور میں اپنی سوچ کو اتنے خوب صورت الفاظ نہیں دے سکتی جیسے کہ تم نے دیے ہیں۔

میں تو بس ایک معمولی سی نرس ہوں۔

سسٹر ہم اپنے خیالات کو خود الفاظ کے پیرہن نہیں پہناتے بلکہ وہ تو اپنے پیرہن خود منتخب کرلیا کرتے ہیں۔

یہ بھی ٹھیک کہتے ہو انور۔لیکن۔کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ بعض خیالات ،بعض سوچیں ذہن اور دل کے حصار سے نکلنا ہی نہیں چاہتیں۔سلینا یہ سب کچھ سوچ کر ہی رہ گئی اور اس نے موضوع ہی بدل دیا۔

انور تم لیٹے لیٹے اکتا تو نہیں گئے ہو۔اگر تمہیں باہر گھومنے کا دل چاہے تو مجھے بتاؤ۔

ہم کل سے صبح کی سیر کے لیے جا سکتے ہیں۔

سلینا نے جیسے انور کو بہلانے کی کوشش کی۔

انور یہ بات جان رہا تھا۔

پہلے ڈاکٹر کی اجازت تو لے لو۔انور نے ہنستے ہوئے کہا۔

سلینا بھی ہنس پڑی۔

ڈاکٹر کی لمبی چوڑی ہدایتیں بھی تمہاری بھلائی کے لیے ہی ہوتی ہیں۔

مگر تم ان کی ساری ہدایتوں پر تو عمل کرتی ہی نہیں۔کیا انہوں نے سیر کی اجازت دے رکھی ہے؟

نہیں۔مگر وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں تم گر نہ پڑو۔ابھی تمہارا زخم ٹھیک بھی تو نہیں۔

سلینا نے ڈاکٹر کی وکالت کی۔

چھوڑو جانے دو۔ان کا بس چلے تو وہ تکیے سے سر اٹھانے کو بھی منع کر دیں۔

ہاں ایسا ہی ہے۔سلینا زور زور سے ہنسنے لگی۔انہوں نے یہ بھی منع کیا ہوا ہے۔

انور سلینا کو بغور دیکھ رہا تھا اب تک کے ان چند دنوں میں سلینا کا بالکل ہی نیا روپ تھا۔

ہر دم خاموش۔ذمہ دار اور سنجیدہ سلینا اس وقت بے اختیار ہنس رہی تھی۔

معلوم ہوتا ہے آج آپ صبح کی سیر کر کے آئی ہیں موڈ اچھا ہے۔
تمہیں ابھی دوا دینی ہے ٹھہرو اس نے پوری سنجیدگی سے کہا۔
اور پھر دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔
سسٹر مجھے شام اس کمرے میں گزارنی بالکل پسند نہیں۔ کیا آپ ڈاکٹر صاحب سے نسخے میں شام کی سیر نہیں لکھوا سکتیں۔ انور نے شوخی سے کہا۔
آدھی ڈاکٹر تو میں بھی ہوں۔ آدھا نسخہ تو میں بھی لکھ سکتی ہوں۔ سلینا نے کہا۔
تو لکھ دیجیے نا۔ انور نے کہا۔
چلو بھئی آج شام ہم باہر جائیں گے۔ ٹھیک۔ سلینا نے انور سے وعدہ کر لیا۔
اور جیسے ہی شام کے سائے گہرے ہونے لگے سلینا انور کو لے کر حویلی سے باہر آ گئی۔
دور دور تک ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ اونچے اونچے پہاڑ جنہیں دیکھنے کے لیے سر پیچھے کی طرف جھک جاتا ہے اور آنکھیں ان کی بلندی ناپنے لگتی ہیں۔ پہاڑ پر جُھکا ہوا نیلا آسمان اور دو پہاڑوں کے بیچ سورج کی رُخصتی کا منظر ان سب نے مل کر انور کے ذہن پر خوش گوار اثر ڈالا۔ سلینا نے واضح طور پر محسوس کیا کہ انور کے کمزور زرد چہرے پر سرخی کی ہلکی سی تہہ ابھر رہی ہے۔
یہ سچ ہے بند بوتلوں کے رنگین پانی جنہیں ہم دوا کا نام دیتے ہیں انسانی جسم میں رنگ بکھیرنے سے قاصر رہتے ہیں لیکن مناظر کی رنگینی جب آنکھوں کے راستے جسم میں اترتی ہے تو پورا وجود قوسِ قزح بن جاتا ہے۔ سلینا نے انتہائی شاعرانہ انداز میں سوچا۔
انور کافی عرصے بعد باہر نکلا تھا۔ اپنی ذہنی گمرہی کے دوران وہ ہزار بار یہاں سلینا کے ساتھ آیا تھا لیکن اس کے ذہن پر تاریکی مسلط تھی اس لیے یہ خوش گوار فضا اس پر کچھ کام نہ کر سکی۔ ان ہواؤں فضاؤں کو تو شعوری طور پر اپنے اندر اُتارنا ہوتا ہے۔ سلینا نے بھرپور انداز سے سانس لی جیسے کہ سب کچھ وہ اپنے وجود میں اُتار لینا چاہتی ہے۔ اس نے انور سے بھی ایسا ہی کرنے کے لیے کہا اور انور نے کسی سعادت مند بچے کی طرح آنکھیں بند کر لیں اور ایک ایسی گہری سانس لی کہ جیسے مناظر کی ساری زندگی اور رنگینی وہ اپنے اندر انڈیل لینا چاہتا ہے۔

سلینا کے ذہن پر سوچ کے سائے گہرے تھے۔ ایک ایسی ہی شام تھی جب سب پکنک منا رہے تھے اور انور ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا تھا۔ وہ کیسا بھیانک لمحہ تھا۔

سلینا کے لیے تو اب بھی وہ سوچ انتہائی بھیانک اور دردناک تھی۔ لیکن ہوا کچھ یوں کہ وہی ایک ٹھوکر صبح کی روشنی بن گئی۔ وہ انور کی طرف پیار سے دیکھنے لگی بالکل ایسے جیسے ایک ماں اپنے مدتوں کے بیمار بچے کو صحت یاب ہونے کے بعد دیکھتی ہے۔

میں یہاں روز آیا کرتا تھا سسٹر۔ انور نے چہک کر کہا۔

جن دنوں میں کالج میں پڑھتا تھا اور چھٹیاں گزارنے یہاں آتا تو یہی میری پسندیدہ جگہ ہوتی تھی۔ وہ ایک گوشے میں گھاس پر بیٹھتا ہوا بولا۔

میں یہاں گھنٹوں مطالعہ کرتا۔

تم کیا پڑھا کرتے تھے انور؟ سلینا نے پوچھا۔

میں نے یہاں بیٹھ کر خلیل جبران کو پڑھا ہے۔ میں نے یہاں بہت سارے شاعروں کے دیوان پڑھ ڈالے ہیں۔ انور کی آنکھوں میں ماضی کی چمک تھی۔

تمہیں کون سا شاعر سب سے زیادہ پسند ہے؟ سلینا کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

میں یہ نہیں بتا سکتا سسٹر۔ مختلف اوقات میں مجھے مختلف شاعروں نے متاثر کیا ہے۔ کبھی مناظر کی رنگینی سے جب میں لطف اندوز ہونے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ جوشؔ میرے ساتھ ساتھ ہے۔ جب دنیا کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی تو غالبؔ مجھ پر چھاتا چلا گیا۔ اور اب پوچھو سسٹر اس وقت مجھے کس شاعر کو پڑھنے کا دل چاہ رہا ہے؟

کسے انور؟ سلینا نے پوچھ لیا۔

میں میرؔ کو پڑھنا چاہتا ہوں سسٹر۔ انور کے لہجے میں بے پناہ اُداسیاں سمٹ آئی تھیں اور سلینا کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ میرؔ یاس والم کا شاعر ہوگا۔ بالکل کیٹس اور شیلے کی طرح۔ طالب علمی کے زمانے میں جب اس پر یاسیت کا دورہ پڑتا تو وہ بھی کیٹس اور شیلے سے دل بہلاتی تھی۔

سسٹر تم نے میرؔ کو پڑھا ہے۔ انور نے سوال کیا۔

نہیں انور۔ میں تمہارے ادب سے بالکل ناواقف ہوں۔ میرا ادبی مطالعہ محدود ہے۔
سلینا نے یہ بات اس طرح کہی جیسے اس میں خدانخواستہ کوئی بہت بڑا عیب ہے۔
سلینا اب تک اپنے آپ کو بھاری بھر کم سمجھتی رہی تھی۔ اور انور اس کے لیے ایک ناسمجھ بچہ تھا۔ لیکن اس لمحے اس نے اپنے آپ کو انور کے سامنے ایک کم عقل بچہ محسوس کیا۔
مجھے کچھ شعر سناؤ انور میں میرؔ کو سننا چاہتی ہوں۔ یک بارگی اس نے خواہش ظاہر کی۔ انور نے آنکھیں بند کرلیں اور پھر جیسے یکے بعد دیگرے بغیر کوشش کے اس کے ہونٹوں سے شعر ادا ہوتے گئے۔ اور سلینا نے دیکھا کہ انور کی آنکھوں سے اشک رواں ہیں۔
وہ ایک دم ننھی منی بچی سے سمجھ دار نرس بن گئی۔
انور غمگین لحات میں دکھی اشعار پڑھ کر اگر جینے کا حوصلہ نہ پیدا ہو تو میں ایسے اشعار کو کسی اچھے اور بڑے شاعر کے شعر نہیں مانتی۔
انور نے آنکھیں کھول دیں اور غور سے سلینا کی طرف دیکھنے لگا۔
تم غلط کہتی ہو سسٹر تمہارا ادبی مطالعہ محدود نہیں ہے۔ تم نے میرؔ کو مجھ سے کم نہیں پڑھا ہے۔ میرؔ نے اپنے غم میں اپنی تہذیب کے سارے دکھ کو سمیٹ لیا ہے۔ اور یوں میرؔ کا غم اس کے لیے طاقت بن گیا ہے۔ اور جب تک اس کے پڑھنے والوں میں یہ طاقت پیدا نہ ہو جائے میرؔ کو کامیاب شاعر نہیں کہا جاسکتا۔
اس نے اپنے وجود میں بے پناہ طاقت محسوس کی۔
انور اپنے غم کو پروپیگنڈا بنانے کے بجائے اگر اسے بسیط آفاقی غم بنا دیا جائے تو۔ جینے میں دل کشی پیدا ہوسکتی ہے۔ انور نے سلینا کے جملے کو کاٹ کر مکمل کر دیا۔
تمہارے ہی ایک شاعر نے کہا ہے
''ہمارے خوش گوار ترین نغمے وہ ہیں جن میں ہمارے انتہائی غمگین جذبات شامل ہیں۔''
اور سلینا نے محسوس کیا کہ جیسے انور بدل رہا ہے۔ اس کے خدوخال میں کچھ رنگ بکھر رہے ہیں۔ اور اس وقت سلینا کو اس ماں کی طرح بے اندازہ خوشی نصیب ہوئی جو مدتوں کے بیمار بچے کو پیٹ بھر کھانا کھلا دینے کے بعد ہوتی ہے۔
انور ایک آزاد پرندے کی طرح اِدھر اُدھر پھرتا رہا اور سلینا اس کے آگے پیچھے تھی۔

وہ جب بھی تیز قدم اٹھاتا سلینا سہم جاتی۔ جب بھی راہ میں کوئی رکاوٹ آتی سلینا انور کے آگے آجاتی اور ہاتھ تھام کر اسے آگے بڑھا لے جاتی۔ لیکن انور اس وقت برسوں قید میں رہنے والا وہ پرندہ بن چکا تھا جسے اسیری کے بعد آج ہی رہائی نصیب ہوئی ہو اور وہ اپنے پَر آزما رہا ہو۔ سلینا تھک چکی تھی۔ اور تھکن سے زیادہ خوف اور ذمہ داری کا احساس اس کے وجود کو بوجھل بنانے لگا۔

کہیں ایسا ویسا نہ ہو جائے۔ وہ ڈرنے لگی۔ پچھلا حادثہ اور اس کے نتیجے میں اس کی اپنی کیفیت اسے یاد تھی۔ کتنی ہی راتیں اور کتنے ہی دن اس نے اپنے آپ کو مجرم سمجھا تھا۔ ہر ایک سے معافی مانگی تھی۔ اپنے آپ کو معاف نہیں کرنے پر ڈٹی ہوئی تھی وہ تو شکر ہے کہ اس بُرے اور بڑے حادثے نے ایک خوش گوار موڑ لے لیا ہے۔

انور کو اپنا ماضی کچھ کچھ یاد آنے لگا ہے۔ لیکن ڈاکٹر تو اب بھی یہی کہتے ہیں کہ حتمی طور پر اسے خوش گوار حادثہ نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ طبیعت کی بے چینی کچھ بھی کر دکھا سکتی ہے۔ بہتر بہت بہتر یا پہلے سے بھی بدتر۔ وہ یہ سب سوچ کر اب بھی پریشان ہو جایا کرتی۔

وہ چوبیس گھنٹے اس کی نگراں تھی۔ وہی تو ذمہ دار تھی ہر ایک نتیجے کی۔

بس انور اب واپس چلتے ہیں۔ رات بھی ہو رہی ہے۔ سلینا نے خوشامدانہ لہجے میں اس سے کہا۔

اور آج تو انور چاہتا تھا کہ مدتوں بستر پر لیٹے رہنے کا بدلہ لے لے۔ لیکن سلینا کے حکم سے انکار۔ نہیں اس میں اتنی جرأت تھی ہی نہیں۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ، قدم سے قدم ملاتے حویلی کی جانب چلنے لگے۔ انور چلتا آگے تھا مگر پھر بھی رک کر پیچھے دیکھ لیتا تھا۔ وہ اپنی پسندیدہ جگہ بہت دنوں بعد آیا تھا وہ اس عرصے میں اپنی گم شدہ زندگی کے بہت سے سراغ پا چکا تھا۔

۱۷

.....ایک ہستی دُھندلا رہی تھی... اور ایک اُبھر رہی تھی...
وہ دونوں ہی کے شدید احساس میں گُم ہوگیا تھا۔ یہ بھولنے
اور یاد رکھنے کا لمحہ اس پر بھاری تھا، بہت بھاری...

شام کی سیر نے انور کے ذہن پر تو خوش گوار اثر ڈالا لیکن اس کے کمزور اور لاغر جسم نے اس کا اُلٹا اثر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کئی دن انور نے اپنے جسم میں درد محسوس کیا۔ جس کا ذکر اس نے سلینا سے تو نہیں کیا لیکن سلینا تو ایک نرس تھی اور اپنے مریض کو بہت بہتر طور پر پہچانتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سیر کچھ زیادہ ہی طویل ہوگئی تھی جس کا بار انور ابھی قبول کرنے کے لائق نہیں تھا۔ انور کی تکان اتارنے کے لیے سلینا اس کے پاس ہوتی۔ ہنسی مذاق کی باتیں کرتی۔ تن دہی سے دوا پلاتی۔ ٹمپریچر لیتی۔ چارٹ تیار کرتی۔ ڈاکٹر سے اس کے بارے میں تبادلہ خیال بھی کرتی۔

اطہر، نجمہ اور شاکرہ اب سب ہی انور کی طرف سے خاصی حد تک بے فکر تھے۔ انور نے اپنے ماضی کو کس قدر یاد کر لیا ہے یہ سب جان گئے تھے۔ لیکن وہ کون سے حالات تھے جس نے انور کو اتنے عرصے تاریکی میں رکھا سب ہی اس سے بے خبر تھے۔ غنودگی کے عالم میں بارہا انور نے مبیل کو پکارا تھا اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ ایسے میں اطہر، نجمہ اور شاکرہ بھی انور کے کمرے میں موجود تھے لیکن ایک تو انور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا تھا دوسرے سلینا نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کی ذہنی بے راہ روی کا راز جانے۔ وہ

جانتی تھی کہ انور ایک شریف اور حساس گھرانے کا فرد ہے۔ خود بھی حساس ہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد اگر اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی ذہنی بے ربطی کی وجہ ان لوگوں کو معلوم ہے تب اس کا جینا مشکل ہو جائے گا۔

وہ اپنے ہی بڑے بھائی سے آنکھیں چار نہیں کر پائے گا اور یوں زندگی کا حوصلہ کھو دے گا۔ وہ شاکرہ اور نجمہ سے بھی شرم سار ہوگا۔ اور یہی سب کچھ سوچ کر سلینا ایسے موقعے پر خود زور زور سے بولنے لگتی تا کہ انور کی آواز دب جائے اور میبل کا نام ابھرنے نہ پائے۔ وہ اب تک اپنی اس کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ انور سلینا کا ایک سحر زدہ معمول تھا۔ سلینا جس طرح چاہتی اسے استعمال کرتی تھی۔ اس کی موجودگی میں انور اپنی کڑوی کسیلی سوچ سے نجات پا جاتا اور اس کے جاتے ہی اس کی ذہنی سطح پھر سے ڈگمگانے لگتی اور دوسروں کے لیے اس کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ ہر ایک ایسے میں سلینا کا محتاج رہتا۔

ایک ایسے ہی دن جب سلینا تھک کر اپنے کمرے میں جا چکی تھی انور کا ذہن سوچتے سوچتے بھٹک گیا۔ سلینا کی غیر موجودگی میں شاکرہ اس کے پاس تھی۔ انور کا ذہن لندن کی رنگینیوں میں کھویا ہوا تھا۔ اور اسے میبل کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے بے تحاشا اور پوری شدت کے ساتھ یاد آنے لگے۔ اس کے کمزور ذہن نے ان تلخ یادوں کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ اسے دور دور تک پھیلی ہوئی ہریالی میں سلینا کا وجود اپنے وجود سے قریب تر محسوس ہوا۔ میبل دھندلا گئی۔ سلینا اس کے قریب آ گئی۔ میبل مر گئی۔ انور کو کچھ ایسا ہی محسوس ہوا یا شاید وہ خود کسی کُند آلے سے اسے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کا وجود اسے گوارا نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ خود ہی اس کی تصویر کو پھاڑ ڈالے۔ یوں ریزہ ریزہ کر دے کہ اس کے خدوخال یک سر مٹ جائیں اس نے بھی تو اس کی اچھوتی شخصیت کو داغ دار کر دیا تھا۔ اس کے وجود میں چنگاری بھر دی تھی۔ اس کے اندر گرم گرم لاوا انڈیل دیا تھا۔ اس نے بھی تو اس کے چہرے کے نقوش بگاڑ ڈالے تھے۔ اس نے اسے دھوکا دیا تھا۔ ہنسی ہنسی میں اسے جہنم میں دھکیل دیا تھا۔ اس کا آدرش اس کی معصومیت اور اس کے اچھوتے پن کو مذاق مذاق میں رسوا کر دیا تھا۔ وہ میبل کے ہر نقش کو اپنی یادوں سے کھرچنے میں محو تھا۔ اور پھر اسے محسوس ہوا کہ واقعی میبل مر گئی۔ بلکہ اس نے خود میبل کا قتل کر دیا ہے۔ انور کا سانس

پھول گیا جیسے وہ میلوں کی مسافت طے کر کے ابھی ابھی یہاں تک پہنچا ہو۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ آنسوؤں کا نہ بہنے والا ریلا باہر نکل آیا۔ وہ ہانپ رہا تھا، وہ کانپ رہا تھا۔ اس کے سارے بدن میں تھر تھری تھی اس کا بستر ہل رہا تھا۔ سامنے کی ادھر اُدھر کی ہر چیز ہل رہی تھی۔ اسے ہی نہیں اس کے پاس کھڑی ہوئی شاکرہ کو بھی محسوس ہو رہا تھا کہ انور کے ساتھ ساتھ اس کا پورا کمرا گھوم رہا ہے۔ چکر کھا رہا ہے۔ وہ اپنا وجود بھی سنبھالنا چاہتی تھی ورنہ گر جاتی۔ گرتی پڑتی وہ اطہر کے کمرے کی طرف بھاگی اور آن کی آن میں سب ہی انور کے گرد جمع تھے۔ انور کی آنکھوں میں بے چینی تھی اور اس کے لبوں پر سمجھ میں نہ آنے والی کوئی کہانی تھی۔ ہر ایک اپنی اپنی سعی کر رہا تھا لیکن انور کی کیفیت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ میبل اور سلینا۔ میبل دھندلا رہی تھی اور سلینا ابھر رہی تھی۔ وہ میبل کی پرچھائیوں کے کرب اور سلینا کے قرب دونوں ہی کے شدید احساس میں گُم ہو گیا تھا۔ بھولنے اور یاد رکھنے کا یہ لمحہ اس پر بھاری تھا۔

اطہر جانتا تھا اس کا علاج صرف سلینا ہے۔ وہ آئے گی وہ اس کے قریب بیٹھے گی۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھے گی۔ اس پر جھک کر پیار سے اسے پکارے گی اور انور پُر سکون ہو جائے گا۔ بارہا اطہر نے ایسے موقعے پر ایسا ہی دیکھا تھا۔ سلینا یقیناً ایک عام نرس نہیں تھی وہ صرف پیسہ لے کر کام نہیں کرتی تھی۔ اس کے دل میں اپنے مریض کے لیے محبت بھی تھی وہ مسیحائی کرتی تھی۔ وہ جادوگر بھی تھی لیکن اطہر اتنا خودغرض ہرگز نہیں تھا کہ انور کے لیے وہ دن بھر کی تھکی ہاری سلینا کو جا کر اٹھا دے خود جس کی طبیعت آج دن بھر سے خراب تھی۔ اور جو ابھی کچھ دیر پہلے اپنے کمرے میں گئی تھی۔ وہ تو بتانا بھی نہیں چاہتی تھی کہ اسے بخار ہے اور یہ بھی کہ اس کے جسم میں درد بھی ہے لیکن اب وہ اپنے آپ کو جب سنبھال ہی نہیں پائی تب شاکرہ کو اس کے پاس بٹھا کر دوا لینے اپنے کمرے میں گئی اور سو گئی۔

شاکرہ اور نجمہ جانتی تھیں کہ اگر سلینا کو انور کی اس کیفیت کی خبر بعد میں ملے گی تب اسے شکایت ہوگی۔ اور یہی کچھ سوچ کر نجمہ، سلینا کے کمرے کی جانب بھاگی۔

سلینا دوسری دستک پر ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔

میرے معبود۔ انور ٹھیک ہو۔ اس نے صدقِ دل سے دعا مانگی۔ پھر لمحے بھر میں دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ اس نے کچھ نہ پوچھا نجمہ نے کچھ نہ کہا اور سلینا نے انور کے سرہانے بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں۔

انور تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ کچھ بولو۔ کچھ باتیں کرو۔ دیکھو ہم سب پریشان ہو رہے ہیں۔ لیکن انور اس وقت سخت ذہنی کش مکش میں گرفتار تھا۔ سلینا کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ انور کی بند آنکھوں کے سامنے گزرے ہوئے بے شمار دن ہوں گے۔ وہ سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی بے وفا لڑکی ہوگی جس کا نام یقیناً میبل ہے۔ گزرے دن ابھی بھی اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ان گزرے دنوں کے تمام دکھ وہ اپنے اندر آج بھی اترتے ہوئے محسوس کر رہا ہے۔ وہ عجب دوراہے پر کھڑا ہے۔ حال اور ماضی جب دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں تب یہی کیفیت ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر حاوی ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور انسان اس کش مکش میں ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ انور ان ہی تمام کیفیات سے دوچار ہے۔ ہم میں سے کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ میں بہت کچھ جان کر بھی کچھ نہیں کر سکتی کہ شاید ابھی بات ادھوری ہے اور دوسرے تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ وہ نہیں جان پائے ہیں کہ انور کا ماضی کسی سنہرے بالوں والی لڑکی میں الجھ کر اسے بار بار ستا رہا ہے۔ وہ بالکل بے بس ہے۔ نہ جان چھڑا پا رہا ہے نہ ان دنوں سے آنکھیں چار کر پا رہا ہے۔ بے چارہ انور۔ سلینا نے بہت دکھ سے سوچا۔ کاش میں اسے کچھ بھی سکھ دے پاتی ایسے ہی جیسے میں پھونس کی کٹیا میں اس کے ساتھ گھنٹوں بے معنی حرکات میں اس کا ساتھ دے کر اسے خوشی دے دیا کرتی تھی۔ کتنا آسان تھا وہ وقت۔ انور کس قدر جلدی بہل جایا کرتا۔ میری ہر بات مان لیتا۔ خوشی خوشی سو جاتا۔ کھانا کھا لیتا حتیٰ کہ نہا بھی لیا کرتا جس کے لئے وہ لمبی چوڑی بحث بھی کرتا تھا۔ میں اسے قائل کر لیتی تھی کہ ایک دن اس کا سیّارہ چاند تک پہنچ جائے گا۔ وہ یقین کر لیتا تھا اور دوسرے دن وہ پھر سے محنت کرتا۔ وہی دن اچھے تھے۔ سلینا نے پھر دکھ سے سوچا۔

اطہر، نجمہ، شاکرہ کمرے میں پریشان کھڑے تھے۔ انہیں انور کی حالت تشویش ناک محسوس ہو رہی تھی۔ تب اطہر نے سلینا سے کہا۔

ہمیں انور کو اسپتال لے جانا چاہیے۔
سلینا نے حتمی طور پر جواب دے دیا۔ انور کو صرف آرام کی ضرورت ہے کسی دوا کی نہیں۔
سلینا جو کچھ جانتی تھی وہ اطہر کب جانتا تھا۔
اطہر، سلینا کی بات مانتا تھا۔
جو تم بہتر سمجھو سلینا۔ مگر اس کے لیے تمہاری محنت اور بڑھ جائے گی۔ اطہر کی نظریں نیچی تھیں جیسے وہ سلینا سے شرمندہ ہو۔
نہیں ایسا کچھ بھی نہیں۔ میں محنت اور خدمت سے نہیں گھبراتی۔ یہ تو میرا فرض ہے۔ آپ فکر نہ کریں میں یہاں ہوں آپ سب جائیں، آرام کریں۔
مگر رات زیادہ ہوگئی ہے اور تم کچی نیند سے اٹھ کر آئی ہو۔ اب کے شاکرہ نے کہا۔
میں بیٹھ جاتی ہوں نجمہ نے اپنے آپ کو پیش کیا۔
سلینا کی آنکھیں بھر آئیں۔ ان سب کو میرا کتنا خیال ہے۔ حالاں کہ وہ بھی یہ جانتی ہیں کہ دن ہو یا رات فرائض میں تو یہ میرے داخل ہے۔ سلینا نے تشکر بھری نظروں سے ان سب کو دیکھا۔
یقین کریں آپ لوگ، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔
اور جب یہ تینوں کمرے سے نکل گئے تب سلینا انور کے قریب آ گئی۔
انور آنکھیں کھولو۔ دیکھو میں ہوں۔ سلینا۔
سلینا ہو تم۔ انور سسک پڑا۔
ہاں انور میں ہوں۔ میں سلینا ہی ہوں۔ اس نے انور کے چہرے پر دکھوں کے سائے مچلتے دیکھے۔ خود اس کا رنگ بھی سانولا گیا۔
دیکھو میں کب سے آواز دے رہی ہوں انور۔ تم میری بات کا جواب بھی نہیں دیتے کتنی رات گزر چکی ہے میں اکیلی جاگ رہی ہوں۔ تم میرا ساتھ نہیں دو گے۔ سلینا چاہتی تھی انور اپنا دکھ اس سے بانٹے شاید اس سے اس کا جی بہل جائے۔
سلینا۔ مجھے معلوم ہے رات ہوگئی ہے لیکن کیا تم مجھ سے وعدہ کر سکتی ہو کہ تم کچھ دیر میرے پاس بیٹھو گی۔ انور کے لہجے میں منّت تھی۔

ہاں کیوں نہیں انور میں وعدہ کرتی ہوں ساری رات یہیں بیٹھی رہوں گی۔ بس تم ٹھیک ہو جاؤ۔ سلینا نے جلدی سے وعدہ کرلیا۔

انور نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے ہی سلینا بیٹھی تھی جس کے چھوٹے چھوٹے سنہری بال کاندھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں کچی نیند ٹوٹ جانے کا خمار تھا۔ انور سلینا کو اس روپ میں ٹک دیکھے جارہا تھا۔ سنہرے بکھرے بال۔ سیاہ مخمور آنکھیں سفید نائٹ گاؤن۔

تم مشرقی ہو سلینا یا مغربی۔ انور زیرِ لب آپ ہی آپ بولا۔

سلینا اپنے حُلیے اور لباس کو ناموزوں محسوس کرتے ہی خفت محسوس کرنے لگی۔

وہ جب بھی اپنے کمرے سے نکلتی لباس کے آدابِ کو ملحوظ رکھتی۔ وہ جانتی تھی کہ انور کے گھر کا ماحول کیسا ہے۔ لیکن آج وہ جلدی میں پریشانی میں سوتے سوتے نکل آئی تھی۔ ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا کہ اس کا لباس شب خوابی کا ہے۔ اسے حیا آئی اطہر، نجمہ اور شاکرہ نے کیا سوچا ہوگا؟ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں وہ اب تمام گھر والوں سے ان کی غیر موجودگی میں شرمارہی تھی۔ اور اس وقت تو انور بھی اپنی پوری کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ان آنکھوں میں پوری سمجھ اور سمجھ کی ساری روشنی موجود تھی وہ چاہ رہی تھی کہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی جائے۔

انور کی ذہنی سطح پورے طور پر معمول پر آگئی تھی۔ وہ پلکیں جھپکے بغیر اس کے حُسن کو دیکھ رہا تھا جو بے داغ تھا۔ اور اس کے بے حد قریب بھی تھا۔ مگر جلد ہی اس نے اپنی نظریں جھکالیں۔ اس کے اندر سے بہت شریف انور ابھر کر سامنے آچکا تھا۔ وہ عورتوں کو عزت دینے کا قائل تھا اور یہ کہ اس نے اپنے گھر کے تمام رشتوں سے آداب سیکھے تھے۔

سلینا پہلی بار بے چینی محسوس کر رہی تھی وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی لیکن وہ اس وعدے کا کیا کرتی جو ابھی ابھی کر چکی تھی۔ آج انور بھی عجب سے جذبات سے گزر رہا تھا۔ اس پر شدید جذباتیت طاری تھی۔ رفتہ رفتہ وہ پرسکون ہو رہا تھا۔ لیکن اس میں بھی اسے وقت لگا۔ اتنے عرصے میں سلینا نے اپنے آپ کو سمیٹا۔

انور میں تھوڑی دیر میں آؤں۔ ذرا میں اپنے کمرے میں جانا چاہتی ہوں۔ اس نے

ڈرتے ڈرتے انور سے اجازت طلب کی۔
انور مسکرا پڑا۔ جاؤ اور جلدی آجانا ورنہ میں چیخ پکار شروع کردوں گا۔
سلینا بھاگ کر کمرے میں گئی۔ یسُوع مسیح کی نظریں بچا کر اس نے وہ دوپٹا اٹھایا جس کا وہ یہاں اہتمام کرتی تھی۔ اچھی طرح اپنے اردگرد لپیٹ کر وہ انور کے کمرے میں آ گئی۔
انور چھت پر نظریں جمائے ہوئے تھا لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کا چہرہ پُرسکون تھا اور وہ دھیرے دھیرے مسکرا بھی رہا تھا۔ مگر یہ بات تو باعثِ تشویش ہے سلینا کے دل نے آپ ہی آپ کہا۔
کوئی بات کرو سلینا۔ اس نے چھت سے نظریں ہٹا کر سلینا پر مرکوز کردیں۔ آج انور سلینا کو اس کے نام سے پکار رہا تھا۔ سلینا کا دل ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔
یہ رات کیسی رات ہے۔ آج طوفان آئے گا۔ بہت بڑا طوفان۔ سلینا کا دل جیسے سرگوشی کر رہا تھا۔
کیا تمہارا دل باتیں کرنے کا نہیں چاہ رہا ہے سلینا؟ انور نے اس کے دلی جذبات جانے بغیر اسے مخاطب کیا۔
سلینا نے اسی لمحے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اور مضبوطی سے دہرایا۔ وہ ایک نرس ہے جو انور کی خدمت کے لیے رکھی گئی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے۔
ہاں انور باتیں کرو۔ میرا بھی جی چاہ رہا ہے کہ ہم کچھ بولیں۔ بات کریں۔ اس کا لہجہ اس کے دل کی ترجمانی ہرگز نہیں کر رہا تھا۔ وہ بہ مشکل یہی کہہ سکی وہ پہلی بار چاہ رہی تھی کہ انور خاموش رہے۔ وہ خود بھی خاموش رہے۔ وقت یونہی گزرتا جائے۔ آج کی رات جس طوفان کا خدشہ ہے وہ ٹل جائے۔ صبح کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ کچھ نہ کچھ ہمت پیدا کر ہی لے گی۔
سلینا، میں تمہارے بارے میں کچھ پوچھ سکتا ہوں۔ اجازت ہے مجھے۔ انور نے کوشش کرکے بات یہاں سے شروع کی۔
سلینا چونک گئی۔ آج انور کو اس بات کا خیال کیوں آیا۔ کیا یہ سوال ضروری ہے جو وہ کرنا چاہتا ہے۔ یا اسے کرنا چاہیے۔ پھر جیسے اداسی اس کے سارے وجود پر چھا گئی کہنے کو تو یہ

کتنا معمولی سا سوال ہے انور لیکن مجھ سے پوچھو اس کا جواب کس قدر مشکل ہے۔
میں تو خود آج تک اس کا صحیح جواب نہیں پا سکی تمہیں کیا جواب دوں؟ اس نے سر جھٹک کر جیسے اپنی الجھن دور پھینک دی۔
اگر میں کہوں کہ میری ذات ٹکڑوں میں تقسیم ہے۔ میں مکمل کبھی نہیں بن پائی۔ میں کوئی ایک نہیں۔ تو تم کیا سمجھ پاؤ گے۔ سلینا کے لہجے میں دکھ سے زیادہ چبھن تھی۔ پھر بھی میں تمہیں بتانے کی کوشش کرتی ہوں۔
میری ماں اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی تھی اور میرا باپ پاکستان کا۔ پاکستان کے کس شہر کا مجھے یہ نہیں معلوم۔ بتاؤ کیا تم میرا یقین کرو گے؟
تو کیا اب تمہارا باپ زندہ نہیں ہے۔ انور کے لہجے میں دکھ تھا۔
نہیں وہ زندہ نہیں ہے۔ وہ میری پیدائش کے چند ماہ بعد ہی مر گیا تھا۔
اور تمہاری ماں۔ انور نے پھر سوال کیا۔
مجھے اس کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ اسکاٹ لینڈ ہی میں ہے۔
اور تم... انور نے نہ جانے یہ سوال کیا تھا یا یونہی اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔
میں تو تمہارے سامنے ہی ہوں۔ سلینا تلخی سے مسکرائی۔
سلینا کراس میرا نام ہے۔ میں تمہاری نرس ہوں۔ اس سے پہلے بھی کئی مریضوں کی نرس تھی اور تمہارے ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی... یہ کہتے کہتے سلینا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو جاری ہو گئے۔
وہ روتی رہی انور چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ شاید وہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے رونے سے روک دے۔ وہ تو حیران تھا۔ سنہرے کٹے ہوئے بالوں والی لڑکیوں کی آنکھوں میں تو آنسو ہوتے ہی نہیں۔ وہاں تو بس مذاق بھرا ہوتا ہے۔ نفرت ہوتی ہے یا شوخی... جو کسی کو بھی گھائل کرنے کے کام آتی ہے۔ یہ لڑکی جو سلینا ہے جس نے ابھی ابھی یہ بتایا ہے کہ وہ اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی ہے اور جس نے ساری تربیت اپنی ماں سے حاصل کی ہے۔ جس نے اپنے باپ کا شہر بھی نہیں دیکھا وہ کس کنوئیں سے اتنا سارا پانی اپنی آنکھوں میں بھرے بیٹھی ہے۔ اب اسے خیال آیا کہ وہ بہت سا پانی بہا چکی ہے اسے منع کیا جائے کہ

وہ اپنی پلکوں سے آنکھوں کو بند کر دے۔
مجھے معاف کر دو سلینا۔ شاید میں نے تمہیں کہیں نہ کہیں ٹھیس پہنچائی ہے۔
لیکن اب تو سلینا کی آنکھوں کا بند کھل چکا تھا وہ انور کے کہنے پر اپنی پلکوں سے اپنی آنکھوں پر پہرا نہیں بیٹھانا چاہتی تھی۔ آج وہ جی بھر کر رونا چاہتی تھی۔ خوب رونا چاہتی تھی کہ آج تک اسے اتنا معصوم ساتھی ملا ہی نہیں تھا کہ جس کے سامنے وہ اپنا جی ہلکا کر لے۔
پھر ان ہی آنسوؤں کے درمیان سلینا نے اپنی کہانی انور کو سنا ڈالی۔ اپنی ماں کی کہانی۔ اپنے باپ کی کہانی۔ اپنی کہانی۔ اپنے حالات کی کہانی۔ ماں نے اسمتھ سے شادی کے بعد اسے ایک مشن اسکول میں داخل کرادیا۔ اور کچھ عرصے بعد اسے بھول گئی۔ اسے یاد ہی نہ رہا کہ کبھی اس نے ایک بیٹی پیدا کی تھی۔ جس کی آنکھیں جس کے نقش مشرقی تھے۔ جس کے بال اور جس کا نام مغربی۔ سلینا کراس اس کے پاکستانی شوہر کی بیٹی تھی۔ بس بھول جانے کی چیز۔

مدر مارتھا نے اسے زندگی کے نشیب و فراز سکھائے۔ سینئر کیمبرج کے بعد اس نے نرسنگ کے لیے اپنا نام پیش کر دیا یوں ریڈ کراس سے وابستہ ہو کر وہ ملکوں ملکوں گھومتی پھرتی پاکستان آ گئی۔ اپنے باپ کے دیس میں اور کون جانے باپ کے شہر میں بھی۔ یہیں کہیں آس پاس اس کے باپ کا خاندان رہتا ہو جو اگر اسے ملے تو اسے پہچان بھی نہ پائے۔ جن کی آنکھیں آج بھی اپنے بیٹے کے غم میں برستی ہوں گی اور آج بھی وہ ہوائی جہاز اڑتے دیکھ کر آس لگاتے ہوں گے کہ اس میں سے ان کا بیٹا اترے گا۔ وہ جو سات سمندر پار گیا تھا۔ اور لوٹ آنے کا وعدہ کر کے گیا تھا۔ مگر وہ کیا جانیں سات سمندر پار والے انسانوں کو نگل بھی لیتے ہیں۔

انور چپ چاپ اس کے احساسات سنتا رہا اور اس کے غم کو اپنے دل کے کسی کونے میں حفاظت سے سجاتا رہا۔ جب سلینا اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب جانے لگی تب انور نے یک بارگی محسوس کیا

"کہ جیسے دل کے دریچے کھلے ہوا آئی"

۱۸

.....وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ شدید جذبے سے نبرد آزما ہے اور یہ کہ وہ زود حس لڑکی ہے جو اپنے آپ کو بہادر بنا کر پیش کرتی ہے بیشتر اوقات وہ کامیاب رہتی ہے لیکن کبھی کبھی ناکام بھی ہو جاتی ہے...

وہ گلابی جاڑوں کی ایک سرد سی شام تھی۔ سلینا نے انور کے کمرے کے آتش دان میں آگ جلا دی۔ انور ابھی کمزور ہے اور موسم کی تبدیلی کا اثر جلد قبول کر سکتا ہے۔

انور اس کی اس احتیاط پر مسکرا اٹھا۔

مجھے اتنی سردی تو نہیں لگ رہی ہے سلینا کہ تم نے میرے کمرے میں آگ ہی دہکا دی۔

انور نے مذاقاً کہا۔

آگ بجھتے دیر ہی کتنی لگتی ہے انور۔ اور اس نے سامنے میز پر رکھے پانی سے بھرے گلاس کو آگ پر لڑھکا دیا۔

انور شرمندہ ہو گیا۔ مجھے تو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ مذاقاً یہ میں کیا کہہ گیا۔

وہ جھنجھلایا۔

سلینا نے دوا کی پیالی اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اس سے پینے کی تاکید کی۔

انور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

تم برا مان گئیں سلینا۔ میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ جانے کیا سوچ کر میں تم سے یہ سب

کہہ گیا۔ انور شرمندگی سے بولا۔
نہیں کوئی بات نہیں۔ بُرا تو میں مانتی ہی نہیں۔ مجھے اپنی حیثیت کا اچھی طرح علم ہے۔
سلینا کے لہجے میں اُداسی بھی تھی بے گانگی بھی۔
ایسی باتیں نہ کرو سلینا۔ تمہاری حیثیت تو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ پھر وہ رکا۔ میرا مطلب ہے ہم سب تمہارے احسان مند ہیں۔ تم نے اپنے دن رات ہمیں دے رکھے ہیں۔
میں تمہاری دی ہوئی ان کڑوی کسیلی دواؤں کو بھی احترام سے پی جاتا ہوں۔ بُرا سامنہ بھی نہیں بناتا۔ تم ذرا بھی محسوس نہیں کرتیں۔
تمہیں ان دواؤں سے نجات مل جائے گی اور تمہیں احتراماً انہیں پینا بھی نہیں پڑے گا۔ بس جلدی سے اچھے ہو جاؤ۔ سلینا نے آہستگی سے کہا۔
مجھے معلوم ہے تم ناراض ہو اور اظہار بھی کرنا نہیں چاہتیں۔ بس یہی تو خوبی ہے تم میں۔ مگر سلینا اب میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔ انور بچوں کی طرح اٹھلا کر بولا۔
یوں نہیں۔ بستر چھوڑ دو۔ بھاگو دوڑو۔ اپنے کام کرو۔ پڑھنے بیٹھو جیسا کہ تم پہلے کرتے تھے۔ سب کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ اطہر کے ساتھ شکار پر جاؤ۔ جب تک یہ سب کچھ کرنے کے قابل نہیں ہو گے تمہیں ٹھیک کون کہے گا۔ اور پھر دوا تو تمہیں پینی ہی پڑے گی۔
تم میری تیمارداری سے اکتا تو نہیں گئی ہو سلینا۔
انور نے آنکھیں بند کر کے دھیمے سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں اندیشے، دُکھ، پریشانی اور ہمدردی سب ہی کچھ شامل تھا۔
نہیں انور۔ بھلا تم نے یہ کیوں سوچا۔ پھر وہ آپ ہی بولی۔ شاید میری آج کی جھنجھلاہٹ پر میں نے آگ پر پانی جو پھینک دیا۔ میں غلط تھی مجھے اپنے آپ پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔
نہیں شاید اب تم تھک گئی ہو میری تیمارداری کرتے کرتے۔ انور اب بھی اسی رائے پر قائم تھا۔
سلینا تڑپ گئی۔ میں تو عمر بھر تیمارداری کر سکتی ہوں انور۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ مجھ سے تو تمہارے گھر والوں خصوصاً تمہارے بھائی کی بے چارگی نہیں دیکھی جاتی۔ وہ روز

مجھ سے تمہاری پروگریس پوچھتے ہیں اور جس دن سنبھلنے کی بجائے تمہاری طبیعت گر جاتی ہے اس دن تمہارے بھائی کی آنکھوں کے کونے بھیگ جاتے ہیں۔ ان کے چہرے پر سائے سے لہرا جاتے ہیں۔

انور مجھے ان کے دکھ پر دکھ ہوتا ہے۔

ہاں، بھائی جان، مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انور کے لہجے میں اعتماد تھا۔

جانتی ہو سلینا جب میں بہت چھوٹا تھا جب ہماری امّی ابا کا انتقال ہو گیا تھا۔ شاکرہ تو بس دو برس کی تھی۔ اس وقت سے بھائی جان نے ہم دونوں کو ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ نجمہ بھابھی تو بس فرشتہ ہیں۔ اس گھر میں آ کر انہوں نے اپنے گھر کو بھلا دیا۔ ہم دونوں بہن بھائی سے انہوں نے ماں کی طرح محبت کی۔ ان کے اپنے بچے ان سے دور ہوسٹل میں رہتے ہیں اور وہ ہم لوگوں کے ناز اٹھاتی ہیں۔

سلینا نے اطہر کے بچوں کو نہیں دیکھا تھا بس سنا تھا کہ وہ شہر کے ہوسٹل میں رہتے ہیں اور کانونٹ میں پڑھتے ہیں۔

شادی کے بارہ برس بعد بھابھی کی پہلی اولاد ہوئی تھی اور اس تمام عرصے میں انہوں نے مجھے اور شاکرہ کو اپنی اولاد سمجھا۔ انور اپنی بھابھی کی تعریف میں بولے جا رہا تھا اور سلینا سوچ رہی تھی۔

یہ کیسی دنیا ہے۔ یہ کیسے لوگ ہیں یہاں بھائی اور بھابھی دوسروں کی اولاد کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ اور میں کس دنیا کی رہنے والی ہوں، جہاں مائیں اپنی ہی اولاد کو بھول جاتی ہیں۔ آخر سات سمندر کے فاصلوں نے دلوں میں اتنے فاصلے کیوں پیدا کر دیے ہیں۔ اور اگر ایسا ہونا ہی تھا تو میں بھی کسی انور، اطہر کے گھر میں کیوں نہ پیدا ہوئی۔ میں شاکرہ اور نجمہ کیوں نہیں بن سکی۔ اس نے لگا تار سوچا اور دکھ سے سوچا۔

ہاں میرے باپ نے کوشش تو کی تھی کہ میری ماں کے بطن سے جو لڑکی پیدا ہو وہ مشرقی بن جائے۔ اس کے بال بھی کالے ہوں اس کی آنکھیں بھی کالی ہوں۔ اور اس کے دل میں دنیا جہان کی محبت سمٹ آئے۔ لیکن باپ کی عمر نے وفا نہیں کی۔ یا میری ماں کی وفا نے میرے باپ سے وفا نہ کی اور بہت جلد وہ سات سمندر پار

کر کے سات آسمان بھی پار کر گئے۔ اور میں ایک بے مانگی اولاد کی طرح پلتی رہی۔ جس کا نہ کوئی گھر تھا نہ کوئی رشتہ۔ اور آج میں ایک لڑکی نہیں بلکہ ایک نرس ہوں۔ سلینا کراس میرا نام ہے۔ ہائے میری ماں جو مجھے باپ کا نام بھی نہ دے سکی۔ اور مجھے صلیب کی بیٹی بنا دیا۔ سلینا کراس یہ نام مجھے کبھی راس نہ آیا کیوں کہ میرے سینے میں جو دل دھڑک رہا ہے وہ کسی نجمہ، شاکرہ یا سلمیٰ کا ہے۔

سلینا پر بہت دنوں بعد جذباتیت کا دورہ پڑ گیا تھا اور اس نے انور کے سرہانے والی اپنی مخصوص کرسی پر ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

انور بغور اس کے چہرے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ سلینا شدید جذبہ سے نبرد آزما ہے اور یہ کہ وہ زود حس لڑکی ہے جو اپنے آپ کو بہادر بنا کر پیش کرتی ہے۔ بیشتر اوقات وہ کامیاب بھی رہتی ہے لیکن کبھی کبھی ناکام بھی ہو جاتی ہے۔

اسے سلینا کی اس ناکامی میں بڑی دل کشی نظر آئی۔ یہ مغربی نام والی لڑکی بڑی حد تک مشرقی ہے۔ وہ اس کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ جیسے کوئی نور کا ہالہ ہے جو اس کے چہرے کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔

اس وقت سلینا کے خدوخال میں ارتعاش تھا۔ ہل چل سی مچی تھی اور اس کی تمام تر کربناک سوچ اسے پریشان کر رہی تھی لیکن انور سلینا کی اس بگڑی کیفیت سے یک سر پریشان نہیں تھا۔ وہ تو اس وقت کھلی آنکھوں سے بے شمار خواب دیکھ رہا تھا۔

***

۱۹

.....اس کی نظریں اس کے تلووں سے لے کر پیشانی تک اس طرح طواف کرتی رہیں جیسے وہ صبح کی دیوی ہو اور اسے درشن دے کر ابھی ابھی فضا میں تحلیل ہو جانے والی ہو...

ابھی پوری طرح اُجالا بھی نہیں ہوا تھا کہ انور کی آنکھ کھل گئی۔ وہ آج آرام سے سوتا رہا تھا جس کے نتیجے میں وہ بشاش تھا۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور ہلکا ہلکا اُجالا کمرے میں پھیل رہا تھا۔ بے اختیار انور کا دل چاہا کہ وہ سورج طلوع ہونے کا منظر دیکھے۔

ایک عرصہ ہوگیا وہ صبح کی سیر سے محروم تھا۔ اس نے اپنے بدن میں طاقت محسوس کی یا پھر یہ کہ اپنے ارادے کو پورا کرنے کے لیے خود ہی یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ اس قابل ہے کہ کمرے سے نکل کر پائیں باغ کی طرف اکیلا بغیر کسی سہارے کے جاسکے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے اٹھنے کی ہمت کی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے تک آیا اور پھر باغ میں پہنچ گیا۔

اندھیرا چھٹ رہا تھا اسے لمبے لمبے درخت آسمان سے سرگوشیاں کرتے محسوس ہوئے۔ رنگ برنگے پھول سرشاری سے ڈالیوں پر جھوم رہے تھے۔ گھاس پر شبنم کی ننھی منی بوندیں ایسی لگ رہی تھیں کہ جیسے ہرے قالین پر سفید براق موتی ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں انڈیل دیے گئے ہوں۔ وہ ان پر احتیاط سے پاؤں رکھ رہا تھا کہ وہ ان آب دار موتیوں کو

مرنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ دور سورج نکلنے کے گلابی آثار آسمان پر نمودار ہو چکے تھے۔ وہ مسحور ہو گیا۔ ہلکی ہلکی سرسراتی ہوئی ٹھنڈی ہوا سے اس نے جھرجھری لی اور شال اپنے گرد لپیٹ کر وہ اور آگے بڑھا کہ جیسے پھولوں والے پودوں کی دور تر پھیلی دیوار اسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کر رہی ہو۔ وہ دھیرے دھیرے شبنم پر پاؤں رکھتا ہر ایک پھول سے باتیں کرتا۔ ہر ڈالی کی سرسراہٹ کو دل میں چلتے پھرتے محسوس کرتا ہوا لان کے کنارے والی پتھریلی بینچ تک پہنچنے لگا تھا۔ ابھی وہ کچھ دور ہی تھا کہ اسے کسی کا ہیولا نظر آیا۔ اور وہ سوچنے لگا اس وقت اتنی صبح مجھ سے پہلے یہاں کون ہوسکتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پہچان گیا اور وہ تو ہزاروں لاکھوں میں اسے پہچان سکتا تھا۔ بند آنکھوں سے اسے دیکھ سکتا تھا اس کی خوشبو سے اس کا نام اور پتا بتا سکتا تھا۔ ہاں یہ سلینا ہی تو تھی۔ وہ بینچ پر بیٹھی تھی اور جدھر سے انور اس تک پہنچا تھا ادھر اس کی پیٹھ تھی۔ وہ چلتا ہی رہا وہ قدم روک ہی نہیں سکتا تھا اور وہ اس تک پہنچ گیا۔ سلینا آنکھیں بند کیے بے خبری کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اس نے چپل اتار دی تھی اور شبنم سے بھیگی گھاس پر ہلکے ہلکے اپنے تلوے سہلا رہی تھی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ انور نے سلینا کو بے خبری کے عالم میں نظر بھر کر دیکھا۔ اس کی نظریں پاؤں سے لے کر پیشانی تک اس طرح طواف کر رہی تھیں جیسے وہ صبح کی دیوی ہو اور انور کو درشن دے کر ابھی ابھی فضا میں تحلیل ہو جانے والی ہو۔

پھر انور کی نظریں سلینا کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ ہائے مشرق اور مغرب کا یہ امتزاج اور انور کا جی بے اختیار چاہا کہ وہ اس حسین نیم خوابیدہ پر اپنے لبوں کا جادو جگا دے بالکل ایسے جیسے انتہائی خوب صورت گلکاریاں کرتا ہوا بچہ بے اختیار کسی کو بھی مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کی گرفت میں آجائے اور وہ اس بچے کے گال کو اپنے لبوں کی مُہر سے محبت کا شدید احساس دلا دے۔

مگر وہ سلینا تھی اور وہ اس سے اتنا زیادہ مرعوب ہو چکا تھا کہ ایسی جسارت نہ کر سکا۔ البتہ اگر نگاہیں ہونٹوں کا بدل ہوسکتی ہیں تو اس حسین صبح کے ملگجے اجالے میں انور نے سلینا کو نظروں نظروں میں اپنی عقیدت کا تحفہ پہنچا دیا۔

اور دوسرے ہی لمحے سلینا نے جیسے انور کی نگاہوں کی گرمی کو محسوس کر لیا۔ اس نے گھبرا کر

آنکھیں کھول دیں انور پلکیں جھپکے بغیر اس کی جانب اتنی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ وہ گڑ بڑا گئی۔ ان نگاہوں میں اسے بہت کچھ نظر آیا۔ ایسے جیسے انور کہہ رہا ہو سلینا میرے دل کی التجائے محبت سن لو۔

اورسلینا اس التجائے محبت کو سننے کی سکت اپنے آپ میں کہاں پاتی تھی۔

نہیں۔اس نے کرب سے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔

انور اپنے لیے ایک اور دکھ مول لے رہا ہے۔ میں اسے ایسا نہیں کرنے دوں گی۔

اس نے ایک دم سے سوچا اور نئی طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

انور تم یہاں کیوں آئے۔سلینا کے لہجے میں سرزنش تھی۔

میں صبح کی سیر کو نکلا تھا کہ مجھے صبح کی دیوی کے درشن ہو گئے۔

انور نے اپنے دل میں محبت کی بے پناہ موجوں کو اٹھتے محسوس کیا اور کہے بغیر نہ رہ سکا۔

سلینا کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل تھا۔ وہ کمزور پڑ رہی تھی۔ اور انور اس کے برخلاف اپنے وجود میں بے پناہ طاقت محسوس کر رہا تھا۔ آج تو اسے مردانہ وار محبت کے میدان میں قدم رکھنا ہی تھا۔ شاید اسے اب کوئی نہیں روک سکتا تھا وہ تو کسی بھی منفی طاقت کو شکست دینے کا تمام تر حوصلہ رکھتا تھا۔

تمہیں یوں باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔ کوئی گرم کپڑا بھی نہیں پہنا ہے۔ یہ شال تمہارے کسی کام نہیں آسکتی۔ سلینا گھبرا کر اپنے لہجے کو سخت بنا رہی تھی اور اپنے نرس ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔

اور تمہیں آنا چاہیے تھا!! انور نے سلینا کی طرف اسی کے لہجے میں سوال پلٹا دیا۔ سلینا سفید باریک نائٹ گاؤن میں اپنے آپ کو محسوس کر کے ایک دم سے گڑ بڑا گئی۔ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا مگر وہ پھر بھی بولی ایک نرس کی حیثیت سے۔

اُونھ میری بات نہ کرو اس نے دونوں ہاتھ آگے کی جانب باندھتے ہوئے کہا۔

تم کمزور ہو اور یوں تمہیں بخار بھی آسکتا ہے۔

پیشتر اس کے کہ انور پھر جرح کرتا سلینا انور کا بازو تھام کر آگے بڑھ گئی۔ اسے اپنی ذمہ داری کا احساس تھا اور اس وقت اسے صرف ایک نرس بن جانا ہی ضروری تھا۔

لیکن انور کے لیے یہ لمحہ کتنا لذّت بخش تھا اس کا اندازہ صرف انور ہی کو تھا۔ وہ سلینا کے پیچھے پیچھے کسی سحر زدہ معمول کی طرح چلتا کمرے میں پہنچ گیا۔
سلینا نے انور کو اس کے بستر پر لٹا دیا۔ دروازہ بند کر کے اسے لیٹے رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے اپنے کمرے میں بھاگی چلی آئی۔ نہ اس نے اس کی آنکھیں اپنی ہتھیلیوں سے بند کیں۔ نہ اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں، نہ ہی اس کی نظروں سے نظریں ملائیں۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس نے کچھ اوڑھا بھی ہے یا نہیں۔ بس جیسے اسے کمرے میں پہنچانا ضروری ہو اور بس۔

یارب اس مرگ آسا مقابلے کے لیے مجھے استقامت عطا فرما۔ میں ٹوٹنے نہ پاؤں۔ میں بکھرنے نہ پاؤں۔ میری سوچ کو جکڑ لے۔ میری انگڑائی لیتی ہوئی خواہشوں کو لگام دے۔ میری آنکھوں سے نکلنے والی تمام بے قرار روشنیوں کو گُل کر دے۔ میرے لبوں کو سل دے۔ میں بول نہ سکوں۔ کچھ کہہ بھی نہ سکوں۔ مجھ سے میرا احساس بھی چھین لے۔ کنواری ماں۔ مجھے زندگی کی آخری سانس تک امانت دار اور پاکیزہ رہنے میں میری مدد کر۔ میں بہت کمزور لڑکی ہوں۔ اکیلی اور اداس، میرے دل کو پتھریلی چٹان بنا دے۔ میں امانت دار ہوں مجھے امانت دار رہنے میں میری مدد کر۔ میں نے وعدہ کیا ہے۔ مجھ سے وعدہ خلافی نہ کرا۔ کنواری ماں میری مدد کر۔ تو میرے گرد گھیرا تنگ کر دے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے مجھے اپنی گرفت میں کر لے۔

اور سلینا دیر تک یونہی کنواری ماں کے سامنے آنسو بہاتی رہی۔ جانے اس کے پاس آنسوؤں کا نہ ختم ہونے والا کتنا ذخیرہ اور تھا۔

۲۰

.....اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہم راہ ایک سماوی روح لے کر داخل ہوئی ہے جس نے ماحول پر، سکون اور جلال طاری کر دیا ہے۔ ساری فضا کو مسخر کر لیا ہے اور اردگرد کی ہر چیز ادب سے ہاتھ باندھ کر اس کے حضور سرنگوں ہے...

رات کے کھانے کے بعد سب گھر والے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔
سردی شروع ہوجانے کے سبب آتش دان میں کوئلے جلنے لگے تھے۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا رات میں سردی بڑھ بھی جاتی تھی۔ قالین پر اطہر، انور، نجمہ اور شاکرہ سب ہی بیٹھے چلغوزوں سے شغل کر رہے تھے۔ بات بات پر قہقہے بلند ہوتے۔ ایک مدت کے بعد لگتا تھا اس گھر میں لوگ کہیں سے آ کر آباد ہوگئے ہیں۔

انور کو سلینا نے بطورِ خاص تیار کیا تھا۔ اس نے شلوار کُرتے پر پوری آستین کا نیوی بلیو سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ قرینے سے بال بنائے تھے اور کمزوری کے سبب اسے گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا دیا گیا تھا۔ آج انور کی حالت روز سے بہتر تھی اور اسی سبب یہ محفل جمی تھی۔ انور چہک رہا تھا اور انور کو باتیں کرتا دیکھ کر اطہر بے حد خوش تھا۔

میرا انور اب ٹھیک ہوگیا ہے۔ اطہر نے بے حد مسرت سے سوچا۔ ایک مدت تک یہ تاریکی میں غوطے لگاتا رہا تھا۔ اطہر نے ترحم آمیز نظروں سے انور کی طرف دیکھا۔ انور جو ہمیشہ سے شوخ و شریر اور ہنس مکھ تھا۔ ذہنی بے ربطی کا شکار کیوں کر ہوگیا۔ وہ کون سا ایسا دکھ تھا جس نے اسے زندگی کا حوصلہ تک ہار جانے دیا۔ اطہر سوچ رہا تھا۔ انور، نجمہ سے مخاطب

تھا۔ بھابھی سردیاں آ گئیں آپ کچھ کاہل نہیں ہو گئی ہیں۔
کیوں۔تم نے ایسا کیوں سوچا، نجمہ مصنوعی خفگی سے بولی۔
وہ گاجر کا حلوہ بھی تو کبھی بنا کرتا تھا نا سردیوں میں۔ انور بالکل چھوٹے سے بچے کی طرح بول رہا تھا۔آپ بنائیں نا۔اس نے نجمہ سے کہا۔
وہ کس خوشی میں جناب؟ نجمہ نے اسے چھیڑا۔
اچھا یہ بات ہے بھابھی۔ انور نے دھمکی دی۔ میں پھر بیمار ہو جاتا ہوں۔ خود ہی خوشامد کرتی ہوئی آئیں گی آپ میرے پاس۔ انور لو میں نے تمہارے لیے حلوہ بنایا ہے۔ اس نے نجمہ کے سے انداز میں منہ بنایا۔
بڑے چہک رہے ہو بات کیا ہے؟ نجمہ نے پیار سے کہا۔
شاکرہ بولی بھابھی کا سارا پیار تو بس انور کے لیے ہے۔ میں تو جیسے ان کی کوئی ہوں ہی نہیں نا۔بھلا میرا خیال کسے ہے۔
تمہارا بھی خیال ہے۔ اور اب تو تمہارا خیال رکھنے والا میں مستقل طور پر لانے ہی والی ہوں۔ بھابھی نے انکشاف کیا۔
وہی ڈریکولا نا۔انور نے چھیڑا۔
شاکرہ روٹھ گئی۔میرے لیے بس رنگین دواؤں والی شیشی ہی رہ گئی ہے۔
نہیں نہیں پاگل بنا دینے والے انجکشن بھی تمہاری تقدیر میں لکھ دیے گئے ہیں۔ انور نے شاکرہ کو مزید ستایا۔
اپنی فکر کرو، میری فکر چھوڑ دو انور بھائی۔ بس ذرا بیمار ہو تو ہم سب تمہارا خیال کرر ہے ہیں ورنہ لے آتے کوئی بارہ من کی دھوبن تمہارے لیے۔
اتنے میں اچانک اطہر کو سلینا کی کمی محسوس ہوئی۔
شاکرہ ذرا دیکھنا سلینا اگر سو نہیں گئی ہے تو اسے یہاں تو بلانا۔ اور شاکرہ سلینا کے کمرے کی جانب چل دی۔
اطہر سلینا کا اس قدر مداح ہو چکا تھا کہ اسے بالکل شاکرہ ہی کی طرح سمجھتا۔
سلینا بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اطہر نے آپ ہی آپ کہا۔

بہت اچھی۔ انور نے 'بہت' کوطول دے کر نجمہ کے کان میں کہا۔
خیریت۔ نجمہ شوخی سے بولی۔
میری خیریت تو آپ سلینا ہی سے پوچھیں بھابھی۔
بڑے چہک رہے ہو کچھ گڑبڑ ہے کیا؟ نجمہ نے پھر چوٹ کی۔
ابھی تو چہکنا شروع کیا ہے۔ دیکھتی جائیے۔ اور غیر اختیاری طور پر اس کی نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں جیسے اسے سلینا کا شدت سے انتظار ہو۔
اور اسی لمحے شاکرہ کے ہم راہ سلینا کمرے میں داخل ہوئی انور کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ اپنے ہم راہ ایک سادی روح لے کر داخل ہوئی ہے جس نے فضا پرسکون و جلال طاری کر دیا ہے۔ ایک سرسراتی سی سرد ہوا کا جھونکا سا آ گیا ہے جو جسم و جان سے لپٹ گیا ہے۔ ایک خوشبو کی شیشی جیسے چھن سے گر کر ٹوٹ گئی ہے۔ ہر طرف مہک ہی مہک ہے۔ ٹوٹنے کی جھنکار جیسے ستار کی ہے۔ جیسے اس کے اردگرد پھلجھڑیاں سی جل اُٹھی ہیں جس کے ٹوٹتے ستارے اس کے جسم سے چھو کر اسے چبھن دے رہے ہوں۔ ایک میٹھی چبھن ایک دل آویز احساس ایک مترنم سوچ۔ وہ اندر کیا آئی کہ جیسے دریچے کھلے ہوا آئی۔
وہ سلینا سے ہمیشہ مرعوب ہوجایا کرتا تھا۔ اس وقت بھی مرعوب ہوگیا۔ سلینا سفید لال کناری والی مخصوص ساڑھی میں ملبوس تھی۔ کٹے ہوئے سنہری بال اس کے شانوں پر بکھرے تھے۔ گلے میں سیاہ آبنوس کی صلیب لٹک رہی تھی۔ کالی کالی آنکھوں میں سمندر اُمنڈا ہوا تھا اس کے آنے سے سارا ڈرائنگ روم گلوب کی طرح گھوم گیا تھا۔ ایسے جیسے ساری کائنات اسی کے دم قدم سے ہے۔
انور نے محسوس کیا اس کا حُسن اس کے سنہری بالوں میں نہیں بلکہ اس کے پاکیزہ ہالے میں ہے جوان بالوں کے گرد محیط ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے جو نور پھوٹ رہا ہے اس کی کرن سارے ماحول کو جگمگا گئی ہے۔
سلینا آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی نجمہ کے پہلو میں جا بیٹھی اور انور کی نظریں ان دونوں کا مقابلہ کرنے لگیں۔
نجمہ ہلکے گندمی رنگ کی معتبر سی ہستی جس کے لمبے لمبے سیاہ بالوں کی موٹی سی چوٹی بل

کھاتے ہوئے سانپ کی طرح عموماً اس کے بائیں جانب سے آگے کی طرف لہراتی رہتی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں کاجل کے موٹے موٹے ڈورے اپنی جوت جگاتے اور پتلے پتلے گلابی ہونٹ جن سے شیرینی ٹپکتی۔ چہرے پر بے پناہ ذمہ داری کا احساس اور اس کے ساتھ ساتھ سکون و اطمینان کی دبیز تہہ۔ اسے بے حد خوب صورت بنائے رکھتی۔ جب کہ سلینا مشرق و مغرب دونوں کا حُسن چُرائے بیٹھی تھی۔ اس لمحے اس کا بے اختیار جی چاہا کہ پہلے تو وہ نجمہ کے قدموں میں جا گرے جو اپنے قدموں تلے ماں کی جنت چھپائے بیٹھی تھی اور پھر غرور سے سر اٹھائے موقع پا کر سلینا کے کٹے ہوئے سنہری بالوں کو آہستہ سے چھیڑ دے۔ مگر وہ اپنی جگہ ساکت ہی بیٹھا رہا اور خواہشات کا طویل سفر چپ چاپ بے حرکت طے ہوگیا۔ تب یکا یک سکوت ٹوٹا اور اطہر کی آواز گونجی۔

تم کچھ تھکی تھکی معلوم ہوتی ہو سلینا۔ کبھی آرام بھی کرلیا کرو۔

اس لمحے انور نے غور سے اس کے چہرے پر نظریں دوڑائیں۔ ہاں اس کا جی دھک دھک کررہا تھا۔ تم نے اداسی کو اپنا پہرہ دار کیوں بنایا ہوا ہے۔ تمہارے معصوم سے چہرے پر تو مسکراہٹ کی نرم و نازک کرنیں ہونی چاہیے۔

سلینا، اطہر کے سوال اور انور کی خاموش آواز دونوں کو نظر انداز کرکے اپنے آپ ہی میں گُم رہی۔ وہ جواب بھی کیا دیتی۔ انور کا کام کرنے سے وہ ذرا بھی نہیں تھکتی تھی اور اطہر خود بھی تو اس کا یہ جواب جانتا ہی تھا وہ تو بس محبت میں یہ کہہ رہا تھا۔ اس محبت کا جواب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ اور انور وہ تو جس سمت جا نکلا ہے وہ راہ خطرناک ہے۔ اسے اس راہ پر چلنے سے تو روکنا ہی ہوگا۔ جب منزل ہی نہ ملے تو رستے پر چلتے رہنے کا کیا فائدہ؟ سلینا بس یہی کچھ سوچ رہی تھی اور اُلجھ بھی رہی تھی۔

سلینا، میں سوچ رہا ہوں کہ انور کی صحت یابی کی خوشی میں ایک شان دار سا جشن منایا جائے۔ کہو تمہاری کیا رائے ہے؟

اطہر نے کسی کی بھی رائے لینی ضروری نہیں سمجھی وہ مخاطب ہوا تو صرف سلینا سے۔

جو آپ سب کی رائے ہوگی وہی میری بھی ہوگی۔ سلینا نے بہ مشکل یہ جملہ ادا کیا۔

نہیں سلینا! اس گھر میں تمہاری حیثیت بہت اہم ہے۔ سچ پوچھو تو سلینا تم نے ہم سب کو

خرید لیا ہے۔ میں یہ مبالغے میں نہیں کہہ رہا۔ انور کی تیمارداری حقیقت ہے کہ ہم میں سے کوئی اتنی نہیں کرسکتا تھا۔ ہمیں اس کا اعتراف کرنا ہی چاہیے۔

اطہر کے لہجے میں تشکر کے ساتھ احسان مندی کے جذبات تھے۔

یہ تو آپ لوگوں کی محبت ہے کہ آپ سب اس طرح سوچتے ہیں۔ سلینا نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ ورنہ میری حیثیت ایک نرس سے زیادہ اور کیا ہے۔ میں نے تو اپنا فرض ادا کرنے کی تھوڑی سی کوشش کی ہے۔ کسی پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔

نہیں سلینا۔ ہر نرس انور کی اس طرح دیکھ بھال نہیں کرسکتی تھی۔ اب کے نجمہ کی باری تھی۔

بھابھی آپ لوگوں کے دیے ہوئے اشتہار پر میں نہ آتی تو کوئی دوسری نرس آجاتی اور آپ لوگوں کے خلوص سے متاثر ہو کر وہ بھی اسی قدر محنت کرتی جتنی کہ میں نے کی۔

سلینا جیسے یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھی کہ اس نے کچھ زیادہ ہی ان لوگوں کے لیے کیا ہے۔

خیر سلینا۔ اس بحث کو چھوڑو۔ یہ ہم سب بہتر سمجھتے ہیں کہ تم نے کیا کیا اور تمہارے فرائض کی حدود کیا تھیں؟ اب تمہاری حیثیت اس گھر میں شاکرہ سے کم نہیں۔ اور میری محبت کی تم اتنی ہی مستحق ہو جتنی کہ شاکرہ ہے۔ جتنا کہ انور ہے۔ اطہر نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔

میں آپ کی محبت کی بے حد شکر گزار ہوں اطہر صاحب۔

سلینا نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں جواب دیا۔

مجھے اطہر بھائی کہو سلینا۔ میں تمہارا بھائی کہلا کر فخر محسوس کروں گا۔ اب اور جب بھی تمہیں میری ضرورت ہوگی میں اسی طرح تم سے قریب ہوں گا جتنا کہ میں شاکرہ سے قریب ہوں اور جس قدر شاکرہ مجھ پر اپنا حق رکھتی ہے۔ تم یقین کرو سلینا میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ بلکہ شاید وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا ہوں جو کہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہے اور واقعی حقیقت بھی یہی تھی وہ سلینا کو اب اپنے دل سے قریب محسوس کر رہا تھا جیسے کہ وہ بھی شاکرہ کی طرح اس کی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔

سلینا کے لیے یہ خوشی سہارنی مشکل ہو رہی تھی۔ میرا بھی کوئی بھائی ہوسکتا ہے۔ میں بھی کسی

کی بہن ہو سکتی ہوں۔ یہ رشتہ تو اسے قدرت کی طرف سے نصیب ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ فرشتہ صفت لوگ مجھے کہاں سے مل گئے۔ آخر یہ مشرقی لوگ اپنے دل میں اتنی بہت سی محبت کیسے سمیٹے پھرتے ہیں؟ آخر ان کے پاس خلوص و وفا کا بیکراں سمندر کہاں سے آتا ہے۔ اور ایسے ہی میں اسے اپنا باپ یاد آ گیا۔ میری ماں کہتی تھی کہ اس کے شوہر کے دل میں پورے پاکستان کی محبت سمٹ آئی تھی۔ لیکن پورا مشرق تو یہاں ہر ایک کے دل میں ہے۔ اطہر کے، نجمہ کے، شاکرہ کے اور انور کے دل میں۔

اس لمحے اس کا سر غیر اختیاری طور پر نجمہ کے کاندھے پر ٹک گیا اور آنسوؤں کے دریا ابل پڑے اس کی فطری کمزوری عود کر آئی۔ اس نے اپنے اردگرد جو ٹھوس اور سخت دیوار بنائی تھی وہ ٹوٹ پھوٹ کر گر پڑی۔

نجمہ نے اسے سمیٹ لیا۔

کیا بات ہے سلینا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟

مگر سلینا جواب نہ دے سکی وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ نجمہ، شاکرہ نے مل کر اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ اطہر ڈاکٹر کو فون کرنے بھاگا۔ اور انور اپنی جگہ ساکت و ششدر تھا۔

۲۱

.....ایسے میں وہ اپنے آپ کو بے حد کمزور اور ٹوٹا پھوٹا محسوس کرتی ایسے جیسے وہ کانچ کی بنی ہوئی ہے اور اس کا کانچ کا جسم ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جائے گا...

اس رات نجمہ اور شاکرہ سلینا کے پاس سے لمحے بھر کو بھی نہیں ہٹیں۔سلینا ہوش میں آچکی تھی اور اب سکون کی نیند سو رہی تھی۔
سلینا بہت کمزور ہوگئی ہے۔ نجمہ نے سلینا کے زرد مرجھائے ہوئے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے شاکرہ سے کہا۔
بھابھی سلینا نے انور بھائی کے لیے اتنی محنت کی ہے کہ اب وہ خود بیمار پڑ گئی ہے۔ جب یہاں آئی تھی تب کیسی سرخ سفید تھی۔شاکرہ نے احسان مندی سے کہا۔
شاکرہ سلینا کے جسم میں مشرقی روح ہے اور مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن نہیں۔
ہوسکتا ہے ایسا ہی ہومگر ہمیں یہ بات کیسے پتہ چلے؟
ظاہر ہے جب تک سلینا اپنے بارے میں ہم سے کچھ نہ کہے ہم کیا جان سکتے ہیں؟ لیکن یہ بھی تو ہے کہ شاید ہی دنیا کی کوئی عورت ہو جو گھر کی جنت سے محروم ہوکر خوش رہ سکتی ہو۔ خواہ وہ کسی بھی تہذیب سے متعلق ہو۔ جبلت تو عورت کی ایک ہی ہوتی ہے۔
مگر بھابھی یہ تو اپنی اپنی چوائس بھی ہوسکتی ہے۔ وہ کسے پسند کرتی ہے۔ گھر کے غیر اہم اور

چھوٹے چھوٹے کاموں کو یا باہر کی شہرتوں اور مصروفیتوں کو۔ شاکرہ نے کہا۔
نہیں شاکرہ ایسا نہیں ہے۔ کوئی عورت اپنی جنس کے خلاف کام کر کے خوش اور مطمئن نہیں رہ سکتی۔ یہ تو معاشرتی اصول ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی عورت مردوں کے کام کرے۔ لیکن ایک عمر ایک حد تک۔ پھر اسے اپنا گھر تو چاہیے ہی ہوتا ہے۔
لیکن بھابھی کیا ہمیں ایسی عورتوں کی کہانیاں سننے کو نہیں ملتیں کہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔ مدتوں سے کر رہی ہیں اور ان کا عزم بھی یہی ہے کہ وہ کرتی رہیں گی۔ انہیں گھر سے اتنی اُنسیت نہیں ہوتی۔
ایسی مثالیں خال خال ہوتی ہیں لیکن اگر ان سے قریب ہو۔ ان سے باتیں کرو تب معلوم ہوگا کہ وہ عورت جھوٹی زندگی گزار رہی ہے اور وہ کسی نہ کسی ایسے گھر کی آرزو اپنے دل کے کسی کونے میں ضرور رکھتی ہے جہاں وہ اپنا گھر سجائے۔ بچے پیدا کرے۔ کھانا پکائے اور صفائی کرے۔ وہ مغرب کی عورت ہو یا مشرق کی اس میں کوئی تخصیص نہیں۔
سلینا کی کوئی مجبوری ہے۔ جو وہ اسپتال اور دوسرے تیسرے کے گھر رہ کر اپنی زندگی گزار رہی ہے خواہش تو اس کے دل میں اپنے ہی گھر کی ہوگی۔
کیا ہم کبھی اس سے اس موضوع پر بات نہیں کر سکتے شاکرہ نے نجمہ سے پوچھا۔
بالفرض اگر ہم کر بھی لیں تو اس کی کیا مدد کر پائیں گے؟ پھر گفتگو تو بے معنی ہوئی نا۔ نجمہ نے جواب دیا۔
دونوں آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں کہ اس دوران سلینا کی آنکھ کھل گئی۔ اب وہ ہوش میں تھی اور بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے نجمہ اور شاکرہ کو اپنے سرہانے اور پائینتی بیٹھے دیکھا تو یہ سوچ کر پشیمان ہوگئی کہ اس کی وجہ سے ان دونوں نے اپنا آرام قربان کیا۔
میں نے ناحق آپ لوگوں کو پریشان کیا۔ بالآخر سلینا اٹک اٹک کر یہ جملہ ادا کر سکی۔ وہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہوئی جا رہی تھی۔
سلینا تم غیروں کی طرح باتیں نہ کیا کرو۔ ہمارا دل دکھ جاتا ہے۔ ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے سمجھیں۔ نجمہ نے پیار سے ڈانٹا۔ اس ڈانٹ میں سلینا نے ماں کا پیار محسوس کیا۔ ماں کا پیار کیا ہوتا ہے وہ جانتی تو نہ تھی۔ مگر اس ڈانٹ کا خوش گوار اثر جو اس نے قبول کیا

تھا وہ یقیناً ایسا ہی تھا جس کی توقع صرف ماں سے ہی ہوتی ہے۔
شاکرہ ڈئیر تم تو سرِ شام سو جاتی ہو۔ تم کیسے ساری رات جاگتی رہیں۔ سلینا نے شاکرہ کو چھیڑا اگرچہ اس کی آواز بے حد کمزور تھی۔
آپ نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔ شاکرہ نیند کا طعنہ سن کر روٹھ گئی۔
سلینا نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنے آپ پر جھکا لیا۔
شکریہ، شاکرہ ڈئیر۔ سلینا نے محبت سے کہا اور شاکرہ کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھی۔
بھابھی اب آپ دونوں جائیں اور جا کر آرام کریں میں بالکل ٹھیک ہوں۔
یہ آرام کا وقت نہیں ہے محترمہ۔ صبح ہو رہی ہے بس اذان ہوا ہی چاہتی ہے اب دن میں ہم لوگ سوئیں گے اور تمہاری سزا یہ ہوگی کہ آج دوپہر کا کھانا تم پکواؤ گی۔ سمجھیں نجمہ نے کہا۔ حالاں کہ وہ دیکھ رہی تھی کہ سلینا کا چہرہ اب بھی زرد تھا اور وہ خاصی حد تک بیمار اور کمزور لگ رہی تھی۔ مگر نجمہ اس کا اظہار کر کے اسے احساس بھی دلانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سلینا کا اچانک بے ہوش ہو جانا صرف طبیعت کی ناسازی نہیں بلکہ کہیں نہ کہیں اس کا جذباتی معاملہ بھی ہے۔ وہ ہے کیا، یہ تو نجمہ نہیں جانتی تھی مگر حقیقت یہی تھی۔
منظور۔ سلینا نے اپنے جرم کی سزا فوراً ہی قبول کر لی۔
نمک مرچ کی تیزی کمی معاف۔
جی نہیں۔ اس کی سزا الگ سے ملے گی۔ نجمہ نے ہنستے ہوئے کہا اور اس کے سر پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا۔ ہمیں ہنستی مسکراتی سلینا چاہیے، یاد رکھنا۔ یہ کہتے ہوئے دونوں کمرے سے نکل گئیں۔

سلینا نے اپنے آپ پر جو قابو پایا ہوا تھا وہ دکھاوا تھا۔ دونوں کے جاتے ہی وہ پھر بکھر گئی۔ اسے ایسا لگا کہ اس کا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ سانس اٹک اٹک کر آ رہی ہے۔ ہتھیلیوں میں سنسناہٹ ہے۔ ٹانگوں میں دم ہی نہیں اور آنکھوں میں تو آنسوؤں کا طوفان چھپا ہوا تھا جو موقع پاتے ہی امنڈ پڑا۔ وہ بار بار آنکھیں ملتی جاتی اور اپنے آپ سے کہتی جاتی۔ مجھے یہاں مضبوط بن کر رہنا ہے۔ میں سلینا کراس ہوں۔ ان سب کی ملازم۔ اس نے گلے میں لٹکتی ہوئی آبنوسی صلیب پر ہاتھ پھیرا۔ میں اس گھر سے مختلف ہوں۔ صلیب کی بیٹی

ہوں۔ یہ تو ان لوگوں کی محبت ہے کہ وہ مجھے اپنے سے قریب رکھتے ہیں لیکن مجھے اپنا اور ان کا فرق معلوم ہے اور مجھے اس فرق کو بہر حال یاد بھی رکھنا چاہیے۔
اس نے اپنے جسم میں بہت کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس کیا۔ یہ فیصلہ اس کی اپنی سوچ کے خلاف تھا۔ یہ فیصلہ اس کی فطرت کے بھی خلاف تھا۔
وہ بہ مشکل بستر سے اٹھی۔ سہارا لے کر مریم کی تصویر تک پہنچی۔ اس کی نظریں نیچی تھیں اور وہ معمول کی دعا مانگ رہی تھی۔ دعا سے فارغ ہو کر وہ چمن کی طرف نکل گئی۔ صبح کی سیر شاید مجھے وقتی سکون دے دے تاکہ میں دن بھر اپنے فرائض معمول کے مطابق ادا کر سکوں۔
ابھی سورج پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا۔ اندھیرا اجالے سے گلے مل کر رخصت ہوا چاہتا تھا۔ پرندے اپنے آشیانوں سے نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں اس نے فرحت محسوس کی۔ اپنے گرد سفید شال لپیٹ کر وہ اپنی مخصوص جگہ پر آ بیٹھی شبنم سے بھیگی گھاس پر تلوے سہلاتے ہوئے اس نے سوچا۔
اگر میں ایسے ہی کسی گھر میں پیدا ہوتی!
مگر اس نے فوراً ہی اپنی سوچ درست کی۔ بھلا پیدا ہونے سے کیا ہوتا ہے۔
پیدا تو میں بھی ایک ایسے ہی گھر میں ہوئی تھی۔ لیکن حالات نے اسپتال کو اپنا گھر سمجھنے پر مجبور کر دیا۔ اسپتال جہاں دکھ درد کی کہانیاں پلتی ہیں۔ اور مر بھی جاتی ہیں۔ جہاں کی فضا میں کبھی شیریں نغمے نہیں سنے جاتے۔ جہاں صرف دکھ بھرے گیت کی صدائیں گونجتی ہیں۔ جہاں بستروں پر پیڑ سے ٹوٹے پتے کے مانند انسان بکھرے پڑے ہوتے ہیں۔ یہ ٹوٹے زرد پتے ایک دن بستروں سے جھاڑ دیے جاتے ہیں۔ اسپتال تو دکھی لوگوں کا زندہ قبرستان ہوتا ہے جہاں لوگ دفن نہیں ہوتے بلکہ ان کے جسم بے گوشت لاش کی صورت میں ڈراؤنا منظر پیش کرتے ہیں۔ ان کی کراہیں اور دل خراش آوازیں رات کے سناٹے میں دل دہلا دیا کرتی ہیں۔ اس زندہ قبرستان کی میں ایک گورکن ہوں بس۔
رات کے واقعے کا اس پر پھر اثر ہو چلا تھا۔
وہ دکھ سے سوچ رہی تھی میرا کوئی بھی تو نہیں۔ نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی بہن۔ یہ پیار

بھرے رشتے جسے قدرت مفت تقسیم کرتی ہے میرے حصّے میں آئے ہی نہیں۔ اور جن سے محرومی کی قیمت میں جانے کب سے ادا کر رہی ہوں۔ کب تک ادا کرتی رہوں گی۔ میں تو بس ایک فارمولا ہوں۔ اور اسی کے تحت پیدا ہوئی ہوں۔ ایسے جیسے مشین انڈے میں سے مرغی کا بچہ پیدا کر دیتی ہے۔ میں بس سلینا کراس ہوں۔ صلیب کی بیٹی اور بس۔

آج دن کے آغاز سے ہی اس پر جذباتیت اور سوچ نے اپنا پہرہ بٹھا لیا تھا۔ ایسے میں وہ اپنے آپ کو بے حد کمزور اور ٹوٹا پھوٹا محسوس کرتی۔ ایسے جیسے وہ کانچ سے بنی ہوئی ہے۔ اور اس کا کانچ کا جسم ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جائے گا۔

اندھیرا چھٹ چکا تھا۔ سلینا خاصی دیر یہاں بیٹھی رہی۔ سورج دور پہاڑیوں کی اوٹ سے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا اس نے اپنی بند آنکھیں کھول دیں جسے اس نے ابھی سورج کو طلوع ہوتے دیکھ کر بند کر دی تھیں وہ چاہتی تھی کچھ دیر کے لیے ہی سہی اس منظر کو اپنی آنکھوں میں چھپا لے۔ اس نے اسی لمحے دیکھا انور گیٹ سے داخل ہو رہا تھا۔ وہ پریشان پریشان تھا۔ سلینا اپنے مریض کی ہر بدلتی کیفیت کو پہچانتی تھی۔ اس نے دور سے ہی محسوس کر لیا کہ جیسے وہ تھکا ہوا ہے۔ اس کی سانس پھولی ہوئی ہے۔

اس نے آواز دی۔ ہلو انور کیسے ہو کہاں سے آرہے ہو۔ تھک تو نہیں گئے۔ اس نے سارے تشویش ناک سوالات ایک دم سے کر ڈالے۔ ساتھ ساتھ اسے اپنے آپ کو بھی نارمل حالت میں لانا تھا۔

میں بڑی دور سے چلتا آرہا ہوں۔ صبح کی سیر سے طبیعت پر خوش گوار اثر پڑتا ہے تمہاری ہی تعلیمات پر عمل کر رہا ہوں۔ انور نے بشاشت سے کہا۔

اب تم اپنے آپ میں کسی قسم کی کمزوری تو محسوس نہیں کرتے۔ سلینا نے خاص نرسوں والے انداز میں پھر اس سے سوال کیا۔

اور اس سوال کے جواب میں انور خاموش ہو گیا۔ اس نے نظریں نیچے گھاس پر جما دیں اور پاؤں سے گھاس کریدنے لگا۔ حالاں کہ سلینا سے نزدیک آتے آتے وہ چاہتا تھا کہ اس صبح کی دیوی کا وہ بھرپور درشن کرے۔ جو بکھرے بالوں اور سفید شال میں لپٹی ایک بنچ پر بیٹھی تھی۔ اب اس کی نظریں صرف اس کے دودھیا پاؤں پر ٹکی ہوئی تھی۔ اسے لگا اتنے

خوب صورت پاؤں تو اس نے آج تک کسی کے دیکھے ہی نہیں۔ جانے اس کی نظروں کی گرمی تھی کہ اس ٹھنڈک میں اس کے پاؤں سے گرم گرم کرنیں نکلنے لگیں اس نے جھٹ چپل میں اپنے پیر چھپا لیے مگر ایسے جیسے چھوٹی نکیلی سوئیاں اب اس میں چبھی جا رہی ہیں۔ وہ بھی خاموش تھی اور انور بھی جیسے سانس روکے ساکت کھڑا تھا۔

کیا خاموشی گفتگو سے زیادہ سنگین نہیں ہوتی؟

سلینا نے محسوس کیا کہ انور تو خاموش ہے مگر اس کے خدّ وخال برابر گفتگو کر رہے ہیں۔ اور اس لمحے سلینا کو پھر محسوس ہوا کہ اس کا کانچ کا جسم ٹوٹنے ہی والا ہے۔

مگر اسے تو اپنے آپ کو سنبھالنا ہی تھا۔

کیا بات ہے انور؟ تم جواب نہیں دیتے۔

جب سوزشِ دل بڑھ جاتی ہے سلینا تو آدمی گونگا ہو جاتا ہے۔

اس نے کرب سے یہ جملہ ادا کیا۔ اس کے قدم زمین پر جمے ہوئے نہیں تھے سلینا بغور اسے دیکھ رہی تھی اس کا سارا وجود ہل رہا تھا جیسے اندر اندر کوئی اُٹھا پٹک ہو رہی ہو۔ اگر وہ کچھ دیر اور یونہی کھڑا رہا تو گر جائے گا۔ شاید وہ بھی اپنی اندرونی کیفیت سے ڈر گیا تھا جھٹ گھر کی جانب مُڑ گیا۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا مگر بسا اوقات ایسا ہی ہوتا ہے انسان وہ کچھ کرتا ہے جو وہ کرنا ہی نہیں چاہتا ہے۔

سلینا اسے جاتا دیکھ رہی تھی وہ کب چاہتی تھی کہ اکیلی رہ جائے کچھ دیر سہی وہ بہت کچھ محسوس کرنا چاہتی تھی وہ کچھ جو حقیقت میں اس کی تقدیر میں تھا ہی نہیں۔ اور اس میں بھلا اتنی طاقت کب تھی کہ تقدیر سے لڑ جائے اور زبردستی وہ کچھ حاصل کر لے جو اس کا نہ سہی مگر اس کا ہو جائے۔ وہ اپنے آپ پر طنز سے ہنسی۔

سلینا کر اس اپنی اوقات نہ بھولو۔ اتنا ہی سوچو جتنا حالات اجازت دیتے ہیں اس کی طنزیہ مسکراہٹ نے اس کے وجود کو ڈگمگا دیا۔ اس کے پیروں سے ساری جان نکل گئی۔ زمین سرک رہی تھی۔ اس کا جسم ہل رہا تھا۔ جھٹ اس نے بینچ کا سہارا لیا۔ اب وہ زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی جیسے مرکزِ ثقل اس کے پاؤں کے نیچے نہیں کہیں ہوا یا فضا میں ڈولنے لگا ہو۔

وہ اب اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔

وہ حساس انسان جو محسوس زیادہ کرتا ہے اور سمجھتا کم ہے، کائنات کا سب سے قابلِ رحم شخص ہوتا ہے۔ شاید اس جملے کا اطلاق ان دونوں پر ہوتا تھا۔ سلینا پر بھی اور انور پر بھی کیوں کہ اپنی اپنی جگہ دونوں دُکھ کے شدید ترین مراحل طے کر رہے تھے۔ اور دونوں کے منہ میں زبان نہیں تھی اور دل زبان کے فرائض ادا کرنے کے درپے تھا۔ مگر وہ بھی آزاد نہیں تھا۔ اس کے اردگرد کئی محافظ تھے جو اس کام پر مامور کیے گئے تھے کہ دل صرف دھڑکنے کے علاوہ کچھ اور کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔

۲۲

.....تم نے اپنی زندگی کے چند قیمتی دن اس لڑکی کے ساتھ گزارے جس کے بالوں کی رنگت اخروٹ جیسی تھی۔ کیا تم نے اپنے آپ پر خود ظلم نہیں کیا... تم لوگ جو تقدیر کے قائل ہوتے ہو، تجربات سے دامن بچاتے ہو پھر اپنی تقدیر کے موتی سات سمندر پار ڈھونڈنے کیوں نکل پڑتے ہو...

سردی بڑھ گئی تھی شام ہوتے ہی اندھیرا چھا جاتا۔ رات کا کھانا جلدی ہوجاتا اور اس کے بعد سب ڈرائنگ روم میں جمع ہوجاتے۔ چلغوزوں سے شغل ہوتا۔ چائے کا دور چلتا اور ساتھ ساتھ انور نجمہ میں چھیڑ چھاڑ ہوتی۔ اطہر چپ چاپ بیٹھا مسکراتا اور سگار پیتا رہتا۔ شاکرہ آتش دان سے لگی سوئیٹر بُنتی، تھوڑی تھوڑی دیر بعد آتش دان میں کوئلہ ڈالتی جاتی۔ سلینا، نجمہ کے برابر بیٹھی کبھی کسی انگریزی رسالے کے ورق گردانی کرتی یا اطہر کے سوالات کے جواب دیتی جاتی۔ وہ کوشش کرتی کہ ایسے میں اسے چھٹی مل جایا کرے اور وہ اپنے کمرے میں رہے۔ وہ ان سب سے بے تکلف ہونے میں تکلف بھی برتتی لیکن اطہر، سلینا کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اسے ہر لمحے اس کا خیال رہتا اور وہ سلینا کو اس گھر میں ایک فرد کے طور پر سمجھتا تھا، ملازم نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سلینا اطہر کو بہت پسند کرتی تھی اور ساتھ ہی اس کا بے حد احترام بھی کرتی۔ اس گھر میں آ کر پہلی بار اسے خاندان برتنے کا موقع ملا تھا۔ مختلف رشتے دیکھنے کو ملے تھے جو اس کے لیے نئے تھے۔ یہ تجربہ اس کی شخصیت کو مختلف بنا رہا تھا۔ سلینا محسوس کرتی اب وہ پہلے والی سلینا نہیں رہی ہے۔ اس کی سوچ میں ہی تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ اس کے طور طریقوں میں بھی

بہت بدلاؤ تھا۔ وہ اکثر اپنے آپ پر حیرت کیا کرتی۔ وہ خود سے مخاطب ہوتی اور پوچھتی کہ کیا وہ سلینا ہی ہے۔ وہ یہ بھی جان رہی تھی کہ یہاں سے واپس جا کر اس کی زندگی مشکل ہو جائے گی۔ اس کے اندر سے جو سلینا نکل رہی تھی وہ اس کے پرانے ماحول میں بالکل فٹ نہیں ہو سکتی۔ اور یہ سوچ اکثر اسے پریشان بھی کر دیتی۔

ایک ایسی ہی رات تھی۔ کمرے میں سب لوگ موجود تھے۔ صرف اطہر ہی نہ تھا۔ اس لیے وہ رسالے لے کر ایک طرف خاموشی سے اس کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ انور کی صحت یابی کی خوشی میں ایک تقریب کا اہتمام ہونا تھا جس کی تاریخ بھی طے ہو چکی تھی۔ اور اسی سلسلے میں آج اطہر شہر گیا ہوا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ کھانے پینے کی چیزیں اور دوسری گھریلو اشیاء خرید کر وہ بچوں کے ہوسٹل جائے گا اور انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر گھر آئے گا۔ اب تک اسے آ بھی جانا چاہیے تھا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی سب ہی اس کا انتظار کر رہے تھے لیکن نجمہ کبھی کبھی سب کی نظر بچا کر گھڑی دیکھ لیتی تب یہ لمحہ انور کی گرفت میں آ جاتا وہ نجمہ کو چھیڑتا۔

ذرا دیر کی بھی جدائی برداشت نہیں ہو رہی ہے نا۔

نجمہ کے گال سرخ ہو جاتے۔

تم سے بھی پوچھوں گی۔ ابھی ستا لو مجھے۔

مجھے کیا ہوگا؟ انور بھولپن سے کہتا۔

وہ آئے گی پھر بتاؤں گی۔ نجمہ شوخی سے کہتی۔

کون آئے گی بھابھی۔ انور انجان بن جاتا۔

وہ بھی پھر بتاؤں گی۔ نجمہ شرارت سے کہتی۔

یہ معمول کی شرارت تھی لیکن آج انور کو اس میں زیادہ مزا آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کوئی اس سے اسی قسم کی بات کرے کہ وہ اب ایسی ہی کسی دنیا میں رہنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا دوسرے دیکھنے والے اس کی مسکراہٹ کو بلاوجہ ہی قرار دے سکتے تھے۔

شاکرہ حسبِ دستور سوئیٹر بُن رہی تھی اور یہ بتانے پر ہرگز تیار نہیں تھی کہ یہ سوئیٹر وہ کسے دے گی اور کس کے لیے بُن رہی ہے۔ اپنے لیے یا کسی اور کے لیے۔ سلینا نے بھی کئی بار

اس کی بُنائی کی تعریف کی تھی اور حیرت کا بھی اظہار کیا تھا کہ کیا سویٹر گھر پر بھی کوئی بُن سکتا ہے۔ وہ جہاں سے آئی تھی وہاں ایسی کوئی روایت اس نے دیکھی ہی نہیں تھی۔ نجمہ بار بار کہتی شاکرہ یہ سویٹر اُس کے لیے ہی بُن رہی ہے اور شاکرہ بھابھی کو منہ چڑا کر جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگتی۔

نجمہ اور سلینا ساتھ بیٹھی البم دیکھ رہی تھیں۔ اور انور قالین پر گاؤ تکیہ لگائے کسی ایک مصرعے کو بار بار گنگنا رہا تھا۔ نجمہ اپنے خاندانی البم کی ہر تصویر کی تفصیل سلینا کو بتا رہی تھی۔

یہ اطہر کی تصویر ہے۔ اور یہ ان کی امّی کی ہے۔

سلینا نے دیکھا اطہر اور انور اپنے ابا سے بڑی مشابہت رکھتے تھے اور شاکرہ بڑی حد تک اپنی امّی سے ملتی جلتی تھی۔ لیکن شاکرہ کی پیشانی اور آنکھوں میں کہیں نہ کہیں اس کے ابا کی بھی جھلک نمایاں تھی۔

نجمہ نے ایک گروپ فوٹو بھی دکھایا جس میں پورا کنبہ سمٹ آیا تھا۔

یہ اطہر ہیں۔ یہ میں۔ اس نے ایک نئی نویلی دلہن کی تصویر پر انگلی رکھ دی۔

اور یہ انور۔ ایک چھوٹے سے بچے کو انور بتا کر نجمہ خود ہی ہنسنے لگی۔ سلینا کو بھی ہنسی آ گئی۔ نیکر اور قمیص میں یہ چھوٹا سا بچہ اسے بہت اچھا لگا۔ اس نے کن انکھیوں سے انور کی طرف دیکھا۔ اب یہ کتنا خوبرو جوان ہے۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں اسے تولا نجمہ اور سلینا کی ہنسی پر انور بھی البم پر جھک گیا۔ سلینا کے بالوں کی خوشبو اس کی ناک سے گزرتی ہوئی سارے وجود میں پھیل گئی اور وہ مسحور و بے خود ہو گیا۔

یہ دیکھو سلینا۔ نجمہ نے ایک تصویر پر انگلی رکھ دی اس میں کئی لڑکیاں تھیں جس میں شاکرہ بھی موجود تھی۔ یہ اطہر کی مختلف کزن ہیں۔ اور یہ جو لڑکی ہے نا۔ نجمہ نے اشارہ کیا ہم لوگ اس سے انور کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ سلینا کی نگاہیں سب پر سے ہٹ کر اسی لڑکی پر جم کر رہ گئی۔ تصویر میں وہ لڑکی دوسری تمام لڑکیوں سے نمایاں تھی اس کے لمبے بالوں کی چوٹی اس کے بائیں کندھے سے ہوتی ہوئی آگے کی جانب کافی نیچے تک چلی گئی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور خوب صورت تھیں اس کی مسکراہٹ میں خاصا اعتماد تھا جیسے وہ اپنی

اہمیت سے آگاہ تھی۔ اس نے سوچا انور کی جوڑی اس کے ساتھ قابلِ رشک ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے ذہن میں اپنا سراپا بھی گھوم گیا۔ میں کہاں اور یہ کہاں۔ اس کی نظریں اب بھی کئی لڑکیوں کے ہجوم میں الگ ہی لگتی اس لڑکی پر جمی ہوئی تھی۔

مگر یہ جو انور ہے نا یہ تو کسی کے بھی قابو میں نہیں آتا۔ شادی کے نام سے جانے کیوں بھاگتا ہے۔ نجمہ نے پیار سے انور کی جانب دیکھا۔ تصویر اب بھی سامنے تھی اور سلینا کی نظریں اب بھی اسی لڑکی کو دیکھ رہی تھیں۔

پہلے تو یہ لندن چلا گیا۔ واپس ہوا تو خللِ دماغ لے کر۔ بے وقوف۔ نجمہ نے پیار سے انور کے سر پر چپت لگائی۔

اب کرلوں گا بھابھی۔ لندن سے بھی واپس آگیا اور خللِ دماغ بھی رخصت ہوا۔

انور نے یک بارگی شوخی کے ساتھ کہا۔

کیا نام ہے اس کا۔ اس نے جیسے ذہن پر زور ڈالنا چاہا۔

ہشت نجمہ نے ڈانٹا۔ رضوانہ کی شادی کبھی کی ہوچکی ہے۔ اور اب تو ماشاء اللہ اس کی ایک بچی بھی ہے۔ نجمہ نے گویا انور کو مطلع کیا۔

ہائے بھابھی میں تو جس لڑکی سے بھی شادی کے لیے تیار ہوجاؤں اس کی شادی ہی ہوجاتی ہے۔ انور نے ایسے کہا جیسے اسے رضوانہ کی شادی ہوجانے کی خبر سے دلی رنج پہنچا ہو۔

اور سلینا سوچنے لگی۔ میبل تم نے انور کو ٹھکرا کر آخر کس سے شادی کی ہوگی؟ تم بھی کتنی بدقسمت ہو۔ تمہیں انور نے چاہا اور تم نے اس کی چاہت کی قدر نہیں کی مگر پھر جیسے وہ خود چونک سی گئی۔

سلینا بیگم اپنے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ نہیں نہیں میری بات اور ہے۔ وہ گھبرا گئی۔

یہ میں بیچ میں کہاں سے آگئی۔ یہ سوچ میرے ذہن میں آئی ہی کیسے۔ میرا کیا تعلق ان لوگوں سے۔ میں تو انور کی ایک نرس ہوں۔ بس میری یہی حیثیت ہے۔ یہی سچ بھی ہے۔ مجھے بھٹکنا نہیں چاہیے۔ اس نے اپنے آپ کو خود ہی مضبوط رہنے کا درس دیا۔

پگلا کہیں کا۔ ایسے کہہ رہا ہے جیسے دس پندرہ بار لڑکی پسند کی ہے۔ اور وہ ہاتھ سے نکل گئی ہو۔ شادی کا نام سن کر تو تو اک دم سے بدک اٹھتا ہے۔

نجمہ کے لہجے میں بے پناہ چاہت اور اپنائیت تھی۔
ٹھہر۔مگر اب میں تجھے چھوڑوں گی نہیں۔ نجمہ نے انور کو جیسے دھمکی دی۔
ہر بار کی طرح اب کی انور بھاگا نہیں وہیں بیٹھا رہا۔
اب اس کی ضرورت نہیں بھابھی۔ میں خود ہی شادی کے لیے تیار ہوں۔ انور نے گاؤ تکیہ پر سر رکھتے ہوئے دھیرے سے کہا اور اس کا یہ جملہ زور سے جا کر شاکرہ کو لگا۔
اجی ہاں یہ شادی کریں گے۔شاکرہ نے آتش دان کے پاس سے ہی انور کو چھیڑا وہ بے چاری نجمہ کتنا چاہتی تھی آپ کو مگر آپ نے بھی کتنا مایوس کیا اسے۔ شاکرہ نے ماضی کی کسی نجمہ کی کہانی اُگل دی۔
خیر وہ تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ نجمہ نے فوراً ہی کہا۔اور پھر سلینا کو اس کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ نجمہ انور کی کلاس فیلو تھی اور دو سال تک اس نے انور کا بری طرح پیچھا کیا۔ مگر اسے ایک لمحے کے لیے بھی انور ہاتھ نہ آیا۔ جانے انور کے ذہن میں کون موجود ہے۔ وہ ہر کسی کو دیکھتا ہے اور رد کر دیتا ہے۔ہم تو اس سے تنگ آ چکے ہیں۔
دراصل بھابھی اس گھر میں ایک نجمہ نے آ کر کون سا تیر مارا ہے کہ میں دوسری نجمہ کو بھی لے آتا۔ ایک کو پکارتا دوسری آ جاتی اور دونوں ہی ... کیوں شاکرہ۔ انور نے جملہ ادھورا چھوڑ کر شاکرہ کو اپنے ساتھ ملانا چاہا۔شاکرہ مسکراتی رہی لیکن نجمہ نے انور کو دھمکی دی۔
اچھا یہ بات ہے۔آنے دو اپنے بھائی کو۔ بتاؤں گی انہیں سب کچھ۔ پھر جب ڈانٹ پڑے گی تب میری پناہ مت ڈھونڈنا، سمجھے۔اور انور گاؤ تکیہ چھوڑ کر کھسکتا ہوا نجمہ کے پاس آ گیا اس نے اپنا سر نجمہ کی گود میں رکھ دیا بالکل ایک چھوٹے سے بچے کی طرح۔ میری پناہ تو آپ ہیں ہی بھابھی۔انور کے لہجے میں بے پناہ پیار لاڈ اور بچوں کا سا بھولپن نمایاں تھا۔
سلینا اس چھیڑ چھاڑ، اس محبت اور اس رشتے سے بے حد محظوظ ہوئی۔
یہ مشترکہ خاندان کس قدر خوش گوار روائتیں رکھتا ہے اپنے اندر۔ مختلف رشتے سب ساتھ رہتے ہیں اپنے اپنے دائرے میں۔ بے پناہ محبت اور الفت کے ساتھ۔ سب ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ انہیں اہمیت دیتے ہیں۔ان کے بغیر اداس ہو جاتے ہیں۔ انہیں ہر لمحے سکھ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔اسے پھر اپنا ملک یاد آ گیا۔ جہاں لڑکیاں

شادی کرتی ہیں، اپنا الگ گھر بنالیتی ہیں۔ لڑکے شادی کرتے ہیں اور سارے رشتے ترک کردیتے ہیں۔ ماں باپ پرانے سامان کی طرح اپنے آپ کسی کونے میں جا بیٹھتے ہیں۔ انہیں حکمرانی تو بڑی بات ہے، گفتگو کا بھی حق نہیں ہوتا ہے۔ بھائی بھابھی اور بہن کا تصور مغرب میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا ہے۔ اس نے اپنی ماں کی زبانی اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کا تذکرہ کبھی نہیں سنا۔ بس وہاں کی عورت صرف اپنے شوہر کو جانتی اور مانتی ہے اور وہ بھی اس وقت تک جب تک کہ وہ اس سے ذہنی طور پر ہم آہنگی محسوس کرتی ہے اور جیسے ہی یہ احساس ہوجاتا ہے کہ اس کے اور اپنے خیالات میں ہم آہنگی نہیں ہے تو وہ بڑی صلح کے ساتھ ایک شام ہمیشہ کے لیے جدا ہوجاتے ہیں اور دوسری صبح سے ایک نئے شوہر اور نئی بیوی کی تلاش شروع ہوجاتی ہے۔

اس گھر میں رہ کر اسے اپنی معاشرت، اپنے ملک اور اپنی ماں سے نفرت اور بے گانگی کا احساس اور بھی بڑھ رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر مشرق کی ہر ادا پر مٹی جا رہی تھی۔ ہر لمحہ اس میں تشنگی اور محرومیت کا جذبہ شدید تر ہورہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس ماحول سے جوڑے رکھنا چاہتی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اسے احساس ہوجاتا کہ وہ صلیب کی بیٹی ہے اور صلیب کی بیٹی کا یہاں گزر کیسے ہوسکے گا۔ سلینا کا ذہن اسی تانے بانے میں الجھا ہوا تھا کہ نجمہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

سلینا تمہیں گانا آتا ہے۔ نجمہ نے البم شیلف میں رکھتے ہوئے سلینا سے سوال کیا۔

سلینا ایک دم اپنے خیالات سے رشتہ منقطع کرکے پھر سے انور، شاکرہ اور نجمہ کے درمیان آگئی۔

نہیں بھابھی کوئی خاص نہیں۔ سلینا نے کسرِ نفسی سے کام لیا۔

بھئی ہمیں تو بالکل ہی نہیں آتا ہے چلو جیسا بھی آتا ہے تم سنا ڈالو۔ نجمہ نے جیسے سلینا کو تیار کیا۔ اور دوسرے ہی لمحے انور لائبریری سے پرانا وائلن اٹھا لایا۔

بہت دن ہوگئے بھابھی میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

چلو سلینا تم گاؤ۔ میں وائلن بجاؤں گا۔ انور نے سلینا کو آمادہ کیا۔

شاکرہ نے بھی سلینا کو گھیر لیا۔ پلیز سلینا آج تو تم سنا ہی دو۔

سلینا بہ مشکل اس بات پر راضی ہوئی کہ وہ وائلن بجائے گی۔ گانا کوئی اور سنائے۔
اچھا تو تمہیں وائلن بجانا آتا ہے انور نے خوش ہو کر کہا۔
بس تھوڑا بہت۔ مجھے زندگی میں اتنا وقت مل بھی کب پایا کہ میں یہ سب کچھ سیکھتی سلینا نے نظریں نیچی کیے کیے اتنا ہی کہا۔ جیسے وہ کوئی اقرارِ جرم کر رہی ہے۔
کوئی بات نہیں تمہیں جیسا بھی آتا ہے بجاؤ ہمارا انور غزل سنائے گا۔ نجمہ نے انور سے کہا، ۔چلو شروع ہو جاؤ۔
انور نے وائلن سلینا کے آگے رکھ دیا اور خود گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔
مجھے تو غزل سوچنی پڑے گی مدت ہوگئی ایسی محفل جمی ہی نہیں۔
لندن بھاگنے کی تمہیں جو جلدی تھی ۔ یہاں ہم سب اتنے عرصے بور ہوتے رہے۔ نجمہ نے انور سے کہا۔
انور اسی لندن کے بارے میں سوچنے لگا میں نے وہاں سے پایا کیا۔ ہاں اپنی زندگی کا قیمتی وقت البتہ کھو دیا۔ اسے یہ تو یاد نہیں کہ یہاں آ کر اس نے اس تمام عرصے میں کیسی زندگی گزاری ہاں اسے یہ شعور ضرور ہو چکا تھا کہ اس تمام عرصے میں سلینا اس کے ساتھ ساتھ تھی اور تمام مشکل وقت اس نے اس کی ہم راہی میں گزارا ہے۔ کس قدر دشوار رہا ہوگا اس کے لیے سب کچھ برداشت کرنا۔ کبھی کبھی یہ سب کچھ سوچ کر وہ پریشان ہو جاتا تھا۔ وہ میبل سے سلینا کا تقابل کرنے لگتا۔ اور میبل کا تصور آتے ہی اس کے سارے بدن میں سوئیاں سی چبھنی شروع ہو جاتیں۔ وہ گزرے دنوں کی اذیت سے پریشان ہو جاتا۔ وہ کسے سناتا اپنا دردِ دل۔ کس سے صلاح لیتا کس سے پوچھتا کہ اس تمام واقعے میں اس کا کتنا قصور تھا۔ کون تھا جو اسے بتاتا کہ وہ جو کچھ بھی کر چکا ہے وہ قابلِ معافی ہے یا نہیں۔ ایسے بہت سے سوال تھے اس کے ذہن میں مگر وہ کسی کو بھی اپنے سے اتنا قریب نہیں پاتا۔ ہاں اکثر اب اس کا دل کسی اور طرح سے دھڑکنے لگا تھا۔ سلینا اس کے پاس ہوتی تب وہ چاہتا کہ سب کچھ اس سے کہہ دے۔ بتادے اسے کہ وہ کس جہنم سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ لیکن سلینا اس کی پہنچ سے بہت دور تھی۔ وہ اس کا ادب کر سکتا تھا۔ بے حد احترام کر سکتا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا جو وہ کہنا چاہتا ہے۔

نجمہ نے انور کو گم صم دیکھا۔
کیا بات ہے انور تم چپ کیوں ہو۔طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔ نجمہ پریشان ہوگئی انور اپنی سوچ سے باہر آ گیا۔
ہاں سلینا تم وائلن بجاؤ میں کوئی غزل سوچ لیتا ہوں اس عرصے میں انور نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو آزاد کیا اور نجمہ کا جی ٹھہر گیا۔
میں تو ڈر ہی گئی تھی۔
بھابھی آپ تو ایک ایک لمحے کو اپنی مٹھی میں کس کر پکڑ لیتی ہیں۔ہمیں تھوڑا آزاد بھی چھوڑیئے نا۔انور نے خوش دلی سے کہا۔
انور ہم پر ایسے برے لمحے گزرے ہیں کہ ڈر جاتے ہیں۔تم کیا جانو، نجمہ نے انور کی طرف محبت سے دیکھ کر کہا۔
سلینا یہ سارے مکالمے سنتی رہی اور دل کی بے چینی سے مجبور ہو کر اس کی انگلیاں وائلن کے تاروں کو چھیڑنے لگیں۔
اسے اپنے پیشے کے علاوہ صرف میوزک سے ہی دل چسپی تھی ۔لیکن جب سے وہ یہاں آئی تھی اس نے اپنا یہ شوق بھی پورا نہیں کیا تھا۔ بارہا اس نے وائلن لائبریری میں رکھا دیکھا تھا لیکن یہ جرأت وہ نہیں کرسکی کہ اسے بجائے۔ نہ جانے اس گھر میں اس کے اس فعل کو کیسا سمجھا جائے۔اور اس وقت وائلن پا کر وہ حقیقت میں بہت خوش ہوئی۔اور اسی خوشی میں اس نے ایک خوب صورت انگریزی دھن چھیڑ دی۔انور برابر اس کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں وہ اس کے فن کا معترف بھی تھا۔سلینا وائلن بجانے میں واقعی بے حد مہارت رکھتی تھی۔
دھن ختم ہوئی تو ہر ایک نے اس کی تعریف کی۔
بھئی واہ کمال کر دیا تم نے سلینا۔ نجمہ نے داد دی۔
ہمیں کیا معلوم تھا تم اتنا اچھا بجا لیتی ہو ورنہ ہم تو روز ہی سنتے۔شاکرہ نے بھی پسندیدگی کا اظہار کیا۔
لیکن انور۔وہ چپ تھا۔

کیوں انور، کیا تم اپنے سے اچھا وائلن بجاتے کسی اور کو برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ نجمہ نے انور کو چھیڑا۔

انور پھر بھی چپ رہا۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ سلینا جیسی خاموش لڑکی جو لباس اور اپنی ایک مختلف زندگی سے تعلق رکھتی ہو وہ اس فن کی ماہر ہو۔ اس نے پھر بھی کوئی تعریف نہیں کی بس اتنا ہی کہا کہ وہ غزل سنا رہا ہے۔

انور کی آواز میں جو درد تھا اس نے قابل اجمیری کی اس غزل میں رنگ بھر دیا اور ماحول پر سکوت طاری کر دیا۔

نئے چراغ لیے شامِ بے کسی آئی
کہ دل بجھا تو ستاروں میں روشنی آئی

انور کی آواز میں جو کرب تھا وہ بتا رہا تھا کہ یہ سب اس کی اپنی زندگی کی وہ ناکامیاں ہیں جو گزرے دنوں میں وہ بسر کر گیا ہے۔

ہمارے پاس کہاں آنسوؤں کی سوغاتیں
کسی کو اپنا بناتے بڑی ہنسی آئی

انور بے خود تھا اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ شاید یہاں اس محفل میں موجود ہی نہیں تھا وہ تو کہیں اور تھا۔

تمہاری یاد کو آرامِ جاں بنایا تھا
تمہاری یاد بھی لیکن کبھی کبھی آئی

سلینا ٹکٹکی باندھے انور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کو اس قدر محویت سے گاتے دیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں الفاظ پوری طرح اپنے مفہوم کے ساتھ تو نہیں آ رہے تھے لیکن آواز نے ماحول پر جو سکوت طاری کر دیا تھا اس سے سلینا پوری طرح متاثر اور آشنا تھی۔

ہزار رنگ دیے جس نے زندگانی کو
اسی نظر سے محبت میں سادگی آئی

سلینا پر پھر سے سوچ طاری ہو گئی۔

انور تم نے اپنی زندگی کے چند دن سنہرے گزلدے ہیں اس اخروٹ کی رنگت والے بالوں

جیسی لڑکی میبل کے ساتھ، مگر تم نے اپنے آپ پر کس قدر ظلم کیا ہے۔تم جو مشرق کے خوب صورت شہزادے ہو تمہیں تو تمہارے اردگرد تمہارے اپنے ہی ماحول میں حوریں مل سکتی تھیں مجھے تو رضوانہ کی قسمت پر افسوس ہو رہا ہے جو تمہاری تقدیر نہیں بن سکی۔ وہ نجمہ تمہاری کلاس فیلو جو تمہیں چاہتی تھی اور تم سے الگ ہو رہی۔ اور وہ درجنوں لڑکیاں جو کالج میں تمہاری گرویدہ ہوں گی۔ جیسی بھی تھیں میبل سے ہزار درجے باوفا ثابت ہوتیں۔ مگر تم جو تقدیر کے قائل ہوتے ہو۔ تجربات سے دامن بچاتے ہو اپنی تقدیر کے موتی آخر مغرب میں ڈھونڈنے کیوں نکل پڑتے ہو۔

انور علی۔ سلینا نے آنکھیں بند کر کے زیرِ لب کہا۔

ہم لوگ محبت بھی دماغ سے کرتے ہیں اور نفرت بھی مصلحتوں کے ساتھ۔ ہم جو لباسوں کی طرح محبوب بدلتے ہیں۔تم ہم سے وفا کی اتنی امیدیں کیوں باندھ لیتے ہو؟

انور نے سلینا کی جانب دیکھا اب کے وہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھی مگر زیرِ لب کچھ کہہ ضرور رہی تھی۔ شاید کچھ سوچ رہی ہو شدید بہت شدید۔ مگر کیا؟

انور کے ذہن میں یہ سوال گونجا۔ اور اس نے غزل مکمل کر دی۔

مرے خلوص کا عالم نہ پوچھیے قابلؔ
شکستِ جام سے آوازِ زندگی آئی

انور کی آواز میں بلا کا سوز تھا وہ بہت اچھا گاتا تھا۔ سب ہی معترف تھے۔ سلینا نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔ اور داد بھری نظروں سے انور کو دیکھا اور فراخ دلی سے تعریف کر دی۔ انور نے جھک جھک کر سب سے داد وصول کی۔ اسی وقت کمرے میں اطہر داخل ہوا اور بے شمار پیکٹ فرش پر بکھیر دیے۔ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھتے ہوئے انور کو مخاطب کیا۔

تو آپ لوگ یہاں محفل جمائے بیٹھے ہیں۔

بھائی جان سلینا وائلن بہت اچھا بجا لیتی ہے۔ شاکرہ نے اطلاع دی۔

اور میں جیسے گاتا اچھا نہیں۔ انور چہکا۔

اچھا سلینا تمہیں بجانا آتا ہے۔ کسی دن ہمیں بھی سنانا۔ اطہر نے پسندیدگی کی نظروں سے سلینا کو دیکھا۔

سلینا چپ چاپ نجمہ کے پیچھے سرک گئی۔
یہ لو انور میں نے تمہارے سوٹ سلوائے ہیں۔ جشن میں تم یہی سوٹ پہنو گے۔
انتخاب تمہارا ہوگا۔ جو بھی چاہو پہن لینا۔
اطہر نے بہت سارے پیکٹوں میں سے ایک پیکٹ انور کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور انور اسی وقت کھول کر خوشی خوشی دیکھنے لگا۔
فرسٹ کلاس بھائی جان۔ انور نے اپنی پسند کا اظہار کیا۔
تمہیں پسند آیا خوشی ہوئی۔ اطہر نے دوسرا پیکٹ نجمہ کی طرف پھینکا۔
یہ لیجیے سرکار آپ کے لیے ساڑھی۔
نجمہ نے گلابی رنگ کی نفیس کامدار ساڑھی پا کر محبت سے اطہر کی طرف دیکھا اسی وقت اس کا اپنا رنگ گلابی ہو رہا تھا۔
شکریہ وہ اسی قدر کہہ سکی۔
شکریہ آپ کا کہ آپ کو پسند آئی۔ اطہر نے محبت سے بھرپور نظریں اس پر ڈالیں نجمہ نے شرم سے نظریں جھکالیں۔
سلینا یہ سب تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بھلا کہاں جانتی تھی کہ کبھی کہیں ایسا بھی ہوتا ہے یہ کیسی دنیا ہے کہاں آ گئی میں۔ اور اب میں چلی بھی جاؤں گی۔ اس کے اندر سے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ کیا ٹوٹا وہ نہ جان سکی۔
اور بھئی میں شاکرہ کے لیے تو کچھ لانا ہی بھول گیا۔ اطہر نے اشتیاق بھری نظروں سے شاکرہ کی طرف دیکھ کر کہا۔
بڑے خراب ہیں بھائی جان آپ۔ ہمیشہ ہی ایسا کرتے ہیں۔ شاکرہ کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ پڑے۔
میں بھابھی کی ساڑھی چھین لوں گی۔ اس نے نجمہ کی طرف سرکتے ہوئے کہا ارے بھئی ایسے نہ کرنا۔ اطہر نے پیار سے شاکرہ کو منایا۔
بھلا میں اپنی چھوٹی سی بہن کے لیے کچھ لانا بھول سکتا ہوں۔
اطہر نے ایک پیکٹ شاکرہ کی گود میں ڈال دیا۔

اور وہ جلدی جلدی ساڑھی کھول کر جسم پر لگانے لگی۔
پہلے آنسو تو پوچھ لو۔ سارا کاجل بہہ کر نیلی ساڑھی کو کالے رنگ میں بدل دے گا۔
انور نے شاکرہ کو چھیڑا۔ مگر شاکرہ نے انور کا نوٹس نہیں لیا۔
ہائے اللہ کتنی خوب صورت ہے۔ بھابھی کی ساڑھی سے بھی زیادہ اچھی۔ شاکرہ خوشی سے بے حال ہوئی جارہی تھی۔
چل تجھے پسند تو آئی ورنہ ہمیشہ ہی ناک بھوں چڑھاتی ہے۔ اطہر خوش ہو کر بولا اور اس تمام عرصے میں سلینا اطہر کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی۔ ہر پیکٹ بڑھانے سے پہلے اس کے چہرے پر تعلقات کے مختلف جذبات اپنا رنگ چڑھا لیتے ہیں۔ انور کو سوٹ پکڑاتے ہوئے اطہر کے چہرے پر باپ کی ساری شفقت اُمنڈ آئی تھی اور اس لمحے سلینا کو اپنے باپ کی محرومی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ نجمہ کی طرف ساڑھی بڑھاتے ہوئے اس کی آنکھوں سے محبت کی جو بارش ہو رہی تھی اور نجمہ کی آنکھوں میں جو شرم اور خوشی سے آنسو آگئے تھے اور جسے اس نے اپنی پلکوں میں چھپالیا تھا سلینا کو دنیا کی سب سے قیمتی شے لگے۔ اور شاکرہ کے ساتھ بہن بھائی کی نوک جھونک سے وہ اس درجہ متاثر ہوئی کہ اسے یہ تمیز کرنے میں مشکل پیش آنے لگی کہ کون سا جذبہ زیادہ قیمتی اور کون سا کتنا گہرا ہے۔
اطہر پائپ میں تمبا کو بھرنے لگا اور نجمہ، انور، شاکرہ سب ہی بیک وقت سوچ رہے تھے آخر اطہر نے سلینا کو کیوں کر بھلا دیا۔
لیکن سلینا کے دل میں لمحے بھر کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ اطہر نے اسے یک سر نظر انداز کر دیا ہے۔ اسے ہر وقت یہ احساس رہتا کہ وہ نرس ہے۔ ان لوگوں کی ملازم۔ اپنی خدمات کا وہ معقول معاوضہ وصول کرتی ہے اور یہی نہیں بلکہ ان کی محبت میں بھی شریک رہتی ہے جو اس کی شرائطِ ملازمت میں کہیں بھی درج نہیں اطہر نے پائپ سلگانے کے بعد اپنی ٹانگ کے نیچے سے ایک ڈبہ نکالا۔
سلینا ادھر آؤ۔ یہ تمہارا ہے۔
سلینا ایک ناقابلِ یقین احساس لیے آگے کھسک آئی۔
اطہر نے ڈبہ سلینا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

شکریہ۔ اس نے ڈبہ کھولے بغیر اطہر کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھا نہیں بھئی یوں نہیں۔ اطہر نے کہا۔

پہلے ڈبہ کھولو پسند آئے تب شکریہ ادا کرو۔

سلینا نے آہستگی سے ڈبہ کھولا۔ کریم رنگ کی بنارسی ساڑھی دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی اتنی قیمتی چیز اور میرے لیے۔ یہ پہلا تحفہ تھا جو اسے کسی کی جانب سے ملا تھا اسے اسی لمحے ڈیوڈ یاد آیا۔ وہ اکیلا رشتہ تھا جس نے اسے آج تک بے شمار چیزیں دی تھیں۔ اس نے اپنی انگلی کی انگوٹھی کی طرف دیکھا۔ یہ بھی ڈیوڈ کا محبت بھرا تحفہ تھا اور وہ بندھن بھی جو اس نے اس کے ذریعہ اس کی زندگی سے باندھا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ڈیوڈ کے بے شمار تحفے وصول کر کے وہ اتنی خوش نہیں ہوئی تھی جتنی کہ آج اطہر سے بنارسی ساڑھی وصول کر کے خوشی محسوس کر رہی تھی۔ ڈیوڈ پر اس کا حق تھا۔ لیکن اطہر پر اس کا کیا حق ہے۔ آخر اطہر نے اس کے لیے وہ کون سا جذبہ محسوس کیا جو اس نے یہ قیمتی ساڑھی تحفتاً دی ہے۔

اس لمحے اطہر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

سلینا تم مجھے شاکرہ سے کم عزیز نہیں ہو۔ مجھے کبھی غیر نہیں سمجھنا۔ اور ہاں.. اس نے رکتے رکتے کہا۔

جشن میں تم یہی ساڑھی پہنوگی۔ مجھے اچھا لگے گا۔

اور سلینا نے تشکر سے پُر آنکھیں جھکا لیں۔ ہر چہرہ دمک رہا تھا۔ مگر سلینا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے آنسوؤں کو چھپا نہیں سکی۔

تھوڑی دیر سب ہی متاثر رہے۔ پھر اطہر نے بقیہ پیکٹ نجمہ کی طرف بڑھا دیے۔

یہ کچھ نوکروں کے کپڑے ہیں۔ بچوں کی چیزیں ہیں۔ بقیہ سامان کھانے پینے کا ہے گاڑی سے نکلوا لینا۔ کل کی تقریب، میں چاہتا ہوں شان دار ہو۔ کوئی کسر نہ رہ جائے۔ بچے بھی کل آجائیں گے۔ اس وقت رات زیادہ ہو گئی تھی انہیں ساتھ نہیں لا سکا۔ اطہر نے کہا۔

اس کے بعد ہی سب اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔

نجمہ نوکروں کو آواز دے رہی تھی اسے سارا سامان باورچی خانے میں رکھوانا تھا۔

اس رات سلینا دیر تک اپنا کمرا بند کر کے وائلن بجاتی رہی۔ اس کی آواز میں اپنے دل کی

دھڑکنوں کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ وہ اب تک کیسی زندگی جی رہی تھی اور دھیرے دھیرے اس کی زندگی بدلتی جارہی تھی۔ مگر اس تبدیلی سے وہ خوش نہیں تھی بلکہ خوف زدہ تھی۔ وہ راستہ جس پر انجانے میں وہ چل رہی تھی یا چلے جانے پر مجبور ہوگئی تھی اس کی منزل کوئی نہیں تھی۔ اور ایسا رستہ طویل تو ہوتا ہی ہے۔ دشوار بھی ہوتا ہے۔ وہ دیتا کچھ بھی نہیں زندگی کا رہا سہا سکون بھی چھین لیتا ہے۔ ایسے راستوں پر کوئی پیڑ نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو ایسا پیڑ جس کی کوئی چھاؤں نہیں ہوتی ہے۔ ستانے کے لیے چھاؤں تو سب ہی کو چاہیے ہوتی ہے مگر یہ ہرایک کی تقدیر ہوتی بھی نہیں۔ اور پھر میری تقدیر۔ سلینا نے ایک بھرپور سسکی کے ساتھ سوچا تقدیر بنانے والے نے اس کی تقدیر تو بنائی ہی نہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ خالق اپنی تخلیق کو بناتے بناتے ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔ شاید اس کے خالق نے بھی ایسے ہی کسی لمحے میں اکتا کر اسے ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ زندگی میں راستہ ہے تو منزل نہیں۔ منزل نظر بھی آرہی ہو تو سراب کی مانند قریب جاؤ تو دور ہوجاتی ہے۔ دور تک جاؤ تو غائب ہوجاتی ہے۔ ہاتھ میں ایک سرا آتا ہے تو دوسرا گم ہوجاتا ہے۔ وہ مکمل طور پر ادھوری ہے۔ آخر میں تھک کر اس نے بس یہی نتیجہ نکالا کہ اس کے بنانے والے کو بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہوگی جب ہی تو بناتے بناتے نامکمل چھوڑ دیا۔

انور اس رات اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اس کے پاس سب کچھ تھا راستہ بھی اور نظر آنے والی منزل بھی۔ مگر وہ اپنے پاؤں شل کر چکا تھا۔ وہ چل ہی نہیں پاتا تھا۔ باوجود کوشش کے اس کے پاؤں آگے کے لیے اٹھتے ہی نہ تھے۔ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ۔ ہاں، ماضی اب اسے یاد آچکا تھا۔ وہ اپنی منزل پانے سے پہلے بھٹک چکا تھا۔ زندگی میں ایک ہی سیدھا سچا راستہ ہوتا ہے۔ ایک ہی منزل دل کے قریب ہوتی ہے۔ اگر وہ سراب ثابت ہوجائے تب پاؤں شل ہوجاتے ہیں راستے طے ہی نہیں ہوتے۔ منزل نظر بھی آتی ہے تو منہ چڑاتی محسوس ہوتی ہے۔

انور سگریٹ پھونکتے ہوئے دور سے آتی وائلن کی آواز سن رہا تھا۔ یہ کوئی ایسی خاموش دھن تھی جو کسی مردے کے سرہانے بیٹھ کر بجائی جارہی ہو۔ ہاں وہ زندہ ہی کب تھا؟

۲۳

.....میں ایک گُم کردۂ راہ مسافر ہوں اور آج مجھے زندگی کے سفر میں اپنا جانا پہچانا ہم مذاق مل گیا ہے... اُس کے دل نے جیسے سرگوشی کی...

سب لوگ تیار ہو کر ایک جگہ جمع ہو چکے تھے لیکن سلینا ابھی تک تیار نہیں ہو پائی تھی۔ وہ اپنی تیاری کی عادی ہی نہ تھی۔ بچپن اس کے حافظے سے مٹ چکا تھا۔ ماں کیسی ہوتی ہے۔ اپنے بچے کو وہ کیسے تیار کرتی ہے۔ وہ کن نظروں سے دیکھتی ہے اس کے دل کی دھڑکن کیسی ہوتی ہے وہ اپنے بچے کو بانہوں میں بھینچ کر خوشی اور فخر کے آنسو بہاتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ کیسے جان پاتی۔ اسی لیے شاید بے نور دنوں کو یاد رکھنا اس نے ضروری ہی نہیں سمجھا وہ سب کچھ بھلا چکی تھی۔ پھر ہوش سنبھالتے ہی اس نے مشنری اداروں کے مخصوص لباس کے علاوہ کچھ پہنا ہی نہ تھا۔ نرسنگ کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد تو موٹے کھدر کی لال کناری والی ساڑھی اس کا مستقل لباس بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے بدن نے کبھی جانا ہی نہیں، رنگ کیا ہوتا ہے۔ لباس کی تراش خراش میں زمانہ کیسا گندھا ہوا ہوتا ہے۔ زیور میں سیاہ آبنوس کی صلیب اس کے گلے میں لٹکی رہتی وہ ادھر اُدھر نظر دوڑاتی تب اسے سونے کی باریک چین گلے میں چپکی چمک دمک رہی ملتی اور پہننے والی فخر اور غرور سے بار بار اس نازک احساس سے سرشار ہوتی جیسے جگنو نے مستقل طور پر اس کے گلے میں لٹکنا قبول کر لیا ہے۔ جہاں تک میک اپ کا تعلق تھا پاؤڈر کے علاوہ وہ کسی چیز کا استعمال تک

نہیں جانتی تھی۔ اس نے بارہا اپنے مریض کو بخار میں جلتے دیکھا تھا مگر آنکھوں میں کاجل کی لکیر ضرور موجود ہوتی۔ اس نے پپڑی زدہ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگی دیکھی تھی جو اس کے تیماردار مارے محبت کے لگا دیتے۔ مگر اس کے ہونٹوں نے کسی لالی کو کبھی نہیں اپنایا تھا۔ تھی نہ وہ ادھوری پھر بھلا وہ یوں کیوں نہ سوچتی۔ کبھی کبھی تو وہ خدا سے شکوہ بھی کر بیٹھتی اور یہ سب احساس اسے یہاں آ کر ہوا تھا۔ وہ محسوس کرتی کہ جیسے آج سے پہلے، یہاں آنے سے پہلے بس وہ آنکھیں بند کیے سوتی رہی تھی اور اب جاگ گئی ہے وہ کھلی آنکھوں سے ارد گرد سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ان تمام چیزوں کو ان لوازمات کو جنہیں وہ منٹوں میں حاصل کرسکتی تھی اور لمحوں میں استعمال کرسکتی تھی مگر وہ منٹ اور وہ لمحے اس سے دور دور ہی رہے۔ وہ بس ادھوری ہی رہی ایک ادھوری عورت۔ بس صرف ایک مکمل نرس جس کے گلے میں صلیب لٹک رہی ہے وہی اس کا زیور ہے اور وہی اس کی پہچان ہے۔ وہ عورت ہے یا نہیں، اس سے کیا ہوتا ہے؟ آج بنارسی ساڑھی اور ہلکا پھلکا چمکتا دمکتا نیکلس کانوں کے ٹاپس اور نازک سے نگینوں سے سجی انگوٹھی اس کے کمرے میں اس کی ملکیت بنی رکھی تھی وہ انہیں استعمال کرے تو کیوں کر؟ اسے بہر حال ساڑھی پہننی تھی کہ یہ اطہر کی خوشی کا سوال تھا مگر وہ بار بار کی کوشش کے باوجود اس ساڑھی پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ یہ ساڑھی اتنی چکنی اور پتلی تھی کہ بار بار اس کے کولہوں پر سے پھسل پھسل کر اس کو پریشان کر رہی تھی۔ وہ ہر بار اسے اپنے جسم پر لپیٹنے کی کوشش کرتی اور ساتھ ہی ساتھ دعا بھی کرتی جاتی کہ نجمہ یا شاکرہ آجائیں اور اس کی مشکل آسان ہو جائے۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور وہ اس طرح جیسے کوئی منہ مانگی مراد مل گئی ہو دروازے کی طرف لپکی مگر دوسرے ہی لمحے ساڑھی کا پلّو چکنی مچھلی کی طرح اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ اس کے سامنے انور کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے سلینا کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دل اب دھڑکنا بند کر دے گا۔ اور شاید اس کے دل کی دھڑکن بند ہوگئی تھی کہ اس کی آنکھیں ساکت ہوگئیں۔ ہاتھ جہاں تھے وہیں جم سے گئے۔ اس کے بڑھے ہوئے قدم اور آگے بڑھنا بھول گئے۔ وہ بھلا زندہ ہی کہاں تھی۔ بس اتنا ہی ہو پایا تھا کہ مرجانے سے پہلے اس نے ساڑھی اپنے گرد بے دردی سے لپیٹ لی تھی کہ ساڑھی بھی اپنی بے وقعتی

پر کڑھ کر رہ گئی۔
ہاں انور مبہوت تھا۔ آج اس کے سامنے کوئی اور سلینا کھڑی تھی وہ آج تک صرف اس کی خدمات کا معترف تھا اور لال کناری والی موٹی کھدر کی ساڑھی اس کے تعارف سے اسے خاصا دُور رکھ رہی تھی لیکن آج ریشمی چمک دار بارڈر والی ساڑھی نے جیسے اس کا تمام تر تعارف لمحے بھر میں کرادیا وہ تو اس کے حُسن سے بھی مسحور ہو چکا تھا۔ اب رہ کیا گیا تھا اس کے سینے میں سب کچھ تو چھلک کر اس کے قدموں میں نچھاور ہو چکا تھا۔ یہ ایک لمحہ، یہ ایک کیسا لمحہ تھا۔ سلینا اس کے سارے وجود میں رچ بس گئی اور اس کے دل نے بڑی رازداری کے ساتھ سرگوشی کی۔ انور علی آج تمہیں زندگی کے سفر نے ایک ہم مذاق اور پسندیدہ مسافر دے دیا ہے۔ لو گزار لو اب زندگی سکون کے ساتھ۔ محبت کے ساتھ۔ وہ شدتِ جذبات سے گونگا ہو چکا تھا مگر وہ تو چاہتا تھا کہ ایک سرگوشی میں وہ یہ سب کچھ سلینا سے بھی کہہ دے۔ وہ اپنی عقیدت کا اظہار کردے۔ وہ اس لمحے کو بالکل بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا وہ الفاظ پر گرفت تو کھو چکا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے کوٹ کے کالر میں لگی ہوئی گلاب کی کلی کو سلینا کے بالوں میں کہیں اٹکا دیا۔ الفاظ نہ ہوں تو کیا حرکات کا سہارا نہیں لیا جاسکتا کیا خاموشی کوئی زبان نہیں رکھتی؟ انور یہ سوچ رہا تھا اور سلینا تڑپ اٹھی۔
یہ کیا کرتے ہو انور؟ اور ساڑھی کا پلو ایک بار پھر پھسل گیا۔ ہاتھوں کی گرفت کمزور جو پڑ چکی تھی۔ دل کی دھڑکن بہت تیز تھی۔ اتنی تیز کہ وہ مریض کی نبض پر ہاتھ رکھتی، تب بھی دھڑکن اپنی ہی سنتی۔
یہ میرا اظہارِ عقیدت ہے سلینا۔ انور نے یہ جملہ تھوک نگل نگل کر ادا کیا۔
کوئی مہذّب طریقہ نہیں ہے تمہارے پاس۔ سلینا کی آواز میں خفگی تھی۔
تمہارے ساتھ میں غیر مہذّب نہیں ہوسکتا سلینا۔ اس سے زیادہ مہذّب طریقہ میں اور کیا استعمال کرسکتا تھا۔ انور کی آواز میں کپکپی تھی۔
چلو جلدی سے چلو۔ سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ سلینا کے چہرے پر خفگی کے آثار دیکھ کر انور نے جلدی سے بات بدلی۔ وہ شاید اب اپنے پاؤں پر کھڑا رہ بھی نہیں سکتا تھا۔

ایسے موقعوں پر یہ پاؤں ساتھ کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟ اس نے سوال کیا۔
تم چلو۔ میں آتی ہوں۔ سلینا بدستور خفا تھی۔
میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر چلوں گا۔ انور ڈٹ گیا۔ وہ مرد جو تھا۔
اور پھر سلینا نے جلدی جلدی ساڑھی کے پلّو کو شانوں پر لپیٹ کر ننھا سا بروچ لگا دیا۔ اور آئینے میں ایک بار اپنا جائزہ لینے کے لیے آگے بڑھی تو اسے اپنے پیچھے ہی ایک اور سایہ محسوس ہوا۔ انور کا سایہ۔ وہ جلدی سے پلٹی دونوں آمنے سامنے تھے۔
اب اتنی بھی جلدی نہیں وہ سب کچھ بھی تو پہن لو۔ اس نے میز پر رکھے زیور کی طرف اشارہ کیا۔
سلینا نے جلدی سے لاکٹ گلے میں ڈالا۔ آج پہلی بار صلیب کی جگہ اس لاکٹ نے لے لی تھی۔ کانوں میں ٹاپس اٹکائے اور انگوٹھی پہنتے پہنتے وہ کمرے سے نکل پڑی۔ وہ چاہتی تھی کہ انور آگے نکل جائے یا وہ خود اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جائے مگر انور برابر اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔ یہ ایک اکیلا لمحہ تھا سلینا کی زندگی میں، جب اس نے پہلی بار حیا محسوس کی۔ اس کی گردن شرم سے جھکی جا رہی تھی اور انور اس قدر اعتماد کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔
دونوں چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو سب کی نظریں ایک ساتھ اٹھ گئیں۔ اور سلینا ان سب کی نظروں کی گرمی سے پگھل گئی۔ اور قریب تھا کہ ڈھیر ہو جاتی، نجمہ نے اسے سنبھال لیا۔
آہا سلینا تم کس قدر جچ رہی ہو۔
اور شاکرہ کے ذہن میں نہ جانے کیسے ایک دم سے یہ خیال آ گیا۔
انور بھائی اور سلینا کی جوڑی کس قدر شان دار ہو سکتی ہے۔ وہ دیر تک اپنے اسی اچانک آ جانے والے خیال میں کھوئی رہی۔
سلینا، نجمہ کے برابر بیٹھ گئی۔ ریشمی ساڑھی نے آج اس کا سارا اعتماد چھین لیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ بے حد نروس ہو رہی تھی۔
مہمانوں میں ڈاکٹر بھی مدعو تھا۔ اطہر کے دونوں بچے بھی صبح صبح ہوسٹل سے آ چکے تھے اور

اس وقت ایک اطہر کے دائیں اور دوسرا بائیں بیٹھا تھا۔ اطہر کے چہرے سے خوشیاں عیاں تھیں۔ انور صحت یاب جو ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر نے گفتگو کی ابتدا کی۔

بھئی انور میاں تم نے ہم سب کو بے حد تھکا دیا۔ چلو اس جرم میں اپنی سزا خود ہی تجویز کرو۔

جو سزا آپ لوگ دینا چاہیں دے دیں۔ مجھے منظور ہوگی۔ انور اپنے خیالوں میں مگن تھا اس کے سامنے سلینا بیٹھی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے اس کا ساتھ مل جائے تب تو وہ دنیا کے ہر کٹھن مسئلے کو حل کر سکتا ہے۔ اور کڑی سے کڑی آزمائش سے گزر سکتا ہے۔

سزا تو میں دوں گی انور کو۔ نجمہ نے انور کو خبردار کیا۔

اوہ بھابھی۔ آپ کی سزا تو آپ ہی کی طرح خوب صورت ہوگی۔ انور نے نجمہ کے برابر بیٹھی ہوئی سلینا پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ تو تمہیں معلوم ہو ہی جائے گا مسٹر۔ نجمہ نے جیسے کسی بڑی ہی سزا کی طرف اشارہ کیا۔

امّی۔ انکل ہوم ورک نہیں کرتے کیا جو انہیں سزا ملے گی۔ نجمہ کے چھوٹے بیٹے افسر نے معصومیت سے پوچھا۔

سب ہی ہنس دیے۔

بیٹے۔ تمہارے انکل بہت خراب ہو گئے ہیں۔ کچھ بھی کام نہیں کرتے۔ سارا کام دوسروں سے کراتے ہیں۔ اسی لیے انہیں سزا دی جا رہی ہے۔

نجمہ نے بات آگے بڑھائی۔

امّی میں تو اپنا ہوم ورک بھی خود کرتا ہوں اور اپنے تمام کام بھی خود ہی کرتا ہوں جب کہ میں انکل سے اتنا چھوٹا ہوں۔

افسر انور کے برابر آ کر اپنے کو انور کے قد سے ناپنے لگا۔

شیطان۔ تو میرے خلاف بولتا ہے۔ ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔ اور انور نے افسر کو اپنی گود میں بٹھا کر اس کے کان اینٹھنے شروع کر دیے۔

اور اسی لمحے ندیم، اطہر سے مخاطب تھا۔

ابو یہ آنٹی ہیں! اس کا اشارہ سلینا کی طرف تھا۔
ہاں بیٹے یہ بھی شاکرہ آنٹی کی طرح تمہاری آنٹی ہی ہیں۔
اطہر نے بیٹے کو سمجھایا۔
ابو یہ آنٹی کتنی پیاری ہیں۔ کیا یہ دُلھن ہیں؟
سلینا کی جھکی جھکی نظروں سے اس معصوم نے یہی اندازہ لگایا۔
انور نے افسر کے کان میں کچھ کہا۔
ابو کیا یہ انکل کی دلھن ہیں؟ افسر نے باپ کو مخاطب کیا۔
تھوڑی دیر کے لیے سب ہی افسر کے سوال سے پریشان ہو گئے۔ انور اپنی چال پر مسکرا رہا تھا اور سلینا کا سر اور بھی جھک گیا۔
نہیں بیٹے یہ دلھن نہیں تمہاری آنٹی ہیں۔ جاؤ ان کے پاس اور ان سے باتیں کرو۔ اور ندیم ہچکچاتا ہوا نجمہ کے پہلو میں آ بیٹھا۔ اس کی نظریں اب بھی جھکی جھکی سلینا پر تھیں۔
افسر انور کی گود سے نہیں اترا۔ انور نے پھر افسر کے کان میں کچھ کہا۔
امی اب یہ آنٹی یہیں رہا کریں گی نا۔ اس نے نجمہ سے سوال کیا۔
تم کیا چاہتے ہو بیٹے۔ نجمہ نے الٹا افسر سے سوال کر دیا۔
ہم تو چاہتے ہیں یہ آنٹی کہیں بھی نہیں جائیں۔ بس یہیں رہیں۔ کتنی پیاری ہیں نا۔ ندیم نے شوق سے سلینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
ہاں ہاں بیٹے یہ یہیں رہتی ہیں۔ اطہر نے اپنے بیٹے کو مطمئن کر دیا لیکن اس کے لہجے سے صاف عیاں تھا کہ وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ سلینا بس اب کہیں نہ جائے۔ اور اس گھر کا حصّہ بن جائے۔ جب کہ اس کے لہجے میں یہ حقیقت بھی پنہاں تھی کہ سلینا کبھی بھی کسی بھی وقت یہاں سے جا سکتی ہے اور اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ اسے روک سکے۔
سلینا نے اطہر کے لہجے میں چھپی ہوئی محبت کو بھرپور طریقے سے محسوس کیا۔
یہ آدمی کس قدر پر خلوص ہے۔ اسے اس گھر میں اطہر سب سے زیادہ پسند تھا۔ اسے اس ایک شخص میں زندگی بھر کے سارے رشتے چھپے محسوس ہوتے۔ وہ باپ بھی تھا۔ بھائی بھی دوست بھی۔ کاش وہ اس کا اپنا باپ ہوتا۔ اپنا بھائی ہوتا اور اپنا پیارا سا دوست ہوتا جس

کے پاس بیٹھ کر وہ اپنی زندگی کی ساری الجھنیں بیان کر دیتی۔ اسے اپنے سارے دکھ ساری خوشیاں دے کر مطمئن ہو جاتی۔

کیا دنیا بھر کے بے شمار لوگوں میں سے اسے صرف یہ شخص میسر نہیں آ سکتا؟ اس نے نہ جانے اپنے آپ سے یہ سوال کیا یا اپنے اللہ سے۔ مگر جواب تو اسے دونوں جگہ سے ہی نہیں ملا۔ اس کے چہرے پر اب سائے سے دوڑنے لگے۔ خوشی کی اس محفل میں جو شاید انور کے لیے نہیں خود اس کے لیے سجائی گئی تھی۔ اس کی محنت۔ اس کے خلوص اس کی کوششوں کی کتنی ہی بار پذیرائی کی گئی تھی۔ کتنی ہی بار یہ بات دہرائی گئی تھی کہ انور کی صحت یابی میں اللہ کے بعد سلینا کا ہاتھ ہے۔ وہ ان سب کی ہر ہر بار مشکور ہو جاتی۔ دل میں ان کے لیے ڈھیروں ڈھیر پیار محسوس کرتی اور جب ان کی محبت کی مقدار حد سے بڑھ جاتی تب وہ سوچتی کہاں رکھتی پھرے گی ان کا پیار؟

وہ تو اب کسی اور مریض کی نرس بننے کی قابل ہی نہیں رہی۔ اس نے جیسے اپنا مقصدِ حیات ہی پالیا ہو۔ وہ اکثر بے خیالی میں یہ سوچنے لگتی کہ وہ اطہر کے بازوؤں میں سمٹ کر اتنا روئے کہ اس کا سارا ماضی ۔ ماضی کی ساری تلخیاں اور محرومیاں مٹ جائیں۔ اس کے آنسوؤں کے سمندر میں وہ سب کی سب بہہ جائیں۔ اور وہ ایک نئی سلینا بن جائے۔ ایک نئی زندگی جینے لگے۔ لیکن یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا نہ بازوؤں میں سمٹنا نہ آنسوؤں میں محرومیوں کا بہہ جانا۔ نہ سلینا کو نئی زندگی کا ملنا۔ کہ یہ سب ملنا بھلا آسان کہاں تھا۔ یہ تمام باتیں اگرچہ بن مول تھیں لیکن پھر بھی سلینا کے پاس انہیں خریدتے کے لیے وہ کچھ نہیں تھا جو بن مول ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ چکانا ہوتا ہے۔ اس لمحے بھر میں سلینا کے چہرے کی سرخی غائب ہوگئی۔ اس کے گلے کے نیکلس نے چمکنا بند کر دیا۔ اس کی انگلی میں پڑی انگوٹھی کا نگینہ ماند ہوگیا۔ اور چکنی نرم ملائم ساڑھی سخت کھردری اور اس کے جسم کو کھرچنے والی بن گئی۔

سلینا تمہارا نصیب کچھ اور لکھا جا چکا ہے بس اس صفحے کو پڑھنا سیکھو اور اب کسی اور سادہ ورق پر کچھ لکھنے کی کوشش نہ کرو۔

کسی نے اسے ہدایت دی۔ وہ شخص بڑا بے رحم تھا جو اس سے کرخت آواز میں یہ کچھ کہہ رہا

تھا۔ اس کی آواز چیخ بن کر اس کے کانوں میں سیسہ اگل رہی تھی۔ اور وہ مجبور تھی اس آواز کو سننے پر وہ مجبور تھی لکھے ہوئے اس صفحے کو پڑھنے پر اور وہ بس بالکل ہی بے بس تھی کہ اس نے اس سادہ ورق کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جس پر وہ ایک نئی تحریر۔ ایک نئی کہانی خود لکھنا چاہتی تھی۔ اپنے لیے صرف اپنے لیے۔ انور کی نظریں مسلسل سلینا پر جمی ہوئی تھیں وہ اس کے چہرے کے ہر بدلتے رنگ کو پڑھ رہا تھا۔ وہ اتنا بے بس نہیں تھا کہ بس بیٹھا اس صفحے کو پرزہ پرزہ ہوتے دیکھتا رہے لیکن وہ اکیلا کچھ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اسے تو سلینا کا ساتھ چاہیے تھا۔ مگر وہ سمجھ رہا تھا کہ سلینا کے لیے اس وقت صرف کوئی بھی ایک راستہ چُن لینا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کا مذہب اس کی معاشرت اور جانے اور بھی کیا کچھ اس کے پاؤں کی زنجیر ہوں گی۔ وہ سلینا کو ابھی اور وقت دینا چاہتا تھا۔ وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ یہ بات وہ جان چکا تھا۔ مگر اس حقیقت کی آگاہی دل میں صرف پھول ہی نہیں کھلاتی گلستان میں آگ بھی لگا دیا کرتی ہے۔ اسے یہ بھی تو معلوم تھا۔

اس نے ماحول کو یک سر بدلنا چاہا۔

چل شکو کی بچی بیٹھی مکھی مار رہی ہے، مجھے ایک پیالی چائے تو پلا دے۔

انور نے بلاوجہ ہی شاکرہ کو ڈانٹ پلائی۔

چلو بھئی سب ہی میز پر چلتے ہیں۔ دیکھتے ہیں آج ہماری بیگم صاحبہ نے کیا کچھ تیاری کی ہے۔ اطہر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی سب اٹھ کھڑے ہوئے سلینا ساڑھی سنبھالتی ہوئی مشکل سے کھڑی ہوئی انور نے مدد کے لیے ہاتھ تو بڑھا دیا تھا لیکن اس کے ہاتھ اور سلینا کے درمیان فاصلہ باقی ہی رہ گیا۔

آج سلینا پرانی سلینا تھی ہی نہیں۔ بے حد گھبرائی اور اعتماد کے بغیر سلینا کوئی اور ہی تھی۔ آج وہ اچانک اپنے آپ کو یہاں مہمان سمجھنے لگی تھی اور اس نے تکلف کو اپنا لیا تھا۔ حالاں کہ یہ وہی گھر تھا جہاں وہ بے فکری کے ساتھ ایک سے دوسرے کمرے میں چکر لگا یا کرتی۔ مگر شاید آج لباس کی تبدیلی اور اچانک انور کی ذہنی تبدیلی نے اسے نروس کر رکھا تھا۔ ساڑھی کا پلو اس نے اپنے اردگرد لپیٹ لیا۔

بھئی سلینا تم یہ کیا کر رہی ہو۔ نجمہ نے سلینا کو پلو بے دردی سے لپیٹتے ہوئے دیکھ کر کہا

آگے پڑا ہوا پلو اس نے پیچھے سرکا دیا۔
بس یوں ٹھیک ہے۔ دیکھو میں نے اور شاکرہ نے بھی تو یوں ہی پہنا ہوا ہے۔
اور سلینا چھوئی موئی بن گئی۔
بھابھی مجھ سے تو یہ ساڑھی سنبھلتی ہی نہیں۔ میں جا رہی ہوں کپڑے تبدیل کرنے۔
ہرگز نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں اس وقت تم کیا غضب ڈھا رہی ہو۔ تھوڑی دیر تو ہم لوگوں کو دیکھ لینے دو۔ ورنہ کھدر کی ساڑھی میں تمہیں دیکھتے دیکھتے تو ہماری آنکھیں دُکھ گئیں۔
اس لباس کو برا نہ کہیے بھابھی۔ وہی تو میرا پیشہ بھی ہے اور مستقل لباس بھی۔
ہر لباس اپنے وقت پر اچھا لگتا ہے۔ اس وقت تم ڈیوٹی پر نہیں ہو۔ اور نجمہ سلینا کا ہاتھ پکڑ کر قدرے کھینچتے ہوئے ڈائنگ روم سے باہر لے آئی۔
یہی بات تو سلینا کو نروس کر رہی تھی کہ وہ اس وقت ڈیوٹی پر نہیں ہے۔
سب لوگ کھانے کی میز کے گرد تھے۔ ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ اس گھر کا سوگوار ماحول یک سر تبدیل ہو چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ انور اس گھر کے اندر ہی نہیں گھر کے باہر بھی سارا ماحول بدلنے کی قوت رکھتا ہے۔ ایک اکیلا وہ سب کو خوش کر سکتا ہے یا سب کو دکھ دے سکتا ہے۔
اس نے انور کی اس بے پناہ قوت کا اندازہ منٹوں میں لگا لیا تھا۔ اس کے ذہن میں پھر یہ سوال اٹھنے لگا۔
کیسے ہیں یہ لوگ۔ کیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے اس قدر جڑے ہیں کہ چوٹ ایک کو لگتی ہے درد سب محسوس کرتے ہیں۔ یہ کیسی ان ہونی دنیا ہے۔ اس کے دل نے مچل کر ایک سوال سلینا ہی سے کر دیا۔
بھلا تم کیوں نہیں اس دنیا کو برت سکتیں؟
سلینا کے پاس اس سوال کا جواب بھی کہاں تھا۔ وہ بے حد الجھ گئی۔ اور چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے الٹ گئی۔ ساڑھی پر ایک بدنما سی لکیر کھینچ گئی۔ انور تو اس کے ارد گرد ہی تھا۔
کوئی بات نہیں اس نے جیب سے رومال نکال کر اس کی ساڑھی پر لگا دھبّا مٹانا چاہا۔ وہ دور ہو گئی۔ دھبّے لگ جاتے ہیں، پھر مٹتے نہیں۔ اس نے آپ ہی آپ سوچا اور دوسرا کپ لینے آگے بڑھ گئی۔

شاکرہ نے فوراً ہی دوسرا کپ سلینا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔
لوسلینا تم یہ پی لو میں انور بھائی کے لیے اور چائے بناتی ہوں۔ اور چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے شاکرہ شوخی سے بولی۔
دیکھ لیجیے انور بھائی کہیں میں نے اس میں زہر تو نہیں ملا دیا ہے۔ سب ایک ساتھ ہنس پڑے۔
چُپ شیطان۔ انور نے شاکرہ کے سر پر ایک چپت لگائی اور چائے لے کر وہ سلینا کی طرف کھسک آیا۔
دیکھیے اس چائے میں زہر تو نہیں ہے۔ وہ سلینا پر جھک گیا اور سرگوشی میں بولا۔
چپ چاپ پی جاؤ۔ سلینا نے جلدی سے پیچھا چھڑایا۔
آپ کا حکم ہے تو زہر بھی پینے سے انکار نہیں۔ اور انور نے دوسرے ہی لمحے پیالی خالی کردی۔
سلینا کو اس کی سعادت مندی پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔
ہاں تو انور صاحب اب آپ کو ڈریکولا تو نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر نے بھی انور کو چھیڑا یوں کہیے آپ لوگ مل کر مجھ سے بدلہ لے رہے ہیں۔ اور یہ تقریب اسی تقریب میں ہے۔ انور جھینپ رہا تھا۔
اور ہاں وہ تمہارے سیارے کا کیا ہوا۔ فضا تک پہنچا یا نہیں۔ نجمہ نے انور کو مزید چھیڑا بھابھی، انور مسلسل جھینپ رہا تھا۔
انور بھائی وہ تجربہ گاہ۔ شاکرہ نے پھونس کی چھپر والی تجربہ گاہ یاد دلائی۔
تو پھر بولی۔ انور کا بس صرف شاکرہ پر چلتا تھا۔
اور شاکرہ انور کے متوقع عتاب سے بچتی ہوئی سلینا کے پیچھے چھپ گئی۔
سب لوگ مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔ انور نے کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔
اجی بس ابھی سے گھبرا گئے۔ نجمہ نے یوں کہا جیسے انور کو تنگ کرنے کے لیے ابھی اس کے پاس بہت کچھ ہے۔
اس تمام عرصے میں اطہر اور سلینا دونوں خاموش تھے۔ دونوں کے جذبات الگ الگ بھی تھے اور یکساں بھی۔

اطہر سلینا کی خدمات کا معترف تھا اور اس تمام چھیڑ چھاڑ کے دوران وہ برابر گزرے ہوئے دنوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ لمحے جو اس گھر پر بھاری تھے۔ وہ لمحے جو انور پر بھاری تھے اور ان لمحوں کی باگ ڈور سلینا کے ہاتھ میں تھی۔ اور سلینا نے ان لمحوں کی تلخی کو اپنی کڑی محنت سے خوش گوار بنا دیا تھا۔ ورنہ آج کا دن اس گھر میں شاید کبھی نہ آتا۔ وہ قدرت سے کبھی مایوس نہیں ہوا تھا لیکن قدرت کی ایک بڑی فیاضی وہ سلینا کی ذات کو بھی سمجھتا تھا۔ اور بغیر سلینا کی دن رات مشقت کے انور کی دیوانگی کا دُور ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

سلینا بھی اس وقت انور کے بارے ہی میں سوچ رہی تھی۔ انور جو اس کا شاہ کار تھا۔ اسے ایک مخبوط الحواس نوجوان کی صورت میں ملا تھا۔ اور اس کی ساری تراش خراش خود اس کے ذمے تھی۔ اس نے اپنے اس پیشے میں آنے کے بعد اس سے کڑا امتحان کوئی اور نہیں دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ چھوٹے موٹے امتحان پاس کرتی رہی تھی۔ اور اپنے خلوص کو فیاضانہ ہر ایک پر نچھاور کر کے قدرت سے اس کی صحت مول لیتی رہی تھی۔ لیکن یہ کڑا امتحان اس کی کڑی آزمایش تھی اور اس آزمایش میں وہ پوری اتری تھی۔ اسے اپنی کامیابی پر بے حد خوشی تھی۔ لیکن آج اس کے جذبات میں ملاوٹ تھی۔ بلاشبہ خوشی کا عنصر سب سے زیادہ تھا۔ لیکن کچھ اور بھی عناصر تھے جو اس کے جذبات میں رچے بسے جا رہے تھے۔ شاہ کار اس کے سامنے تھا لیکن اسے دیکھ کر آج وہ خوف زدہ بھی تھی۔ آج اسے کچھ کچھ تکلف محسوس ہو رہا تھا۔ عجیب گھبراہٹ بھی اس پر طاری تھی۔ ہنسی مذاق۔ قہقہے، برتنوں کی آواز سب ہی خوشی کی آوازیں تھیں مگر وہ پھر بھی گم صم تھی۔ یہ تو طے تھا کہ آج کی سلینا کوئی نئی سلینا تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اپنے سر کو ٹٹولا۔ ایک کلی اس میں اب تک اٹکی ہوئی تھی اسے وہ کلی کچھ بولتی محسوس ہوئی۔ جلدی سے اس نے بالوں سے اسے نکال لیا۔ یہ تو کھلا اعلان تھا۔ کوئی پوچھ لیتا تب وہ کیا جواب دیتی۔ اچانک اسی شور و غل میں اطہر کی آواز ابھری۔

آج سے پہلے بھی میں بارہا سلینا کی خدمات کا اعتراف کر چکا ہوں اور آج پھر ایک بار میں سلینا کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے اطہر کا یہ خطبۂ صدارت تھا جو چھوٹی موٹی

تقریروں کے بعد ہو رہا تھا۔

سچ تو یہ ہے انور میاں۔ تمہاری دوسری زندگی کی ذمہ دار صرف اور صرف سلینا ہے۔ ہم سب اور تم بھی جس قدر بھی خدا کا شکر ادا کریں کم ہے کہ اس نے تمہاری زندگی کے لیے سلینا کو یہاں بھیج دیا۔ ورنہ کیا ہوتا؟

اور اس خوف سے ہی اطہر کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ یہ آنسو اسی خوف کے تھے کہ اگر خدانخواستہ انور ہمیشہ ہی دیوانہ رہتا۔ یہ آنسو تشکر کے بھی تھے جو سلینا کے لیے تھے جو سلینا کی خدمات کے اعتراف میں آنسو کی صورت آنکھوں میں سمٹ آئے یہ آنسو اسی خوف کے تھے کہ اگر خدانخواستہ انور ہمیشہ ہی دیوانہ رہتا۔ یہ آنسو سلینا کی خدمات کے اعتراف میں تھے کہ یہی سب سے بڑی حقیقت تھی۔

میں ایک پیشہ ور نرس ہوں اور ہر نرس کی طرح اپنے مریض کی تیما دار۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہ میرے بس میں تھا اور نہ اس سے زیادہ میں نے کچھ کیا۔

سلینا اس بار بھی کسرِ نفسی سے کام لے رہی تھی۔

آپ لوگوں کی دعائیں اور میری محنت دونوں کا اس میں دخل ہے۔ سلینا کی آواز بڑی دھیمی تھی۔

سب ہی متاثر تھے۔ ہر ایک کی نظر میں سلینا قد آور لگ رہی تھی۔ ہر ایک اپنے درمیان سلینا کو سب سے بلند بالا اور محترم سمجھ رہا تھا۔

میری دوا اور میرا علاج سب بیکار رہتا اگر انور کو سلینا میسر نہ آتی۔

ڈاکٹر نے بھی سلینا کے لیے یہ چند الفاظ ادا کرنے ضروری سمجھے۔

انور کو سلینا میسر آجائے۔ کاش! انور نے دل ہی دل میں دعا مانگی اور وہ سرکتا ہوا کھڑکی طرف ہولیا۔ دور تک سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اس نے زیر لب کہا۔ سلینا تم میری زندگی کا خوش گوار اور حسین رنگ ہو۔ تمہارے بغیر بہاروں کا سارا حسن بیکار ہے۔ اس نے لہلہاتے ہوئے جنگلی پھولوں کی قطار در قطار پر نظریں جماتے ہوئے آپ ہی آپ دہرایا۔

انور میاں۔ تمہیں سلینا کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یہ تمہاری دوسری زندگی کی ذمہ دار ہے۔ اگر یہ نہ یہاں آئی ہوتی تو جانے کیا ہوتا.....

اطہر کا لہجہ گلوگیر تھا۔ اس نے سب سے منہ موڑ کر کھڑے اور کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے انور کو مخاطب کر کے کہا۔

بھائی جان۔ اس نے چونک کر اطہر کو دیکھا اور بہت دھیمے لہجے میں بولنے لگا۔

بعض جذبے ایسے ہوتے ہیں جو الفاظ کا پیراہن پہن کر کم تر ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے جذبے کے تقدس سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ میں سلینا کی خدمات کو بے مول سمجھتا ہوں۔ ٹھیک کہتے ہو انور میں نے بار ہا سلینا کا شکریہ الفاظ میں ادا کیا ہے لیکن ہر بار لگتا ایسا ہے کہ میں جو کچھ بول رہا ہوں وہ کم ہے اور جو لفظ ادا نہیں کر پاتا وہ وزنی ہیں اور وہی معنی بھی لیے ہوئے ہیں۔ میں نے ہر بار جانا ہے کہ میں مطمئن نہیں ہوا۔ ایسے جیسے کہ میں جس قدر محسوس کرتا ہوں اس قدر اظہار نہیں کر سکا ہوں۔ لیکن میں پھر بھی چاہتا ہوں کہ سلینا تک وہ کچھ پہنچ جائے۔ جو میرے جذبے کی تمام تر صداقت اپنے اندر رکھتا ہو۔ اطہر نے بے حد ممنونیت سے کہا۔

میں آپ کے جذبے کی تمام تر صداقت سے آگاہ ہوں۔ مجھ تک وہ سب کچھ پہنچ چکا ہے جو الفاظ کا محتاج نہیں ہے۔ مجھے میرا انعام مل چکا ہے۔ میں آپ کی محبت سے مالا مال ہو چکی ہوں۔ وہ محبت جو مجھ سے کبھی کسی نے نہیں کی۔ کہ میرے پاس کوئی رشتہ کبھی رہا بھی کب ہے۔ سلینا اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکی اور ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو میں شامل ہو گئی۔

میں آج تک صرف سیلنا کراس تھی۔ ہر مریض کی ایک معمولی سی اور وقتی سی نرس اور اب میں آپ سب کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتہ محسوس کرتی ہوں۔ ایسا رشتہ جو ٹوٹتا ہی نہیں۔ جو مصنوعی نہیں جو دل کا رشتہ ہے۔ ان مول بن مول۔ سلینا کے گالوں پر آنسوؤں کی قطار تھی جسے اس نے جلدی سے مٹا ڈالا۔

اور انور نے اسی لمحے کھڑکی سے ٹیک لگائے شکوہ کیا۔

سلینا تم نے تو کبھی میرے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا۔ شاید کچھ بھی نہیں سوچا ہے۔ میں تمہارا بس ایک مریض ہوں وقتی مریض جو ٹھیک ہو جاتا ہے اور دور ہو جاتا ہے۔ مگر یہ شکوہ اس کے لبوں سے آواز کی صورت میں ادا نہیں ہوا۔ ہونٹوں پر آیا اور دونوں ہونٹوں کے

درمیان کہیں گم ہو کر بس رہ ہی گیا۔
شکریہ سلینا۔ دوسری طرف اطہر اپنی پوری آواز سے گویا تھا۔ تم مجھ سے بہت چھوٹی ہو لیکن حقیقت ہے ہم سب سے بہت اونچی ہو۔ بہت بڑی ہو۔ اطہر نے پیار اور شفقت کے ملے جلے جذبے کے ساتھ سلینا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔
اور انور پھر اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔
سلینا کچھ میرے جذبات کی بھی تو قدر کرو۔ میں نے تمہیں صرف اپنی دوسری زندگی کا ذمہ دار نہیں سمجھا ہے۔ بلکہ اپنی اس دوسری زندگی کو تمہارے قدموں میں ڈال رہا ہوں۔ بقیہ ساری زندگی تمہاری امانت ہے سلینا ڈئیر۔
ادھر شاکرہ سلینا کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کے بس میں نہیں کہ وہ سلینا کو اپنی آنکھوں میں بسالے۔ دل چیر کر اس میں جگہ دے دے۔
سلینا میرے پیارے بھیّا کی محسن! تم میرے بھیّا کے ساتھ ساری زندگی نہیں گزار سکتیں جانے کہاں سے یہ خواہش اس کے دل میں اچانک پیدا ہوئی اور بڑی شدت سے اس کے روئیں روئیں میں سرایت کر گئی۔ لیکن وہ اپنی اس خواہش کو چھپانے پر مجبور تھی۔ جانے سلینا اس کی اس خواہش کو کیا رنگ دے۔ اور پھر جانے خود انور بھی اس کا ساتھ دے یا نہ دے۔ اسے انور کے بارے میں بھی تو کچھ اندازہ نہیں تھا۔ انور تو جیسے اس قسم کے جذبات سے بالکل ہی عاری تھا۔ شاکرہ کے ذہن میں انور کا وہ ماضی تھا جو اس کے سامنے انکار کرتے ہی گزرا تھا۔
نجمہ بھی ممتا کی ماری تھی۔ انور کو اس نے اپنے پیٹ سے پیدا نہیں کیا تھا لیکن اس نے اسے پالا تھا۔ گود میں کھلایا تھا۔ وہ اس کی پہلی اولاد تھا افسر اور ندیم سے کم عزیز نہیں تھا۔ اگر وہ پھونس کی چھپر والی تجربہ گاہ میں اپنی پوری جوانی گزار دیتا تو اس گھر میں شاید کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں کھیلتی۔ میں جو اس گھر کی بلا شرکتِ غیرے ملکہ ہوں کتنی بدنصیب ملکہ ہوتی میں۔ وہ اس بھیانک تصور سے ہی کانپ گئی کہ انور اپنی ساری زندگی صابن کے غبارے بنا کر گزار دیتا۔
اتنی قابلِ رحم حالت تھی انور کی اور کتنا کرم کیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ اس گھر میں سلینا کو بھیج

دیا۔ سلینا جوان سب کی کوئی نہیں تھی اور سلینا جواب ان سب کی سب کچھ تھی۔ اس نے سلینا کو پیار سے لپٹا لیا۔

آخر کار اس سے رہا ہی نہ گیا۔

بھابھی مجھے کیوں گناہ گار کر رہی ہیں۔ سلینا اتنے سارے تشکر کے احساسات کو کہاں تک سمیٹتی پھرے گی۔ اس نے یہ بات آپ ہی آپ سوچی۔

پھر نجمہ، سلینا اور شاکرہ چپ چاپ کمرے سے ساتھ ہی نکل گئیں کہ تینوں اپنے اپنے جذبوں سے نڈھال ہو رہی تھیں۔ انہیں تنہائی چاہیے تھی۔ الگ الگ کونے چاہیے تھے جہاں وہ صرف اپنے آپ سے باتیں کرتیں۔ اپنے آپ کو سمجھا سکیں۔ رو سکیں اور دل ہلکا کر سکیں۔

یوں تقریب کی پہلی نشست کسی اعلان کے بغیر آپ ہی آپ ختم ہوگئی۔

اطہر اور ڈاکٹر بچوں کو ساتھ لے کر سیر کے لیے چلے گئے۔ نجمہ شاکرہ رات کے کھانے کا انتظام کرنے لگیں۔ دیگر مہمان آپ ہی باہر نکل گئے۔ سلینا موقع پا کر چپکے سے اپنے کمرے میں آ گئی اور انور نے لائبریری میں جا کر اپنے آپ کو بند کرلیا۔ نہیں معلوم وہ وائلن بجانا چاہتا تھا یا دل کے تار اپنی انگلیوں سے چھیڑنا چاہتا تھا۔ وہ چپ رہنا چاہتا تھا۔ یا بہت کچھ بولنا چاہتا تھا۔ زور زور سے۔ وہ اپنی آواز کسی کو بھی سنانا نہیں چاہتا تھا۔ شاید دیواروں چھتوں اور کتابوں کو اپنی محبت کی کہانی سنانا چاہتا تھا۔ وہ ایک غلطی کر چکا تھا اور دوسری اسی قسم کی غلطی کرنا چاہتا تھا۔ وہ سہا ہوا بھی تھا اپنی تقدیر سے روٹھا ہوا بھی تھا اور اپنے دل کی مٹھی میں اپنے آپ کو جکڑا بھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ بے بس تھا۔ قفس میں قید کسی پرندے کی مانند، وہ تو بس پھڑ پھڑا رہا تھا مگر اسے وسیع آسمان چاہیے تھا۔ اس کی خواہش بس اتنی سی تھی۔ مگر بات بس اتنی سی نہیں تھی۔

۲۴

.....بھول جاؤ کہ تم مشرقی خون بھی اپنے جسم میں رکھتی ہو۔ دفن کردو اپنی تمام تر آرزوؤں کو۔ اپنے تمام خواب بھول جاؤ۔ لو میں نے یہ باب بھی بند کردیا... اور اس نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرلیا...

اس رات سلینا دو طرح کے جذبات سے دوچار تھی۔ دونوں ہی بہت شدید تھے۔ دونوں اس پر حاوی تھے۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ایک سب سے بڑے امتحان سے گزری تھی۔ اب تک اسے صرف بیمار مریض ملتے رہے تھے اس نے انہیں دوا پلا کر علاج کیا تھا ان کی دل جوئی کی تھی۔ ان کی کڑی سے کڑی تیمار داری بھی کی تھی۔ اس نے طرح طرح کے مریض پر اپنی سچائی سے جادو کیا تھا۔ انہیں اچھا کیا تھا۔ انہیں صحت یاب کیا تھا۔ انہیں چلنے پھرنے بولنے اور ہنسنے کے قابل بنایا تھا لیکن اس نے آج تک کسی ایسے مریض کی تیمار داری نہیں کی تھی جو بیمار نہیں تھا بلکہ ذہنی طور پر بچہ بن گیا تھا۔ جو اپنا ماضی بھول چکا تھا۔ جو اپنے ماضی کی غلطیوں میں جکڑا جا چکا تھا اور جو اس قید سے آزاد ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ جس نے ان جانے میں کوئی جرم کیا تھا اور خود ہی اپنے آپ کو سزا بھی دے رہا تھا۔ یا جس نے خود کوئی جرم نہیں کیا تھا بلکہ مجرم کوئی اور تھا نشانہ وہ بن گیا تھا لیکن پھر بھی وہ احساسِ ندامت کا شکار تھا۔ وہ بہت پُرکشش شخصیت کا مالک تھا، جو بے حد شریف بے انتہا پاکباز تھا۔ جو محبت کے ساتھ ساتھ عزت بھی دینا جانتا تھا۔ جس نے رفتہ رفتہ یا اچانک بالکل ایک لمحے میں اس پر یہ باور کرا دیا تھا کہ اب وہ اس کی زندگی

کا حصہ بن چکا ہے۔ اس کے خواب میں اس کے خیال میں سما چکا ہے۔ وہ اس کی نس نس میں خون کی مانند تیر رہا تھا۔ وہ اس کے دل میں کہیں چھپا بیٹھا تھا۔ جو اس کے ذہن پر بھی قابض تھا۔ جس نے اس کے سارے وجود کو اپنے بس میں کرلیا تھا۔ وہ اب بے بس تھی اس کا کوئی راز دار نہیں تھا مگر وہ اپنی کہانی کسی نہ کسی کو ضرور سنانا چاہتی تھی۔ اس کے کمرے ہی میں نہیں اس کے سارے حلقے میں صرف ایک ہی ہستی تھی جو اس کے دل کے حال سے واقف تھی کیونکہ وہ اسے ہی اپنا قصہ دل سنا کر مطمئن ہوجاتی۔

آج بھی وہ پاک مریم کے آگے سر بہ سجود تھی۔ میں تیری شکر گزار ہوں کہ تونے میری لاج رکھ لی ہے۔ میری دعائیں اور میری محنتیں سب بارآور ثابت ہوئیں۔ مجھ بدنصیب پر تیرا بڑا احسان ہے۔ اس کی نظریں پاک مریم کی تصویر کا طواف کر رہی تھیں۔ پھر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ریشمی ساڑھی اس کے بدن کو گدگدا رہی تھی۔ اسے اپنا وجود نرم نرم بالکل روئی کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ زندگی میں کیا کچھ نہیں ہے۔ لیکن یہ سب کچھ زندگی سے چھین لینے والوں کو ملا کرتا ہے۔ لیکن نہ میں نے آج تک زندگی سے کچھ طلب کیا ہے نہ ہی زندگی نے مجھے اس قابل سمجھا ہے کہ خود ہی بہت کچھ عطا کردے آج تک میں اپنی راتیں اپنا سکون اپنی نیند دوسروں کی زندگیوں کے لیے لٹاتی رہی ہوں۔ یہ دعا مانگتی رہی کہ جو بھی دکھی یا بیمار میرے پاس آئے شفا پا کر خوشی خوشی جائے۔ نہ جانے زندگی کے ساتھ میرا سلوک ٹھیک ہے یا ان لوگوں کا جو زندگی سے بہت کچھ طلب کرتے رہتے ہیں۔ اس کا جی چاہا وہ بھی کچھ طلب کرے۔ مگر کیا؟ اس کا تعین وہ جب بھی کرتی یا کرنا چاہتی تب فوراً ہی اسے یہ احساس ہوجاتا کہ یہ طلب بہت زیادہ ہے اور وہ اس کی اہل ہی نہیں ہے۔ اس کی زندگی کی حقیقتیں اتنی تلخ اور سچی تھیں کہ انہیں ان کی ڈگر سے ہٹایا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اسے نہ باپ مل سکتا تھا کہ وہ دنیا سے جا چکا تھا۔ نہ ماں مل سکتی تھی جو اس کی زندگی سے جا چکی تھی۔ اسے ایک بھرا پرا گھر بھی نہیں مل سکتا تھا۔

اس کے ذہن میں یک بارگی انور کا خیال آ گیا۔ انور کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے وہ جس جذبے سے دوچار ہوئی تھی وہ تو بالکل ہی انوکھا تھا۔ وہ تو جانتی بھی نہیں تھی کہ قدم سے قدم ملا کر اور نظریں نیچی کیے کیے راستے میں ایک بہشت بھی کھڑی ملتی ہے،

جہاں پانی نہیں دودھ کی نہریں بہتی ہیں۔ جہاں انسان نہیں فرشتے بستے ہیں۔ جہاں نہ گرمی ہوتی ہے نہ سردی۔ جہاں بارش ہوتی ہے رحمت کی خوشیوں کی مسکراہٹوں کی۔ جہاں قدم زمین پر نہیں ہواؤں پر رکھے جاتے ہیں۔ جہاں دل کی ہر دھڑکن میں بس پیار ہی پیار ہوتا ہے۔ وہ نبض پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکنیں گنتی ہے مگر یہاں تو ساری گنتی گڈمڈ ہو جاتی ہے۔ ان گنت، بے شمار قدم سے قدم ملانے والے کی نظروں میں دنیا کے سارے رنگ سمٹ کر آ جاتے ہیں۔ ساری کہکشائیں ہاتھ باندھ کر کھڑی ملتی ہیں۔

اس نے ایک بار نہیں کئی کئی بار کروٹیں بدلیں۔ اس کے گرد لپٹی ساڑھی آج اسے مارے ڈال رہی تھی۔ اب تو وہ کنواری مریم سے بھی آنکھیں چار نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے اچانک ڈیوڈ یاد آ گیا تھا جس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر بارہا وہ اسپتال سے اس کے تمباکو کے اسٹور تک میلوں پیدل چلا کرتی تھی۔ لیکن اس کے دل کی دھڑکنیں ساکت ہی ہوتیں اس نے ایک بار بھی شدت سے وہ جذبہ محسوس نہیں کیا جو آج اس نے اپنے کمرے سے ڈرائنگ روم تک کے سفر میں انور کے ساتھ چلتے چلتے محسوس کیا تھا۔ اس کے قدم زمین پر ہرگز نہیں پڑ رہے تھے اور وہ حیران بھی ہو رہی تھی کہ راستہ بھی طے ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اسے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ انور کے ہاتھ میں نہیں تھا لیکن وہ اپنے آپ کو اس کے بازوؤں کے حصار میں جکڑی محسوس ہو رہی تھی، اس کی انگلی میں سفید نگینوں کی انگوٹھی دور تک دودھیا راستہ بنا رہی تھی۔ اس کے گلے میں لٹکا ہوا لاکٹ بار بار اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس کے دونوں کانوں میں پہنے ہوئے بُندے جھول جھول کر اسے لوری سنا رہے تھے۔ یہ ایسی چیزیں جو اس کے لئے اجنبی تھیں اس کی بہترین دوست کا روپ دھار چکی تھیں۔ انور راستے بھر خاموش تھا۔ ڈیوڈ سارے راستے باتیں کرتا رہتا تھا۔ لیکن اسے بولتے ہوئے ڈیوڈ کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی لیکن چپ چاپ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے خاموش انور کی آواز اس کے کانوں میں کچھ کہتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس سے فاصلے پر تھا مگر وہ اسے اپنے سے لپٹا لپٹا سا محسوس ہو رہا تھا۔ آخر یہ سب کچھ کیا تھا کیا ڈیوڈ اس کی ماں کی دنیا تھا اور انور اس کی باپ کی دنیا کا فرد۔ کیا یہ فرق کچھ یوں تھا۔ اور اگر یہ فرق کچھ یوں ہی تھا تب میں اپنے ان دیکھے باپ کی طرف کیوں

جھکی جا رہی ہوں۔ جس کا نہ کوئی وجود ہے نہ تھا۔ وہ میری زندگی میں کبھی بھی نہیں آیا میں اس کی زندگی میں کبھی بھی نہیں گئی آج ہم دونوں کا ملاپ کیوں کر ہو گیا۔ سلینا اس ملاپ سے خوش تھی اس نے مدتوں بعد اسے اپنے سے قریب پایا تھا مگر وہ اس ملاپ سے خوف زدہ بھی تھی۔ یہ تو سائے کا ملاپ تھا۔ روشنی کے جاتے ہی سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اور روشنی بھلا ہمیشہ تھوڑی ہی رہتی ہے۔ اس نے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے پھر کئی کروٹیں بدلیں لیکن کروٹ بدلنے سے زندگی کی حقیقت تھوڑی بدل جاتی ہے۔

اس کے دل کا ترازو بہت ظالم تھا اس نے ہمیشہ سے اپنے جانب والے پلڑے کے نیچے کوئی وزن چپکایا ہوا تھا۔ یہ جھوٹا مصنوعی وزن اسے اسی جانب جھکا دیتا۔

میں۔ میں سلینا کراس ہوں۔ میں بار بار یہ کیوں بھول جاتی ہوں اس نے اپنے گلے میں لٹکتی ہوئی آبنوسی صلیب پر اپنے ہونٹ رکھ دیے گویا وہ اپنے آپ سرزنش کر رہی تھی۔ سلینا مت بھٹکو۔ تمہارا راستہ اور ہے تمہاری منزل صلیب سے ہو کر گزرتی ہے۔ مگر دوسرے پلڑے نے فوراً ہی فریاد کی۔ سلینا میں نے اپنے نیچے کوئی مصنوعی اور جھوٹا وزن نہیں چپکایا ہوا ہے جب ہی تمہیں یہ پلڑا اٹھا نظر آ رہا ہے۔ اپنا صحیح فیصلہ اس میں آہستہ سے رکھ دو۔ یہ پلڑا پل بھر میں جھک کر تمہارے قدم چوم لے گا۔ صحیح اور سچا راستہ بس اسی طرف سے کسی خوب صورت منزل کی طرف جاتا ہے۔ سلینا نے ادھر سے نظریں ہٹا لیں لیکن وہ پھر بھی گڑگڑاتا رہا سلینا۔ ایک بار بس ایک بار اپنے دل کی آواز سن لو وہ فریاد کرتا رہا۔

سلینا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی جس نے اس کے تکیے کو دائیں بائیں کندھے کی جانب گیلا کر کے رکھ دیا۔

میرے معبود! اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کے سامنے لا کر جوڑ دیے، مجھے تقویت دے۔ میں نے زندگی میں آج تک تجھ سے کچھ بھی نہیں مانگا۔ مگر تیرے بندوں کو بہت کچھ دیتی رہی ہوں۔ اب بھی میرے پاس دینے والا خزانہ بڑھا دے اور مانگنے والا جذبہ چھین لے۔ شاید میری بھلائی اسی میں ہے۔ مجھے اپنے جیسے بہت سے لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا ہے۔

دعا اس نے ہمیشہ کی طرح بڑی رقت سے مانگی۔ اس پر کپکپی طاری تھی۔ آنسو جانے کہاں سے آتے جا رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں لیکن وہ ابھی جاگ رہی تھی اور جاگتے ہی میں خواب دیکھ رہی تھی۔ شاید یہ خواب نہیں بلکہ اس کی گزری زندگی تھی جو اسے دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی کتابِ زیست کا یہ باب پڑھنے لگی۔ یا پڑھنے پر مجبور ہوگئی۔

ایک دن اسپتال میں ایک نیا مریض آیا۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ یہ تو روز کا معمول تھا۔ اس نے تمام مریضوں کی طرح اس کا بھی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ دن رات کا امتیاز کیے بغیر اپنی راتیں اور محبتیں اس پر بھی لٹانے لگی۔ مگر وہ مریض دوسرے مریضوں سے قدرے مختلف تھا۔ چپ چاپ گم صم وہ اپنے بستر پر پڑا چھت کی کڑیاں گنتا رہتا۔ جب وہ دوا بنا کر اس کے پاس لاتی تو بے چون و چرا پیالی اپنے ہونٹوں سے لگا کر خالی کر دیتا۔ انجکشن لگانے کے لیے اس کی بانہوں کو ٹٹولتی تب وہ خود ہی آستین کے بٹن کھول کر بازو اس کی طرف بڑھا دیتا۔

ایسے کئی دن گزر گئے۔ اور ایک دن جب وہ دوا کی پیالی لے کر اس کے قریب آئی تب اس مریض نے اٹھ کر اپنی خدمت گزار نرس کا استقبال نہ کیا۔ کیا بات ہے تمہاری طبیعت کہیں زیادہ خراب تو نہیں؟ وہ گھبرا کر اس پر جھکی اور دوسرے لمحے مریض نے دوا کی پیالی اس زور سے اس کے ہاتھ سے چھین کر فرش پر دے ماری کہ وہ سہم گئی۔

مجھے یہ رنگین پانی ٹھیک نہیں کر سکتے۔ وہ آج عجب سے جذبے سے دوچار تھا۔ وہ چپ چاپ پلٹ آئی۔

لیکن دوا پلانے کے وقت وہ پھر اسی طرح دوا کی پیالی لیے اس کے پاس کھڑی تھی مجھے یہ رنگین پانی ٹھیک نہیں کر سکتے۔

دوسری پیالی کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلی کا ہوا تھا۔ اور وہ بغیر کچھ کہے وارڈ سے نکل آئی۔

تیسری بار وہ پھر گھڑی دیکھ کر اس کے سرہانے اسی انداز سے آ کھڑی ہوئی مریض نے دیکھا اس کی نظروں میں کوئی شکوہ نہ تھا۔ کوئی تھکن کوئی بیزاری نہ تھی تم اس پیالی کا بھی وہی حشر چاہتی ہو جو پہلی دو پیالیوں کا ہوا ہے۔

اس نے بہت دھیمے اور شکست خوردہ لہجے میں اپنی نرس سے دریافت کیا۔

تم کیا چاہتے ہو؟ تم جو چاہتے ہو وہی کرو۔ میرا خیال نہ کرو۔ نرس مطمئن انداز میں بولی۔
مریض کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوئی۔
میں جو چاہتا ہوں بیان کردوں۔
ہاں کہہ دو کہ کہنے سے جی ہلکا ہوجاتا ہے۔ طبیعت بہتر ہوجاتی ہے۔ نرس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔
میں۔ میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مریض کے لہجے میں شرمندگی ہی شرمندگی تھی۔
اچھا لو دوا پی لو۔ معافی کی کوئی ضرورت نہیں۔ نرس نے مریض کو دوا پلائی اور پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔
سچ پوچھوتو اپنی کڑوی کسیلی زندگی سے بھی ہمیں سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔
نرس جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔
غم کو اس طرح اپناؤ کہ وہ تمہاری طاقت بن جائے اور خوشی کو اس طرح نبھاؤ کہ وہ تو تمہاری خوشی ہے ہی۔ وہ جیسے مریض کو زندہ رکھنا چاہتی تھی دوسرے اورتمام مریضوں کی طرح۔
تم کون ہو؟ مریض نے پوچھا۔
کیسا عجیب سوال ہے یہ۔ اس نے قدرے بلند آواز میں اس کا جیسے تمسخر اڑایا۔ اپنے بارے میں بھلا کسی کو کبھی سچ معلوم ہوتا ہے۔ وہ بس کسی دھوئیں ۔ کسی طوفان میں گھرا زندگی گزار دیتا ہے۔ اب وہ زیرِ لب بول رہی تھی۔ اس کی آواز مریض تک بھلا کیسے پہنچتی؟
تم نے جواب نہیں دیا۔ مریض نے ایک بار پھر جاننا چاہا۔
میں۔ میں سلینا کراس ہوں۔ اس اسپتال میں نرس ہوں۔ اس نے اب کے مطمئن انداز میں جواب دیا۔ ایسے جیسے میں اور ہو بھی کیا سکتی تھی۔
میں ڈیوڈ ہوں۔ مریض نے اپنا مختصر تعارف کرایا۔
یہ کوئی تعارف نہیں ۔ سلینا نے حقارت سے کہا۔ تم بزدل ہو۔ زندگی سے جلدی ہار گئے۔

ناکامیاں ہی کامیابیوں کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہیں۔
میری ناکامیوں کا تمہیں علم ہے۔اس نے حیرت سے سلینا کی جانب دیکھا۔
میں تمہاری داستان سننا بھی نہیں چاہتی۔ سنانے میں انسان مبالغے سے کام لیتا ہے۔اصل بات چھوڑ جاتا ہے۔ اِدھر اُدھر کی زیادہ ہانکتا ہے۔
سلینا کے لہجے میں اب بھی تمسخر ہی تھا۔
پھر اصل بات کیسے معلوم کی جاسکتی ہے؟ ڈیوڈ نے دلچسپی لی۔
یہ مجھے نہیں معلوم۔ نہ ہی میں داستانوں میں دلچسپی رکھتی ہوں۔ ہاں بہت سی کہانیاں تو چہرے پر تحریر ہوتی ہیں۔سلینا نے اس کی دلچسپی کو نظر انداز کرتے ہوئے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔
پھر تو تمہیں علم ہوگا کہ میں جینا ہی نہیں چاہتا۔تم مجھے زندہ کیوں رکھنا چاہتی ہو؟
یہ میرے پیشے کا تقاضا ہے۔
میں تنہا ہوں۔ اور تنہا زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں ایک معاشرتی حیوان ہوں۔ بولنا چاہتا ہوں۔ بات کرنا چاہتا ہوں۔ دکھ سکھ بانٹنا چاہتا ہوں۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ دو انسان دو متوازی لکیروں کی طرح ہوتے ہیں جو ساتھ ساتھ بھی رہیں تو آپس میں مل نہیں پاتے۔
میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے۔سلینا نے کہا۔
پھر بھی میں اپنی متوازی لکیر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔تم جانتی ہو لکیریں جب پیچ وخم سے آشنا ہو کر کہیں دور چلی جاتی ہیں تو زندگی میں کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ زندگی اداس ہو جاتی ہے۔ بے رونق بن جاتی ہے۔
مجھے ایسا کوئی بھی تجربہ نہیں۔نرس نے اپنی ناتجربہ کاری کا اعتراف کیا۔
مریض ہچکچایا اور پھر بول اٹھا۔
اگر میں چاہوں کہ تم میری متوازی لکیر بن جاؤ تو...
اور نرس گھبرا گئی۔
تم سو جاؤ۔ مجھے اور مریضوں کو بھی دیکھنا ہے۔
وہ سب مر جائیں گے اگر تم مجھے نہ بچا سکیں۔ مریض نے اسے جیسے آگاہ کیا۔اور اس رات

اس نے بستر پر لیٹے لیٹے دیر تک اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیا۔ وہ بھی تو تنہا ہے۔ اس کی زندگی بھی تو ویران سنسان ہے۔ زندگی کو کوئی نہ کوئی ساتھی تو چاہیے نا۔ مجھے یہ بن مانگی زندگی تو گزارنی ہی ہے۔ آخر میں آج تک کس کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ کون ہے جو مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے گا۔ سرخ جوڑے میں لپٹا کر کون ہے جو مجھے اپنے بھرے پُرے گھر کے آنگن میں کھڑا کردے گا کون ہے۔ جو مجھ سے چپکے سے کہے گا۔

تم میری قسمت کی لڑکی ہو اور دیکھو میں نے تمہیں قسمت کی لکیروں سے چرالیا ہے۔ میں اس بھرے پُرے گھر کی ملکہ بن جاؤں گی جہاں طرح طرح کے رشتے ہوں گے، جن سے مجھے شرمانا ہوگا۔ جن کی مجھے خدمت کرنی ہوگی جن کے لیے مجھے اپنا نام تک بدلنا ہوگا۔ یہ باب میرے باپ نے شروع کیا تھا اور چند مہینوں ہی میں زندگی بھر کی کتاب ختم کر ڈالی۔ میں جو اتفاقاً پیدا ہوگئی تھی آج تک وہی پہلا باب کھولے بیٹھی ہوں۔ میں جو آج باپ کے دیس میں ہوتے ہوئے بھی کسی مشرقی شہزادے کا خواب نہیں دیکھ سکتی کیوں کہ میرا نام سلینا کراس ہے۔ اور میں لڑکی نہیں صرف ایک نرس ہوں۔ جس کے کوئی خواب نہیں ہوتے۔ اس نے کروٹ بدلی۔ ایسے جیسے وہ ان تمام خیالات سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔ چھڑانے پر مجبور ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے کہ آنسو تو اسی وقت برس پڑتے ہیں جب دل کا خون ہوتا ہے۔ اس کے دل کا خون ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ سلینا کراس بھول جاؤ تم کون سا خون اپنے جسم میں رکھتی ہو۔ کون سی ولدیت رکھتی ہو۔ دفن کردو اپنی تمام تر آرزوؤں کو۔ اپنے تمام خواب سلادو۔ ہمیشہ کے لیے ایک نئی صبح کا آغاز کرو۔ وہ آنسوؤں کے درمیان ہی تلخی سے مسکرا پڑی۔

لو میں نے یہ باب بند کردیا۔ اس نے اپنے ہونٹ دانتوں سے چباڈالے۔ آنسو پونچھ لیے۔ بے دردی کے ساتھ اپنا نام بار بار دہرایا اور اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ انتہائی سفا کی کے ساتھ کرلیا۔ دوسری صبح سلینا کے اندر کی سلینا مر چکی تھی اور نرس سلینا اپنے مریض ڈیوڈ کی زندگی میں آنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ اس نے اپنے مریض کو زندگی دے دی اور مریض نے اس کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں جگمگاتی ہوئی انگوٹھی پہنادی۔

ماں تم زندہ ہو چاہے کہیں پر بھی ہو۔ میں نے تمہیں یاد رکھا۔ اور میرا باپ جو مر گیا ہے میں اسے بھول گئی ہوں۔

میں ڈیوڈ کی وفادار ہوں۔ سلینا نے بند ہونٹوں سے یہ جملہ ادا کیا اور اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔

آ جاؤ۔ سلینا نے اٹھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔

انور کمرے میں داخل ہو گیا۔

انور کو دیکھ کر سلینا ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ میں نے اسے تو اندر آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ تنہائیوں کے تخیل یا تو انسان کو نیک بنا دیتے ہیں یا پھر بدی میں کامل کر دیتے ہیں۔ انور نے سلینا کے چہرے پر سوچ کی لکیریں پڑھنے کی کوشش کی۔

انسان جب تنہا ہوتا ہے تب سچا ہوتا ہے۔ اور سچائی انسان کو بدی میں کامل کیسے کر سکتی ہے۔ سلینا نے جواب دیا۔ اس نے اپنے اندر پوری مضبوطی بھی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ہر منصوبہ تنہائی میں ہی بنتا ہے۔ انور نے جیسے اسے مطلع کیا۔

مجھے اس سے اتفاق ہے۔ سلینا ایسا منصوبہ تنہائی میں بنا چکی تھی کئی برس پہلے۔ اس نے جواب دیا۔

برا منصوبہ بھی تنہائی میں ہی بنایا جاتا ہے۔

اچھائی اور برائی اضافی باتیں ہیں ہوسکتا ہے جسے میں نے اپنے لیے بہتر سمجھا ہو تم اس سے اتفاق نہ کرو۔

یہ بھی تو ممکن ہے جسے تم نے اپنے لیے بہتر سمجھا ہو وہ حقیقتاً بہتر نہ ہو۔ انور جیسے سلینا کی سوچ کو پا گیا تھا۔

تو پھر یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم نے جو کچھ سوچا ہے اس کے نتائج ہمارے حق میں ہوں گے۔ سلینا الجھ گئی تھی۔

تنہائی میں جو آواز تم سے زیادہ قریب ہو اسے اپنے لیے مفید سمجھو۔

نہیں۔ سلینا گھبرا گئی۔

ہاں۔ انور مسکرا پڑا۔

تو تم سلینا بیگم اپنے آپ سے لڑ رہی ہو۔ انور نے دل ہی دل میں سوچا۔ میں تمہیں جیت لوں گا۔ سلینا تم تنہائی میں جنگ کر لو حقیقت میں ہماری تمہاری صلح ہو کر ہی رہے گی کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ تنہائی میں جو آواز تم سے بہت قریب ہے وہ آواز میری ہے۔ انور اپنی خوش فہمی پر ہنسے ہی جا رہا تھا۔

اور سلینا زرد ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا سارا وجود پگھل کر بہا جا رہا ہے۔ وہ کھوکھلی ہو رہی تھی۔ انور تم مجھ سے دور ہو جاؤ۔ مجھ پر رحم کرو۔ ہم تم دونوں دو مختلف تہذیبوں کی علامت ہیں جن کا آپس میں کبھی ساتھ نہیں ہوا ہے۔ ہوا ہے تو بھی خوش گوار اثرات ظاہر نہیں ہوئے۔ تم کیوں اپنی تمام تر طاقت کے ساتھ میرے سامنے بار بار آ جاتے ہو۔ سلینا بول رہی تھی مگر اس کی آواز اس کے اپنے بند ہونٹوں سے باہر نہیں آ رہی تھی۔

انور اس کی کیفیت کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔

سلینا اپنے آپ سے مت لڑا کرو۔ وہ آپ ہی آپ بولا۔ جانے وہ یہ الفاظ اسے سنا بھی پا رہا تھا یا نہیں مگر سلینا نے تو جیسے اپنے کان خود ہی بند کیے ہوئے تھے۔ وہ کچھ بھی سننا اور سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ ایسے میں وہ چاہتی تھی انور اس کے کمرے سے فوراً چلا جائے۔

مگر انور ڈٹ کر کھڑا ہوا تھا۔ وہ تو صرف یہ کہنے آیا تھا کہ سلینا تمہیں بھائی جان بلا رہے ہیں۔ مگر یہاں تو ایک جنگ سی چھڑی ہوئی تھی جس کے آثار کمرے میں جا بجا موجود تھے۔

سلینا نے کھڑے ہونے کی ہمت کی، انور نے بڑھ کر اسے سہارا دے دیا۔

تم چلو میں آتی ہوں۔ سلینا کو کچھ دیر پہلے والا جذبہ پھر سے یاد آ گیا۔ انور کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا کتنا دشوار ہے۔

میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔ انور شروع دنوں والا انور بن گیا جب وہ صابن کے غبارے اڑاتا تھا۔ اور اپنی ضد سے ہر ایک بات منوا لیتا تھا۔ مگر اس وقت وہ صحیح الدماغ تھا اور اسے بھی سلینا کا وہ مختصر ساتھ یاد تھا۔ ریشمی ساڑھی میں لپٹی ہوئی سلینا جس سے پلو بھی سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے انور نے جو جذبہ محسوس کیا تھا لندن کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے ہوئے بیبل کے قدم سے قدم ملا کر اس نے کبھی محسوس نہ کیا۔

میبل جو اس کی محبت تھی۔ اور سلینا جو اس کی صرف نرس تھی۔
پلیز انور تم سمجھتے کیوں نہیں؟ سلینا جھنجلا گئی۔
یہی شکایت مجھے تم سے ہے۔ انور سلینا پر جھک آیا۔
سرگوشی میں ادا کیا ہوا یہ جملہ سلینا کی ساری مضبوطی کو پارا پارا کر گیا۔ اور انور کے ساتھ چلتے ہوئے اس مختصر سے راستے میں وہ کتنی ہی بار ٹھوکر کھاتے کھاتے بچی۔

۲۵

.....ہم لوگ بیماروں سے محبت کرتے ہیں اور جب یہ بیمار تندرست ہوجاتے ہیں تب ہماری نگاہوں سے دُور چلے جاتے ہیں۔ ہمارا اُن سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا...

آنٹی آیئے سیر کو چلیں۔ افسر اور ندیم نے سلینا کو گھیر لیا۔
بیٹے دیکھو آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ کہیں راستے میں بارش ہوگئی تو۔
سلینا نے بچوں کو سمجھایا۔
نہیں آنٹی۔ بارش اتنی جلدی تھوڑی ہوسکتی ہے۔ ہم لوگ ذرا ہی سی دور چلیں گے۔ ندیم نے اصرار کیا۔

بچے ابھی تک ہوسٹل واپس نہیں گئے تھے۔ نجمہ کا خیال تھا کہ ایک ہفتہ وہ اور گھر پر رہ لیں۔ ان کی وجہ سے گھر میں بڑی رونق ہوگئی تھی۔ شاکرہ سے بچے بہت مانوس تھے۔ منہ ہاتھ دھلانا۔ کپڑے پہنانا۔ رات کو کہانی سنا کر انہیں سلانا یہ سب شاکرہ کی ذمہ داری تھی جسے وہ خوش اسلوبی سے پورا کرتی۔ اطہر کا سارا وقت باہر ہی گزرتا۔ انور سے بھی بچے بہت محبت کرتے تھے۔ اور سلینا کو تو پہلی بار ہی دیکھ کر وہ اس کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ سلینا کے کٹے ہوئے سنہری بال، سرخ کناروں والی سفید ساڑھی۔ گلے میں لٹکتی ہوئی سیاہ آبنوس کی صلیب اور اس پر سے سلینا کا حسین گلابی چہرہ اور چہرے کی معصومیت، ہر ایک کو اپنی جانب کھینچ لینے کے لیے کافی تھی۔ اور آج کل تو نجمہ کے بے حد

اصرار پر سلینا نے اپنا یونیفارم بھی ترک کر دیا تھا۔ نجمہ نے اسے کئی ریشمی رنگین ساڑھیاں تحفتاً دی تھیں اور ساتھ پہننے کا اصرار بھی تھا۔ سلینا میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ وہ نجمہ کے خلوص کو ٹھکرا سکے لیکن بدلے ہوئے لباس میں اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے سلینا بدل گئی ہے۔

آنٹی چلیے نا۔ افسر نے سلینا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔

اچھا چلو۔ سلینا تیار ہوگئی۔

دونوں بچے سلینا کی انگلی تھامے خوش خوش پگڈنڈی پر ہولیے۔

اطہر کا گھر اس پورے علاقے میں واحد گھر تھا اس کے چاروں طرف دور دور ہرے بھرے کھیت، کسی قدر گھنے درخت اور خود رو پھولوں سے لہلہاتے ہوئے پودے اپنی بہار دکھاتے۔ دور پہاڑیوں کے طویل سلسلے اور ان کے بیچ سے طلوع ہوتا ہوا سورج ماحول کو بڑا رومانی بنا دیتا۔ یہ ساری جگہیں اس کی دیکھی بھالی تھیں۔ انور کی ذہنی گم راہی کے دوران سلینا بارہا انور کو لے کر یہاں آئی تھی یہ جانتے ہوئے کہ شاید مناظر کی رنگینی انور کے ذہن پر کوئی خوش گوار اثر ڈالے اسے بھولی بسری باتیں یاد آجائیں اور وہ نارمل زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے۔ لیکن انور کے ذہن پر تو تاریکی کا ایسا دبیز پردہ پڑا تھا کہ وہ ان مناظر کی رنگینی سے کم ہی لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ دراصل محسوس کرنے والا دل وہ لندن ہی میں کہیں چھوڑ آیا تھا۔ اور یہاں وہ ایک ننھا منا بچہ تھا جو تتلیاں پکڑ کر خوش ہولیا کرتا۔ بچے اُسے لیے آگے بڑھے جا رہے تھے اور اس کا ذہن پیچھے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ انور تتلیاں پکڑ کر خوش ہوتا اسے یاد آیا وہ ڈھیروں پھول توڑ کر اس کی گود میں ڈال دیتا اور بے سروپا باتیں کرتا جاتا۔ اور پھول پر ہی اسے جشن والا روز یاد آ گیا۔

ایک معصوم سی کلی انور نے اس کے بالوں میں اٹکا دی تھی۔ اور اس لمحے سلینا کو زمین قدموں سے نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

یہ میرا اظہارِ عقیدت ہے سلینا۔

یہ جملہ اب بھی سلینا کے کانوں میں گونجتا۔ وہ کس کر اپنے دونوں ہاتھوں سے دونوں کان بند کر لیتی لیکن لگتا تھا آواز کانوں سے نہیں جسم کے دوسرے کسی حصے سے سنی جاتی ہے۔ وہ

جان ہی نہیں پاتی وہ کون ساحصہ تھا جو کان کے کام انجام دے رہا تھا۔
وہ جنگلی پھولوں کے جھنڈ میں ٹھہر گئی۔ ایک گہری سانس لی۔ ہر طرح کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو اس کے سارے بدن میں پھیل گئی۔ اس نے پھر محسوس کیا خوشبو اس کی ناک سے اس کے جسم میں نہیں اتری ہے بلکہ کسی اور جگہ سے ہوتی ہوئی پہلے اس کے دل کے دروازے پر ٹھہری پھر ہر ایک اعضا میں منتقل ہوگئی۔
میں تو بارہا یہاں آئی ہوں۔ آتی رہی ہوں۔ یہ خوشبو آج کیوں شدت سے مجھے محسوس ہو رہی ہے؟ وہ یہ سوال اپنے آپ سے کر رہی تھی لیکن اس کا اپنا آپ اس کے ساتھ تھا ہی کہاں؟ بھلا جواب کون دیتا۔
بچوں کو تتلیاں نظر آ گئیں وہ بھاگ بھاگ کر انہیں پکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔
ایسے میں انور اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ سلینا کی آنکھوں پر رکھ دیے۔
اسے اپنی آنکھیں جلتی محسوس ہوئیں۔ گرم گرم ہتھیلیوں کے لمس سے پریشان ہو کر وہ پیچھے پلٹی۔
تم غیر مہذّب ہوتے جا رہے ہو۔ سلینا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
''معافی چاہتا ہوں'' انور دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔
اسے ایسا لگا وہ سخت دل ٹیچر ہے اور انور سہما ہوا طالب علم۔
تم یہاں کیوں آئے؟ سلینا اس کے معافی مانگتے ہاتھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔
غلطی ہوگئی، جا رہا ہوں۔ انور کے چہرے پر سائے سے دوڑ گئے۔ طالب علم اپنی غلطی اور استاد کی دی جانے والی سزا کے خوف سے جیسے سہم چکا تھا۔
سلینا اگر سخت دل استاد تھی تب بھی اس کا دل موم ہوگیا۔
میرا لہجہ شاید سخت تھا۔ میرے الفاظ شاید نامناسب تھے۔ وہ اپنے لہجے اور الفاظ کا تجزیہ کرنے لگی۔ وہ ہوتی بھی کون تھی جو اسے کہیں بھی آنے یا جانے سے منع کرے۔ یہاں اس کا اپنا گھر ہے۔ یہ ساری ہوائیں فضائیں اس سے واقف ہیں وہ ان کا مالک ہے۔ وہ

ہر ہر پتے کو ہوا سے جھومنے کا حکم دے سکتا ہے وہ ہر درخت پر اپنا نام لکھ سکتا ہے۔ وہ یہاں کے ہر پتھر کو اپنے پاؤں سے ٹھوکر مار سکتا ہے۔ وہ یہاں کی ہری بھری گھاس پر گھٹنوں بیٹھ کر اپنی آنکھیں موندے بہت کچھ سوچ سکتا ہے۔ سورج کو طلوع ہونے کا حکم دے سکتا ہے۔ اسے غروب ہو جانے پر مجبور کر سکتا ہے۔ تتلیوں کے پر نوچ سکتا ہے انہیں مٹھی میں بند کر سکتا ہے۔ چاند کی روشنی کو اپنے قابو میں کر سکتا ہے۔ چاند کو اپنے دل پر اتار سکتا ہے۔ وہ سیکڑوں تارے منٹ بھر میں گن سکتا ہے۔

وہ یہاں کے اندھیروں کو روشنی میں بدل سکتا ہے۔ ان روشنیوں سے اپنی آنکھوں کو نور بخش سکتا ہے۔ یہ فضائیں یہ ہوائیں سب اسی کی تو ہیں۔ اس نے کھڑے کھڑے انور کی تمام تر ملکیت کو تسلیم کر لیا۔

وہ کون ہے؟ وہ کیا ہے؟ چند دن پہلے یہاں آئی تھی۔ چند دن بعد یہاں سے چلی جائے گی۔ اس کی جھولی میں نہ پہلے کوئی تارا تھا نہ اب ہے۔ وہ بس مہمان ہے، مہمان جو جانے کے لیے آتے ہیں۔

اس نے اپنا لہجہ نرم کیا۔

انور تم یہاں کیوں آئے ہو۔ مجھے تو بچے یہاں لائے ہیں۔ جانے وہ اپنی وکالت کر رہی تھی یا انور سے سوال کر رہی تھی۔

انور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کیوں کا جواب سلینا جانتی ہے۔ خوب جانتی ہے۔ پھر بھی مجھ سے پوچھ رہی ہے۔ میں کیا جواب دوں۔ میں کیسے جواب دوں۔ انور بس اسی ادھیڑ بن میں تھا۔

آہا انکل! بچے دوڑتے بھاگتے انور کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

انکل ہم آنٹی کو لے آئے۔ لائیے ہمارا انعام۔

اور انور پھر سے گھبرا گیا۔ دونوں کے ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔

چلو گھر چلتے ہیں۔

نہیں ہم ابھی نہیں جائیں گے۔ افسر مچل گیا۔

آپ نے تو کہا تھا آنٹی کو لے کر آؤ تو تمہیں چاکلیٹ ملے گی۔ ندیم نے انکشاف کیا اور انور نے جیب سے چاکلیٹ نکال کر ہوا میں اچھال دی۔ بچے چاکلیٹ پا کر پھر سے تتلیاں پکڑنے دوڑ گئے۔

اب سلینا اور انور ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

تم نے گھٹیا طریقہ اختیار کیا ہے انور۔ سلینا کی آواز میں اب کے خفگی تھی۔

مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی تھیں۔ انور کی نظریں نیچی تھیں۔

وہ باتیں گھر میں بھی تو ہو سکتی تھیں۔ سلینا کی آواز قدرے تیز ہو گئی۔

وہ باتیں میں تم سے یہاں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر رک کر وہ بولا۔ یہ جگہ ہمارے لیے نئی تو نہیں۔ سلینا مجھے معلوم ہے تم نے گھنٹوں میرے ساتھ یہاں اپنا وقت گزارا ہے۔

ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن اس وقت تمہیں اس کی ضرورت تھی۔ سلینا پیر کے انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی۔

مجھے اب بھی اس کی ضرورت ہے سلینا۔ انور کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

سلینا تھوڑی دیر کے لیے نروس ہو گئی۔

تم نے اپنا روّیہ بدل لیا ہے سلینا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں ایسا کیوں ہے؟

اس سے تمہاری مراد کیا ہے۔ سلینا نے نظریں اٹھائیں۔

پہلے تم میری نگرانی کرتی تھیں۔ ہر ہر لمحہ میرے ساتھ ساتھ ہوتیں۔ تم نے مجھے اپنا عادی بنا دیا ہے۔ اور اب تم مجھ سے دور بھاگنے لگی ہو۔ ایسا کیوں ہے سلینا؟ انور ذرا آگے بڑھا سلینا گھبرا کر پیچھے ہٹی۔

پہلے تم بیمار تھے۔ اسی لیے میں تمہارے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ اب تم تندرست ہو گئے ہو، سلینا نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

مجھے ایسی صحت نہیں چاہیے جس میں تمہارا پیار اور تمہاری توجہ شامل نہ ہو۔ انور نے سلینا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ سلینا نے محسوس کیا کہ وہ پگھل جائے گی۔ انور کی آنکھوں میں واضح ایک پیغام تھا۔ اور اس پیغام کو قبول کرنے کی اپنے اندر وہ سکت رکھتی ہی نہیں تھی۔

میرے معبود۔ وہ کھڑے کھڑے ہی کانپ گئی۔

انوراس کی بدلتی کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔

یہ ایک لمحہ کمزور لمحہ ہے اور میں یہ لمحہ ضائع نہیں کروں گا۔

انور نے سلینا کا ہاتھ تھام کر اسے بٹھادیا۔ اور خود بھی قریب ہی بیٹھ گیا۔ سلینا نے بیٹھ کر اپنے اندر کچھ مضبوطی محسوس کی۔ دو پتھر آمنے سامنے تھے۔ وہ دونوں اپنے اپنے پتھر پر ٹکے ہوئے تھے۔ سر پر گھنا سایہ دار درخت تھا۔ زمین پر چھوٹے چھوٹے بے شمار سنگریزے تھے جس پر ان دونوں کے پاؤں ٹکے ہوئے تھے۔ انور کے پاؤں میں جوتا تھا لیکن سلینا دو پٹیوں والی چپل میں تھی جو بیٹھنے کے ساتھ ہی اس کے پاؤں کا ساتھ چھوڑ گئی تھیں اور اب وہ سنگریزے اس کی انگلیوں سے کھیل رہے تھے۔ زمین کی ناہمواری بالکل ایسے ہی تھی جیسے اس کے دل کی مچلتی ہوئی دھڑکنیں۔ گویا اس کا تو سارا جسم ہی لرز رہا تھا۔ اندر سے بھی باہر سے بھی۔ سلینا اپنے سینے کے اس زیروبم کو کیسے چھپائے۔ نہ چھپائے تو یہ راز اس جنگل کے تمام درخت پودے پھل پھول۔ گھاس ہوا فضا سب ہی لے اڑیں گے۔ جنگل کی آواز گونجتی ہے تب بہت شور ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بہتے دریا میں بھی اچھال آجاتا ہے۔ وہ تو رسوا ہو جائے گی اور رسوائی بھلا کسے پسند ہوتی ہے۔ اس نے اپنی مٹھی کس کر بند کر لی۔ ایسے جیسے ساری طاقت اس کے ہاتھوں ہی میں ہے۔ اس کی آنکھیں اگرچہ کھلی تھیں لیکن اس نے اس لمحے اس میں آنسو کا سمندر بند کرلیا۔ اس کے دونوں ہونٹ الگ الگ حرکت کر رہے تھے۔ جانے وہ کچھ کہہ رہے تھے یا خوف زدہ تھے۔ اس کی دونوں ٹانگیں ایک دوسرے سے لپٹ گئی تھیں اپنی لرزش چھپانے کے لیے۔ پاؤں کے نیچے آنے والے ننھے منے پتھر جلدی جلدی اپنی جگہ بدل رہے تھے۔ انہیں جانے کس بات کا خوف تھا۔ اس کی چپل لڑھکتی ہوئی دور جاچکی تھی جانے وہ کیوں چھپ جانے گُم ہو جانے پر آمادہ تھی۔ مگر سلینا اپنے نازک سے جسم کو لیے اپنے حصّے میں آئے پتھر پر ڈھیر تھی۔ اس کے مقابل مضبوط توانا خوب رو اور زندگی سے بھرپور انور بیٹھا تھا۔ جو کسی پکے ارادے سے آیا تھا۔ اور شاید دیر تک اسے یہیں ان پتھروں سے صلح رکھنی تھی۔

وہ مضبوط وجود ایک دم گویا ہوا۔

سلینا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ ایک عام سا جملہ ضرور ہے جو آج تک ان گنت لوگ ادا کرتے آئے ہیں لیکن اس ایک جملے کے ہر ایک حرف میں ہر ایک کی دل کی دھڑکنیں مختلف انداز رکھتی ہیں۔ میں بھی ایک مختلف انداز سے یہی ایک جملہ دہرا رہا ہوں۔

انور نے ایک بار پھر دہرایا۔

سلینا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ سُن رہی ہو تم!

سلینا کے دل کی دھڑکنیں سچ مچ بند ہو گئیں۔

مجھے تمہارے جواب کی ضرورت ہے۔ انور سلینا کو خاموش پا کر پھر گویا ہوا۔

سلینا زندہ کب تھی کہ وہ جواب دیتی۔ اب کے انور نے اس کا ہاتھ تھام لیا جو برف سے زیادہ ٹھنڈا تھا۔

سلینا میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں۔

برف سے زیادہ ٹھنڈا ہاتھ اب بھی انور کے ہاتھوں میں تھا۔ سلینا میں دم ہی نہیں تھا کہ وہ اپنا ہاتھ بھی چھڑا سکتی۔

سلینا پلیز کچھ بولو۔ بولو تم۔ انور تقریباً رو پڑا۔

تب سلینا نے پاک مریم کا سہارا لیا۔ مجھے مضبوط بنادے کنواری مریم۔

اب اس کے اندر کی مریم انور سے مخاطب تھی۔

تم میرے مریض ہو انور۔ مجھے... مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ یہ آواز یہ لہجہ سلینا کا نہیں سلینا کراس کا تھا کہ اب اس کا دایاں ہاتھ گلے میں جھولتی ہوئی صلیب کا دفاع کر رہا تھا۔

تم ایک تندرست آدمی سے محبت نہیں کر سکتیں۔ انور کا لہجہ خفگی کا سا تھا۔ وہ سلینا کے اندر کی مریم سے بالکل ہی غافل تھا۔

میرا پیشہ بیماروں سے محبت سکھاتا ہے اور جب یہ بیمار تندرست ہو جاتے ہیں تب وہ ہماری نگاہوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ ہمارا ان سے پھر کوئی رشتہ باقی نہیں رہ جاتا۔ ایسا ہوتا ہے، ایسا ہوتا رہا ہے۔

سلینا مسلسل دفاع کر رہی تھی۔

مگر میں تو تمہارے سامنے ہوں۔ سامنے رہنا بھی چاہتا ہوں۔ انور بھی اپنی وکالت کر رہا تھا۔

میں نے کہا نا، ہم لوگ بیماروں سے محبت کرتے ہیں۔

سلینا کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ وہ اپنے پیشے کی بھرپور نمایندگی کر رہی تھی تو پھر مجھے ایسی صحت نہیں چاہیے۔ جو مجھے تم سے دور کر دے۔ انور کی آواز میں کرب تھا۔

ایسی باتیں نہیں کرتے انور۔ سلینا کا پرانا لہجہ لوٹ آیا۔ سمجھانے کا بتانے کا باز رکھنے کا، منع کرنے کا۔

اپنی خاطر جینا کوئی اچھی بات نہیں۔ تم نہیں جانتے کہ تمہاری بیماری کے دوران تمہارے بھائی۔ تمہاری بہن اور نجمہ بھابھی کی زندگی کیا ہوگئی تھی۔ تم نے وہ پتنگ ہوا میں ڈولتے ضرور دیکھی ہوگی جو ڈور سے کٹ جاتی ہے اور تھوڑی دیر کے لیے فضا میں ویسے ہی اڑتی ہے لیکن پھر وہ کہیں جا کر گر جاتی ہے۔ وہ سب ایک ڈولتی ہوئی پتنگ کی طرح سانس لے رہے تھے۔ تمہارے لیے انہوں نے جو کچھ کیا وہ کوئی اور نہیں کرسکتا۔ یہ میرا ایمان ہے۔ تمہیں تو ان لوگوں کے لیے جینا چاہیے۔ اپنی سوچ کو تعمیری بناؤ۔ سلینا کہے جا رہی تھی۔

سلینا ہر شخص اپنی زندگی اپنے طرز پر جینا چاہتا ہے۔ میں اپنے تمام لوگوں کا احسان مند ہوں۔ میں ان سب سے بے اندازہ پیار کرتا ہوں۔ تم یہ کیوں محسوس کر رہی ہو کہ میں ان کے خلاف جانا چاہتا ہوں۔ میری اپنی ایک خواہش، تمنا اور آرزو ہے۔ اس میں بُرا ہی کیا ہے؟ انور کے لہجے میں تو اب صرف کرب ہی سما چکا تھا۔

انور، غلطیوں کے یادگار نقوش تجربے کا لقب پاتے ہیں۔ تم نے اپنے تجربے سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

سلینا اب اپنی ہی صنف کے خلاف بول رہی تھی۔ اور ایسا کرنے میں اسے اپنے آپ سے لڑنا پڑ رہا تھا۔

لیکن میرا یہ دوسرا تجربہ غلطی نہیں ہے۔ انور نے یقین سے کہا۔

پہلی بار بھی تم نے یہی سوچا ہوگا۔ سچ بتاؤ انور کیا تم نے میبل کے متعلق کبھی منفی انداز سے سوچا تھا۔ مگر اس کا نتیجہ؟

سلینا نے جھجکتے ہوئے میبل کا حوالہ دیا۔

تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو۔ انور کی نظریں نیچی تھیں۔

نہیں انور۔ غلط نہ سمجھو۔ میں نے بارہا تمہیں شرمندگی سے بچایا ہے۔ شاید تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے گھر میں کسی کو بھی میبل کے بارے میں علم نہیں۔ تم نے جب بھی میبل کا نام لیا ہے میں نے اپنی آواز میں تمہاری آواز دبادی ہے تاکہ تم ذہنی روشنی پانے کے بعد اعتماد سے جی سکو۔

سلینا کے لہجے میں کہیں بھی احسان کی جھلک نہیں تھی بلکہ اپنے مریض کے لیے پیار تھا۔

انور کی نظروں میں تشکر تھا۔

سلینا تم نے مجھ پر بہت سے احسانات کیے ہیں۔ میں انہیں کبھی نہیں بھول سکتا لیکن کیا تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتیں کہ اپنی تمام تر محبت مجھے بخش دو۔

انور کے لہجے میں التجا تھی۔ وہ محبت کر بھی رہا تھا اور محبت مانگ بھی رہا تھا۔

انور میری محبت کڑی دھوپ میں اس سایہ دار درخت کی سی ہے جو مسافروں کو بلا امتیاز اپنے ٹھنڈے سائے میں پناہ دیتا ہے۔

سلینا زمین پر اپنے پاؤں سنگریزوں سے لہولہان کر رہی تھی اور بے تکان بولے بھی جا رہی تھی۔

سلینا اس درخت کی اپنی بھی تو کچھ ضروریات ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ظالم اس درخت کی ہری بھری شاخیں کاٹنے پر آمادہ ہو جائے تو اسے ایک نگراں مالی کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے۔

انور کو اب دلیل ہی دینی تھی کہ مقدمہ تو یونہی لڑا جاتا ہے۔

نہیں انور۔ ہم بے پانی کے پودے ہوتے ہیں۔ خودرو جھاڑیوں کے مانند اگتے ہیں۔ اگر کوئی ظالم ہماری کوئی شاخ کاٹ بھی دے تو ہم کبھی گلہ نہیں کرتے۔ اور پھر پھیل کر سایہ کا دائرہ وسیع کر دیتے ہیں۔ ہمیں کسی نگراں یا مالی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ وہ دیکھو بہت

دور تمہیں دو درخت برابر برابر کھڑے نظر آرہے ہیں نا۔ میں وہاں اکثر تمہارے بغیر بھی گئی ہوں۔ درختوں کی اپنی کہانی ہوتی ہے۔ یہ پھیل کر بڑھ کر صدیوں سے ایستادہ ہیں اب ان کے اوپر سے ایک ایسی مرجھائی ہوئی شاخ نیچے کی جانب آرہی ہے جو دوبارہ پھر زمین سے جا ملے گی اور کہیں کہیں جا ملی بھی ہے۔ کتنی ہی سوکھی بے جان شاخیں ہیں اوپر تک گئیں کسی آرزو میں کسی تمنا میں مگر شاید انہیں یہ اونچائی راس ہی نہیں آئی وہ دوبارہ زمین کی طرف بڑھ گئیں۔

زمین ہر ذی روح کی ماں ہوتی ہے سب کو اپنی آغوش میں سمو لیتی ہے۔ ہرے بھرے درختوں کو بھی جنہیں کسی نگراں مالی کی ضرورت ہوتی ہے اور ان بھورے اُدھڑے ہوئے چھال دار درختوں کو بھی جو میری مانند ہوتے ہیں یا میں جو اُن کی مانند ہوں۔

سلینا نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بنجر کہانی سے انور کو مطلع کیا۔

غلط کہتی ہو تم۔ انور خفا ہو گیا۔ صاف صاف کہو سلینا کہ تم مجھے پسند نہیں کرتیں مجھے میرے ماضی کے آئینے میں دیکھتی ہو۔ میرا قصور معاف نہیں کرنا چاہتیں۔ یا شاید تم میبل کا بدلہ مجھ سے لے رہی ہو۔ مگر مان لو سلینا میں نے میبل پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا۔ اس نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا تھا۔ اتنا گرا دیا کہ میں ذہنی توازن ہی کھو بیٹھا۔ سلینا میں اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ میں سچ بول رہا ہوں۔ اور اب میں یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ میں بھی ایک سقراط ہوں اور مجھے سچ کی خاطر گھونٹ گھونٹ زہر پینا ہوگا۔ آج کے بعد میں تمہیں پھر پریشان نہیں کروں گا۔

اور یہ کہتا ہوا انور وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کے مضبوط جوتوں کے بوجھ سے کتنے ہی مرجھائے سوکھے پتے کچلے گئے جن کی آواز سلینا کو اس وقت تک آتی رہی جب تک انور کا سراپا اسے جاتا نظر آتا رہا۔

بچے انور کو جاتا دیکھ کر اس کے پیچھے دوڑے۔ اب سناٹا تھا۔ پتے مسل کر اپنا وجود کھو بیٹھے تھے۔ ہر طرح کی آواز آنی بند ہوگئی۔ سلینا تنہا رہ گئی۔ اور اسے اپنے اردگرد کی ہر شے مرجھائی ہوئی اور زرد نظر آنے لگی۔ یہ گھاس جو اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ درختوں کے

ہرے بھرے سلسلے ۔ رنگارنگ پھول خوش رنگ تتلیاں۔ پاؤں کے نیچے کے ننھے منے پتھر اور وہ پتھر بھی جس پر انور بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چپلیں ڈھونڈیں ۔ انہیں پاؤں میں پہنا۔ مگر اب سب کچھ بے نور تھا۔ سارا جنگل اداس ہوگیا۔ اس کے اپنے وجود کی طرح۔ وہ دیر سے جھوٹ بول رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک ۔ یہ جھوٹ اس کے اب پرخچے اڑا رہے تھے۔ ہوا، فضا انور کے چلے جانے سے سوگوار تھیں۔ تم کیا چلے گئے چمن کی ساری رنگینیاں ہی ماند پڑ گئیں۔ آخر کار سلینا کو سچ کا سہارا لینا ہی پڑا۔ وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔

انور مجھے تم سے محبت ہے۔ انور میں تم سے محبت کرتی ہوں۔

میں تمہیں کیسے بتاتی؟ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ایسے جیسے بہاروں کے سارے رنگ چرا کر اس نے اپنی آنکھوں میں چھپا دیے ہیں۔ مجھے تم سے محبت ہے انور میں تمہارے ساتھ اپنے کئی کئی جنم بتانا چاہتی ہوں۔ یہ سچ ہے۔ میری روح سے پوچھ لو۔ میرے دل کی دھڑکنوں سے پوچھ لو۔ میری آنکھوں سے پوچھ لو۔ میری شریانوں میں تمہارا ارمان دوڑ رہا ہے۔ تمہارا وجود پیوست ہوگیا ہے۔ ٹٹولو اپنے آپ کو۔ تم اپنی جگہ کچھ بھی نہیں رہ گئے ہو سب کچھ تو اب مجھ میں سما گیا ہے۔

پھر اس نے اپنے دونوں ہونٹوں کو چباتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ بہار کے سارے رنگ اس کی آنکھوں سے قطرہ بن کر ٹپک پڑے۔

مگر انور زندگی میں صرف ایک ہی سچ نہیں ہوتا۔ کئی سچ اور بھی ہوتے ہیں۔

ڈیوڈ بھی ایک حقیقت ہے ۔ آؤ ڈیوڈ مجھے سنبھالو کہ میں تمہاری ہوں۔ تم جو میری کسی ایک بھی نس میں سمائے ہوئے نہیں ہو۔ میرے دل کی دھڑکنوں نے کبھی تمہارے دل سے تال میل نہیں رکھا۔ میری آنکھوں میں تمہارے نام کا ایک بھی خواب چھپا ہوا نہیں ہے۔ مگر ڈیوڈ تم میرے ہو اور میں تمہاری ہوں وہ اب گھاس پر سکڑی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ سارے پیلے مرجھائے پتے جو انور کے بوٹ تلے آ کر کرچی کرچی ہوگئے تھے اب سلینا ان ہی کرچیوں کے درمیان تھی۔ کیا خود سلامت رہ گئی تھی؟

اس نے پوری قوت سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اونچے اونچے درختوں کے درمیان کہیں کہیں

سے جھانکتے آسمان سے پوچھ بیٹھی۔

''میرے خواب کیا ہوئے۔ کہاں گئے؟''

اس نے ابھی آسمان سے یہ سوال کیا ہی تھا کہ بارش کے ننھے ننھے قطرے اس کے وجود کو بھگونے پر تُل گئے تب وہ چونک کر کھڑی ہوگئی تو آسمان کا کلیجہ بھی شدتِ جذبات سے پھٹ پڑا۔

وہ تلخی سے مسکرائی اور آہستہ آہستہ چلتی حویلی میں داخل ہوگئی۔

۲۶

.....سلینا اپنے دل کو مُٹھی میں لینا چاہتی تھی۔ دل اچھل کر اس کی مُٹھی سے نکل جاتا۔ وہ پریشان تھی یہ ایک لمحہ اس کی زندگی میں کیسے آ گیا جسے آنا ہی نہیں چاہیے تھا...

سورج غروب ہو رہا تھا۔ سلینا اپنے کمرے سے لان پر کھلنے والے دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھی بغور آسمان تک رہی تھی۔ اک بیکراں وسعت تھی۔ دور دور تک اس کی نظریں جا رہی تھیں۔ آسمان دنیا کی چھت ہے اس چھت کے نیچے بے شمار مکان ہیں اور ان مکانوں میں لاکھوں کروڑوں لوگ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے واقف بھی نہیں ہوتے ان کی زبان ان کے لباس ان کی تہذیب سب ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہے۔ وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتے ہیں۔ چہرہ دیکھ لیتے ہیں۔ دلوں میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتے کہ دل کی دیوار بہت اونچی ہوتی ہے۔ آر پار کچھ بھی نظر نہیں آتا لیکن جانے یہ کیا معجزہ ہے کہ دو لوگ اچانک ملتے ہیں اور لمحے بھر میں ان کے دلوں کی دیواریں ٹوٹ پھوٹ کر گر جاتی ہیں اور وہ اپنے دل میں چھپے ان چھوے راز دوسرے کے دل کی دہلیز پر چپکے سے رکھ دیتے ہیں۔ اس لمحے اچانک ساری کلیاں کھل جاتی ہیں۔ تتلیاں رنگین پروں کے ساتھ ادھر اُدھر اڑنے لگتی ہیں۔ تارے دمکنے لگتے ہیں۔ چاند مسکرا پڑتا ہے اور سورج کی کرنیں کچھ اور بھی تاب ناک ہو جاتی ہیں۔ رات کا اپنا حسن

ہوتا ہے۔ دن اپنی خوب صورتی بکھیرتا ہے۔ آنکھوں کی بینائی بڑھ جاتی ہے اور ساری دنیا حسین لگنے لگتی ہے اس کی بدصورتی کہیں جا کر اپنا منہ چھپالیتی ہے۔ اس ایک لمحے میں ساری دنیا نزدیک آ جاتی ہے۔ ساری موسیقی سمٹ کر ان دو دلوں کی دہلیز پر سجدہ ریز ہوجاتی ہے۔

سلینا اپنے دل کو اپنی مٹھی میں لینا چاہتی تھی دل اچھل کر اس کی مٹھی سے نکل جاتا۔ وہ پریشان تھی یہ ایک لمحہ اس کی زندگی میں کیسے آ گیا جسے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اس نے کس کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن کیا آنکھیں بند کرنے سے آسمان چھپ جاتا ہے۔ دور تک پھیلے ہوئے اونچے اونچے درخت، پہاڑوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے، دور تک پھیلی ہوئی مخملی گھاس، رنگا رنگ پھولوں کی قطار در قطار اسے تو بند آنکھوں سے سب ہی کچھ نظر آ رہا تھا۔ وہ شہر کے ایک اسپتال سے چل کر اس دور دراز سنسان علاقے تک آ گئی تھی جہاں اس ایک مکان کے علاوہ کوئی دوسرا مکان تک نہ تھا۔ یہاں کی بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں پر کوئی چلتا پھرتا نظر نہیں آتا۔ یہاں سورج صرف اس ایک گھر کے لیے نکلتا تھا یہاں تارے صرف اسی ایک گھر کے لیے ٹمٹماتے، سر پر چاند روزانہ مسکراتا، بس یہاں کے ہی مکینوں کے لیے۔ سردی گرمی بارش سب ان کے ہی لیے آتی۔ اب ان چند لوگوں میں ایک اس کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ ایک ایسے مخبوط الحواس بچے کی دیکھ بھال پر وہ مامور ہوچکی تھی جو گھاس پھونس کی کٹیا میں صابن کے غبارے ہوا میں اڑاتا تھا اور جسے وہ سیارہ کہتا تھا جسے وہ چاند تک بھیجنا چاہتا تھا۔ ذہنی طور پر وہ بچہ تھا لیکن ذہن واپس آتے ہی وہ بچہ ایک خوب رُو نوجوان بن چکا تھا جو اپنی زندگی کے انتہائی خوب صورت موڑ پر کھڑا تھا۔ اپنا صاف شفاف امیدوں اور آرزوؤں سے بھرا دل لیے اور اس نے بس ایک لمحے میں اپنے دل کے گرد بنی ہوئی دیوار ڈھادی، وہ جو اس سے دور فاصلے پر کھڑی تھی۔ یسوع مسیح کی تصویر کے آگے سجدہ ریز ہوئی اس کے دل نے اچانک اچھل کر اسے ایک پیغام دے دیا۔ وہ گھبرا گئی کیوں کہ وہ جذباتی لڑکی نہیں تھی۔ اس نے تو اپنے دل کو مقفل کر کے رکھا ہوا تھا مگر اچانک آپ ہی آپ وہ تالا کھل گیا۔ انور پوری آن بان شان کے ساتھ اس کے

دل کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ وہ پھر سے دروازہ بند کرنا چاہتی تھی مگر قدرت کے اپنے دستور ہوتے ہیں۔ ایک راگ پر بیک وقت دو گیت نہیں گائے جاتے۔ بس ایک گیت کے بول میں دونوں بندھ گئے۔

سلینا غروب ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ رہی تھی اور اس کا ذہن اسے اپنے بچپن میں لے گیا۔ اس گھر میں لے گیا جہاں یہی آسمان اس گھر کی بھی چھت تھا۔ دھوئیں سے بھرے ایک شہر کے جس مکان میں پیدا ہوئی تھی وہ بڑے بڑے کارخانوں میں گھرا ہوا تھا جو دن رات چلا کرتے اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ اس کی ماں ایک دفتر میں اسٹینو ٹائپسٹ تھی۔ اور جانے کیسے اسے اس کا باپ مل گیا۔ بس دو دلوں کی دیوار ایک دم زمیں بوس ہوئی۔ ایک راگ اور ایک گیت دونوں نے اس دھوئیں بھرے شہر کے شور میں پر سکون ہو کر ایک دوسرے کو اپنالیا۔ پھر ایک دن یونہی سورج غروب ہوتے وقت وہ بھی پیدا ہوگئی۔ لیکن شاید اس گھر میں جس میں وہ دونوں رہتے تھے تیسرے کی گنجایش ہی نہیں تھی کہ اس کے باپ نے اچانک بغیر کسی نوٹس کے اس گھر کو خیر باد کہہ دیا اور ماں کی تنہائیاں اذیت ناک بن گئیں۔

دن، مہینے، سال گزرے ماں کو اسمتھ مل گیا اور اسے مشنری ادارہ۔

سلینا نے اپنا سر دونوں گھٹنوں میں چھپایا اور سسک پڑی۔

زندگی بھر کی کہانی کیا منٹوں میں بُنی جاتی ہے۔ لکھی جاتی ہے۔ پڑھی جاتی ہے اور ختم کر دی جاتی ہے۔ اس نے اپنے دل کو آنسوؤں کے سیلاب میں تیرتے ہوئے محسوس کیا۔ میں اپنے اس ننھے سے دل کو اس سیلاب سے کیسے بچاؤں۔ اسے آپ ہی آپ اس پر ترس بھی آیا۔ وہ اب بھی گھٹنوں میں ہی سر دیے ہوئے تھی کہ ندیم اور افسر دوڑتے ہوئے آئے اور اس کی پیٹھ پر سوار ہو گئے۔

سلینا آنٹی آپ گھوڑا بن گئیں۔ دونوں ایک ساتھ بولے۔ سلینا کا دل سیلاب کے پانی سے نکل کر اپنی جگہ چار دیواری میں بیٹھ گیا اور اس نے اپنا سر اٹھاتے ہوئے ندیم کو اپنی گود میں سمیٹ لیا اور سیدھے ہاتھ سے افسر کو اتار کر اس کے ہی پیروں پر کھڑا کر دیا۔

افسر سلینا کے پہلو میں بیٹھ گیا۔
آنٹی آپ رو رہی ہیں۔ ندیم نے اس کے روکھے پھیکے چہرے کو دیکھ کر ایسا ہی سمجھا۔
نہیں۔ میں کہاں رو رہی ہوں۔ سلینا نے اپنے آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے جواب دیا۔ اور سوچنے لگی نجمہ کتنی خوش قسمت ہے اسے چاہنے والا شوہر اور دو پیارے پیارے بیٹے میسر ہیں۔ پھر شاکرہ ہے۔ انور ہے۔ ان سب نے مل کر اس گھر کی فضا کو کتنا خوش گوار کر رکھا ہے۔ نجمہ کی چال میں کس قدر خود اعتمادی ہے۔ اس کے چہرے پر کتنا سکون ہے۔ کیوں نہ ہو۔ اسے محبت کرنے والے لوگ جو میسر ہیں۔ سلینا کی آنکھوں سے کتنے ہی قطرے ٹپک کر مٹی میں مل گئے۔ عورت کو محبت بھرا گھر مل جائے تو سمجھو اسے دنیا میں جنت مل گئی۔
ایک میں ہوں۔ سلینا فوراً ہی اپنی ذات کو اپنی سوچ میں گھسیٹ لائی۔
آنٹی کوئی کہانی سنائیں۔ افسر نے فرمائش کی۔
ہاں آنٹی آج تو ہم آپ سے کہانی ضرور سنیں گے۔ کل ہمیں انکل نے سنائی تھی۔
ندیم نے کہا۔
اچھا۔ سلینا نے حیرت سے کہا۔ تمہیں یاد ہے وہ کہانی۔
ندیم اور افسر دونوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔
وہ کیا تھی ہم بھی تو سنیں۔ سلینا خود کہانی سنانے سے بچنا چاہتی تھی۔
انکل کہہ رہے تھے۔ ایک گھر میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ اس سے سب محبت کرتے تھے۔ مگر وہ سب کو چھوڑ کر بہت دور چلا گیا۔ وہاں اسے ایک لڑکی ملی۔ اس لڑکے کو وہ لڑکی بہت اچھی لگی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اس کے بال بھورے تھے۔ اس کا رنگ بہت گورا تھا۔ وہ اونچی ایڑی کے سینڈل پہنتی تھی۔ اس کے کپڑے بہت خوب صورت ہوتے مگر دراصل وہ لڑکی تھی ہی نہیں وہ تو چڑیل تھی۔ اچانک اس نے اپنا چہرہ بدل لیا۔ آنکھیں بھی بدل لیں۔ اسے شاید جادو آتا تھا۔ اس نے ایک دوسرا دوست بنالیا تھا اور ان دونوں نے مل کر اس بے چارے لڑکے کا خوب مذاق اڑایا۔ لڑکا برداشت نہیں کر پایا اور پاگل ہوگیا۔ ٹھہر ٹھہر کر ان دونوں نے مل جل کر یہاں تک کی کہانی دہرادی۔

پھر کیا ہوا؟ سلینا نے اشتیاق سے پوچھا۔
اس لڑکے کو پھر ایک دوسری لڑکی مل گئی وہ بالکل پری تھی پری۔ وہ اسے بہت چاہتی تھی۔ خود ہاتھ منہ دھلاتی اسے نہلاتی۔ کپڑے پہناتی۔ کھانا کھلاتی۔ سیر کے لیے بھی لے جاتی۔ بیمار ہوتا تب دوا بھی پلاتی۔ اس کی خاطر ساری ساری رات جاگا کرتی۔ اس کے لیے روتی بھی تھی۔ اور اس کے ٹھیک ہوجانے پر خوشیاں بھی مناتی۔ پھر پتا ہے آنٹی وہ لڑکا بالکل ٹھیک ہوگیا۔
اچھی تھی ناوہ لڑکی۔ ندیم نے سلینا کی بھی رائے لینی ضروری سمجھی۔
ہاں ہاں۔ وہ اچھی تھی مگر پھر آگے کیا ہوا؟ سلینا کو تجسس تھا۔
مگر آنٹی جیسے ہی وہ لڑکا اچھا ہوا نا وہ لڑکی بھی بدل گئی اور اب تو وہ لڑکے سے بات بھی نہیں کرتی۔ انکل کہہ رہے تھے اب وہ بھی کسی لڑکے سے مل کر اس کا مذاق اڑائے گی۔ اور پھر،
پھر کیا ہوگا۔ سلینا نے گھبرا کر پوچھا۔
انکل کہہ رہے تھے۔ اب کے وہ لڑکا مر جائے گا۔
نہیں۔ یہ غلط ہے سلینا چلائی۔ یہ غلط ہے ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔
ندیم اور افسر حیران تھے۔ آنٹی کیا آپ کو معلوم ہے وہ لڑکا نہیں مرے گا؟
ہاں مجھے معلوم ہے وہ لڑکا نہیں مرسکتا۔ وہ بہت اچھا ہے۔ بہت معصوم ہے۔ اب کے وہ لڑکی اسے مرنے سے بچالے گی۔ اور بالکل اس کا مذاق نہیں اڑائے گی۔
سچ۔ دونوں بچے خوش ہوگئے۔
مگر شاید وہ اسے نہ بھی بچاپائے۔ سلینا نے آپ ہی آپ دہرایا لیکن بچوں نے زیرلب ادا کیے گئے یہ الفاظ سن لیے۔
کیوں آنٹی۔ افسر نے بے چینی سے پوچھا۔
اس لیے کہ وہ لڑکی تو خود ہی کب کی مرچکی ہے۔ سلینا کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔
مگر یہ تو انکل نے ہمیں بتایا ہی نہیں۔
انکل کو معلوم ہی کب ہے؟ وہ لڑکی تو اسی دن اس پر مرمٹی تھی جس دن وہ اس لڑکے

سے ملی تھی۔
کیوں آنٹی؟ ندیم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی ایک اور سوال کر دیا۔
وہ لڑکا تھا ہی اس قابل۔ بڑا پیارا۔ بے حد پیارا۔ اور سلینا نے یہ کہتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے وہ اس لڑکے کی شبیہ اپنی آنکھوں میں مقید کر لینا چاہتی ہو۔ جیسے وہ بند آنکھوں سے آپ ہی آپ کوئی اقرار کرنا چاہتی ہو۔
اسی لمحے پیچھے سے انور نے آ کر سلینا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔
پہچان جاؤ تو چاکلیٹ ملے گی۔ انور نے شوخی سے کہا۔
ہٹاؤ اپنا ہاتھ۔ سلینا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے انور کی گرفت کمزور کرنی چاہی اتنا کمزور نہ سمجھو۔ انور نے گرفت اور مضبوط کر دی۔
بتاؤ گی نہیں تو چھوڑوں گا بھی نہیں۔
افسر بولا۔ بتا دیجیے آنٹی چاکلیٹ ملے گی۔
ہاتھ ہٹاؤ۔ سلینا پھر خفگی سے بولی۔
آنٹی، انکل ہیں آپ نام بتا دیجیے نا۔ ندیم نے سلینا کے کان میں چپکے سے اطلاع دی۔
انور۔ اب کے سلینا بہت خفا تھی۔
انور نے دونوں ہاتھ اس کی آنکھوں پر سے ہٹا دیے۔
لیجیے۔ اس نے جیب سے چاکلیٹ نکال کر سلینا پر اچھال دی۔
سلینا ندیم کو گود سے اتار کر کھڑی ہوگئی۔ اور اس نے کوشش کی کہ وہ اپنے غصّے کو پی جائے۔
اتنے میں افسر نے انور کو اطلاع دینی ضروری سمجھی۔
انکل وہ لڑکی بھی مر گئی تھی۔
کون سی لڑکی؟ انور نے پوچھا۔
اور سلینا گھبرا کر لان سے ہوتی ہوئی کوٹھی کے عقبی حصّے کی طرف چلی گئی۔
وہی لڑکی انکل جس کی آپ نے کہانی سنائی تھی۔ افسر نے بات مکمل کی۔

اچھا۔ تمہیں کس نے بتایا۔ انور نے دور جاتی ہوئی سلینا پر نظریں جما دیں۔

سلینا آنٹی کہتی ہیں۔ وہ لڑکی تو اسی دن مر گئی تھی جس دن اس نے اس لڑکے کو دیکھا تھا۔

اور انکل آپ تو کہہ رہے تھے کہ اب وہ اس کا مذاق...

اوہ! مجھے نہیں معلوم تھا انور نے اس کی بات کاٹی اور خود سلینا کے پیچھے بھاگا۔

سلینا تاریکی میں ایک درخت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے کھڑی تھی۔

انور نے اس کے پاس جا کر ہولے سے آواز دی۔

''لڑکی''

سلینا پلٹ پڑی۔ سامنے انور کھڑا تھا۔ اندھیرے میں وہ اسے صاف نظر آ رہا تھا یا وہ اسے دیکھ رہی تھی یا دل کا آئینہ اس کی آنکھوں میں فٹ تھا۔

وہ لڑکی اسی دن مر گئی تھی۔ جس دن...

جس دن وہ لڑکا صحت یاب ہو گیا۔ سلینا نے جلدی سے انور کا جملہ کاٹ کر دل کے آئینے میں ایک دراڑ ڈال دی۔ کسی نے سنا ہو یا نہیں مگر دونوں ہی نے ٹوٹنے کی چیخ سن لی تھی۔

معاف کرنا سلینا میں خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اور وہ تیز تیز قدموں سے چلتا باہر کے پھاٹک سے دور نکل گیا۔ وہ گیا اندھیرے میں تھا لیکن سلینا کو اس کے ہر قدم سے روشن چمک دار لکیر بنتی نظر آ رہی تھی۔ یقیناً وہ کوئی معمولی انسان نہیں۔ ایسا انسان ہے جس نے سلینا کے پتھر دل اور بند دروازے پر اس زور سے دستک دے دی تھی کہ وہ اب تک حیران تھی۔

انور دور تک جاتا اسے محسوس ہوا اور پھر اندھیرے میں گم ہو گیا۔

کہیں اسے ہوا نہ لگ جائے۔

سلینا نے خاص نرس والے انداز میں سوچا۔ اور اپنے آپ کو یقین بھی دلایا کہ وہ بس ایک نرس ہے۔

۲۷

.....اسے اب یہ یقین ہو چلا تھا کہ اس کے بدن میں ایک اور بدن سمایا ہوا ہے۔ ایک اور دل ہے۔ ایک اور دماغ ہے جو بہ یک وقت اپنے اپنے کام کر رہے ہیں۔ جوڑنے کے توڑنے کے۔ وفا کرنے کے وعدہ توڑ دینے کے...

ایک کے بعد ایک، کتنے ہی دن گزر گئے۔ انور نے دوائیوں کی ڈھیروں شیشیاں خالی کردیں۔ اس کے زخم مندمل ہوگئے۔ اس کا حافظہ واپس آ گیا۔ اس کی جسمانی کمزوری بھی دور ہوگئی مگر وہ انور جسے اس گھر میں پلٹ کر آنا چاہیے تھا اب تک نہیں آپایا تھا۔ یہ ایک گتھی تھی جسے نجمہ، شاکرہ اور اطہر بھی نہ سلجھا پائے۔ سلینا ہر راز سے واقف تھی۔ ماضی اور حال کے پل پل سے آگاہ تھی، لیکن اسے بے خبر رہنے کا کھیل کھیلتے رہنا تھا۔ اسی میں سب کی بھلائی تھی۔ کبھی کبھی وہ تلخی سے سوچتی بھلائی کے مفہوم میں اب کیا رکھا ہے۔ بات تو اب کچھ اور ہی ہے۔ بس اب کچھ ان ہونی نہیں، ہونی ہے۔ کوئی تماشا نہیں ہونا چاہیے سمندر کو پر سکون رہنا ہے۔ ایک کنکری بھی سمندر میں اچھال لے آئے گی اور پھر نہ جانے اس میں کون کون بہہ جائے۔ اس نے اردگرد سے ہر طرف سے کنکریاں چن کر اپنے دامن میں چھپالی تھیں۔ وہ روز صبح حسب معمول یسوع مسیح کی تصویر کے سامنے عقیدت سے سر جھکا کر کھڑی ہوجاتی آنکھیں بند رکھتی۔ ہونٹوں سے ثابت قدم رہنے کی قسمیں کھاتی اور بار ہا گلے میں لٹکی صلیب پر ہاتھ پھیرتی۔

مجھے قوت دے مالک۔ مجھے ثابت قدم رکھ۔ مجھے امتحان میں پاس کردے۔ مجھے رسوانہ کر۔ میری نسل کی آبرو کی حفاظت کر۔ صبح صبح وہ یہ سارے وظیفے دہراتی۔ دن بھر قدم قدم پر اس کے وظیفے کی دھجیاں بکھر جاتیں۔ وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی تھی۔ اسے اب یہ یقین ہو چلا تھا کہ اس کے بدن میں ایک اور بدن سمایا ہوا ہے۔ ایک اور دل ہے۔ ایک اور دماغ ہے جو بیک وقت اپنے اپنے کام کررہے ہیں۔ جوڑنے کے، توڑنے کے، وعدہ وفا کرنے کے، وعدہ توڑ دینے کے۔ وہ اپنے آپ سے جھنجلا جاتی۔ وہ تو اپنے جانتے میں صرف ایک ہی دل رکھتی تھی جسے وہ کنواری مریم کو اکثر کھول کھول کر دکھاتی۔ یسوع مسیح کی صلیب والی تصویر کے آگے دوزانو ہوتے ہوئے وہ اپنے دل کو مٹھی میں جکڑ بھی لیتی کہ وہ ادھر اُدھر نہ ہوجائے۔ بس اس کی مٹھی میں رہے۔ اس کی گرفت میں رہے اور وہ خود بھی قابو میں رہے۔ کمرے سے باہر قدم رکھتے ہی وہ دل اچانک اچھل کر اس کے حلق میں آجاتا۔ اکثر تو اس کی سانسیں بھی بند ہوجاتیں۔ وہ قریب ہی کسی جگہ بیٹھ جاتی ٹِک جاتی۔ اپنے آپ کو دوبارہ زندہ کرتی۔ اپنے دل کو پیار سے سمجھاتی۔ بتاتی کہ دل کو تو بس ایک ہی طرح سوچنا چاہیے۔ اسے ایک ہی جگہ ٹھہرے رہنا چاہیے۔ مگر دل اب اس کا اپنا کب رہ گیا تھا۔

ایک ایسے دن جب کہ وہ اپنے دل سے بہت سارے وعدے کرلینے کے بعد کمرے سے باہر آئی تب راہداری میں اسے انور اسی کی جانب آتا نظر آیا۔ وعدہ ٹوٹنے لگا۔ دل دھڑکنے لگا۔

تمہارا خط ہے سلینا۔ انور نے ایک لفافہ سلینا کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے دیکھا دوسرا لفافہ وہ خود کھول رہا تھا۔ سلینا نے اپنا لفافہ پکڑے پکڑے تجسس سے انور کے لفافے پر نظر ڈالی۔ لندن کی ڈاک تھی۔

میبل کا نہ ہو۔ سلینا کے ذہن میں یک بارگی خیال آیا۔

انور نے ایک نظر میں خط پڑھ کر اس کے پرزے پرزے ہوا میں اڑا دیے۔

سلینا کے قدم اب تک رکے ہوئے تھے۔ لفافہ اس کے ہاتھ میں موجود تھا جس پر اس نے

نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ وہ تو انور کو دیکھ رہی تھی۔ پل بھر میں میلوں دور سے سفر کرتی ہوئی تحریر ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ کتنی کمزور تھی اس کی آواز جسے انور نے سننا گوارا ہی نہیں کیا۔ ویسے میبل تمہارے ساتھ سلوک تو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ انور کے اس کرب سے آگاہ تھی جس نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ دنیا اور ہر رشتے سے بیگانہ کر دیا تھا۔ اب اسے پھر انور کیوں یاد آ رہا ہے۔ اور یہ کتنا غلط ہوگا۔ بار بار اگر اس نے انور کو آواز دی تب انور کیا کرے گا۔ وہ اب ایک اور راستے پر چل پڑا ہے۔ کمزور دل کا مالک ہے۔ دل پھر اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے اسے بہت ڈر لگا۔

آپ نے اب تک اپنا لفافہ کھولا بھی نہیں۔ انور نے سلینا کی طرف دیکھا جو ابھی تک لفافہ گھما پھرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے کب یہ پتا تھا کہ وہ اپنے لفافے کے بارے میں نہیں اس کے لفافے کی فکر میں ہے۔

پڑھ لوں گی اطمینان سے۔ سلینا کی آواز بہت مدھم تھی۔

اور انور نے سوچا۔ خط خط میں بھی تو فرق ہوا کرتا ہے نا..

سلینا نے ایک نظر انور کے چہرے پر ڈالی۔ کھوئی کھوئی سی نظریں اور اداس چہرہ۔ یہ نظریں اور یہ چہرہ انور کا تو نہیں تھا۔ کیا اس کے بدن میں بھی کوئی ایک اور بدن سمایا ہوا ہے۔ جو وقت پڑنے پر چہرہ، آنکھیں، دل، سوچ سب کچھ بدل لیتا ہے۔ اس نے پاؤں کے نیچے آتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پرزوں کو دیکھا۔

تو انور میبل نے تمہیں ایک بار پھر یاد کیا ہے۔ سلینا نے آپ ہی آپ کہا۔

تم بھی کس عذاب میں گرفتار ہو گئے ہو۔ زندگی کے عجب انداز ہوتے ہیں۔ اس کا فلسفہ بھی خوب ہے جس سے ملنا چاہو وہ کبھی نہیں ملتا۔ اور جس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہم ہر لمحے اس کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تم نے میبل کا ساتھ چاہا تھا تمہیں نہ ملا۔ اور اب تم میرا ساتھ چاہتے ہو تو میبل کی ڈاک آتی ہے۔ کون جانے اس میں ملنے کی کتنی تمنائیں تحریر کا روپ دھار کر تم تک پہنچی ہیں۔

مجھے ہی دیکھ لو۔ میں تمہیں چاہتی ہوں انور۔ پھر اس نے فوراً ہی صلیب کی طرف سے اپنی

نظریں ہٹالیں۔ میں دوسری سمت بھاگ رہی ہوں۔ اس راہ پر چل رہی ہوں جو ہر آن مجھے تم سے دور کر رہی ہیں۔ اس نے صلیب پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور انور سوچ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ خط سلینا کے محبوب کا ہو جسے وہ تنہائی میں بہت چاہت کے ساتھ پڑھے گی۔

دونوں کتنی دیر اس راہداری میں کھڑے ایک دوسرے کی سوچ کا سرا پانے کی کوشش کرتے رہے۔ دونوں نے اپنی اپنی راہ لی کہ ابھی منزل کا تو تعین ہوا بھی نہیں تھا۔

سلینا لفافہ تھامے اپنے کمرے میں آ گئی۔

خط ڈیوڈ کا تھا۔ ہمیشہ کی طرح بے انتہا محبت بھرے جملوں سے شروع ہوا اپنی بے چینی تنہائی اور مل جانے کی ان گنت خواہشات سمیٹے ہر خط مجسم ڈیوڈ کی شخصیت بن کر سلینا تک پہنچا کرتا۔

خط کا خلاصہ بس اس قدر تھا کہ تم جلد اپنی ملازمت سے فراغت پالو۔ آئندہ ماہ میں تم تک پہنچ جاؤں گا۔

یہ ایک سیدھا سادھا خط بھی تھا اور ان تمام معاہدوں کے مطابق تھا جو سلینا اور ڈیوڈ کے درمیان طے پایا تھا کہ اب مزید زندگی ضائع کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

سلینا کے دل کی بے چینی اپنے عروج پر تھی لیکن پھر بھی اس رات کھانے پر سلینا نے نہ چاہتے ہوئے بھی اطہر سے واپسی کی اجازت مانگی۔ اور یہ سن کر اطہر کو دو منٹ تک کھانے کی میز گردش کرتی نظر آئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میز کو تھام لیا جو اپنی جگہ ٹھہری ہوئی تھی۔ پھر اس نے اپنی پلیٹ کو پکڑ لیا جواب بھی اس کے ہی سامنے رکھی تھی۔ اس نے جلدی سے روٹی کا نوالا بنایا سالن میں ڈبویا اور جلدی سے منہ میں رکھ لیا۔ بھلا منہ میں کچھ ہوتو بولا جا بھی سکتا ہے۔ اطہر نے شاید نہ بولنے کے لیے یہ وقفہ خود پیدا کیا تھا۔

سلینا کی نظریں نیچی تھیں۔ پلیٹ اب تک خالی تھی اور اس نے اسے جان کر خالی ہی رکھا ہوا تھا۔ اس کی بھوک مر چکی تھی۔ یا وہ خود بھی کب زندہ تھی۔

اطہر نے لقمہ نگلا تب وہ بولا۔

سلینا تم جانے کا کہہ رہی تھیں۔ اطہر کا جواب نہیں بلکہ ایک سوال ہی تھا۔

جی۔ سلینا کے حلق میں بغیر کچھ کھائے کوئی نوالا اٹک گیا۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ نجمہ نے تڑپ کر نوالا پلیٹ میں لوٹا دیا۔

میرا کام اب ختم ہو چکا ہے بھابھی۔ سلینا نے اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے کہا۔

نہیں سلینا اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ شاکرہ بھی بے چین تھی۔

سلینا اب کے خاموش تھی۔ اس میں ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ ان محبت بھرے دلوں کو یوں توڑتی چلی جاتی۔ وہ تو محسوس کر رہی تھی کہ جیسے اس کی آواز کے ساتھ خود اس کا وجود ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔

سلینا نے اپنی زندگی کے ان چند مہینوں میں جینے کا عجب روپ دیکھا تھا اور یہ اسے اس قدر بھا گیا تھا کہ ایسے ماحول کو چھوڑ کر اسپتال کی سسکتی ہوئی فضا میں لوٹ کر جانے پر وہ مرجانے کو ترجیح دینے لگی تھی۔

مگر۔ ایک دن بہر حال اسے جانا ہی ہے۔ وہ صلح سے سوچنے کی کوشش کرتی تو ہزار دلیلیں اس کے سامنے آجاتیں۔ اسے اپنی زندگی کو اپنے طرز پر گزارنے کا حق تو حاصل ہے وہ کیوں نہ اسے اپنی سوچ کے مطابق گزارے جب کہ اس گھر والے اسے پورے طور پر قبول کرنے کو تیار ہیں۔

مگر۔ ایک اور مگر اس کے سامنے آجاتا۔ وہ اس گھر میں مہمان بن کر آئی ہے، ایک نرس بن کر آئی ہے۔ مہمان بھی واپس چلا جاتا ہے اور نرس بھی اپنا کام مکمل کر کے واپس ہو جاتی ہے۔ رہنے والے رہ جاتے ہیں جیسے اس گھر میں سب رہ رہے ہیں کہ اللہ نے انہیں اس گھر کے لیے بنایا ہے اور مجھے اس گھر کے لیے نہیں بنایا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سمجھایا کرتی۔

کھانا جوں توں ختم کر کے سب اپنے اپنے جذبات چرائے میز سے اٹھ گئے۔ اور اس رات ڈرائنگ روم ویران رہا۔ نہ وہاں وائلن کے تار کسی نے چھیڑے نہ کسی نے چلغوزوں سے شغل کیا۔ نہ کسی نے آتش دان کی آگ روشن کی۔ آج کی رات ہر دل آتش دان تھا۔ سب اپنے اپنے احساسات کی آگ میں جل رہے تھے۔

مگر سلینا اور انور کے دل میں لگی آگ کچھ اور ہی تھی۔ دونوں

خاموش اپنی اپنی آگ میں مر مٹنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کررہے تھے۔ مگر شعلے تھے کہ بھڑکتے جارہے تھے اور بے چینی تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔ اس رات انور نے سگرٹ کے کتنے ہی پیکٹ خالی کردیے ایش ٹرے راکھ اور سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے جلے بجھے ٹکڑے اُچھل اُچھل کر میز پر پھیل گئے۔ اس رات سلینا اپنے کمرے میں اکیلی کنواری مریم کے حضور دوزانو ہوکر نہ جانے منہ ہی منہ میں کیا کیا بڑبڑاتی رہی۔

یہ رات سب پر بھاری تھی۔ اور یہ رات یونہی بیت گئی۔

۲۸

..... کسی گھر میں ایسی صبح نہیں طلوع ہوتی۔ ایسی شام نہیں آتی۔ ایسی محبت بھی نہیں پائی جاتی جیسی کہ میں نے یہاں محسوس کی۔ گھر تو سب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں بس ذرا درودیوار کی کانٹ چھانٹ مختلف ہوجاتی ہے۔ اور کھانے کی میز پر جو سارے رشتے ایک ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں وہ الگ الگ ہوتے ہیں...

بچے ہوسٹل جا چکے تھے اور سلینا نے اب تک دوبارہ جانے کا ذکر بھی نہیں چھیڑا تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ چاہ رہے تھے کہ سلینا کی قوتِ گویائی چھن جائے اور وہ کبھی چند الفاظ سمیٹ کر کوئی جملہ ایسا ترتیب نہ دے پائے جس کا مفہوم یہ ہو کہ
''اب میرا کام ختم ہو چکا ہے۔''
ایک دن کھانے سے فارغ ہو کر نجمہ اور شاکرہ سلینا کے کمرے میں سمٹ آئیں۔
سلینا کیا تم نے یہ کبھی محسوس نہیں کیا کہ ہم سب تمہارے عادی ہو چکے ہیں اور تم سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ نجمہ نے بغیر تمہید کے کہا۔
اور بھابھی۔ مجھے بھی آپ سب سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کہ فرداً فرداً آپ سب مجھ سے کرتے ہیں۔ میں بھی اس ماحول کی عادی ہو چکی ہوں۔ یہاں گزارے ہوئے چند مہینے میری تمام زندگی اور گزارے ہوئے سارے دنوں پر حاوی ہو چکے ہیں۔ میں نے پہلی بار کوئی مکمل گھر دیکھا ہے۔ مختلف رشتے دیکھے ہیں۔ سردی گرمی برسات کے سارے ہی موسم محسوس کیے ہیں۔
میں نے یہاں آ کر جانا ہے کہ رشتے کیا ہوتے ہیں اور زندگی کسے کہتے ہیں۔ بھابھی میں

اس سے پہلے بھی کئی گھروں میں رہی ہوں۔ میں نے بہت سارے مریضوں کی تیمارداری کی ہے۔ میں نے اکثر کئی کئی مہینے کسی نہ کسی گھر میں گزارے ہیں مگر میں نے ایسا گھر ابھی تک نہیں پایا تھا۔ کسی گھر میں ایسی صبح نہیں طلوع ہوتی۔ ایسی شام نہیں آتی۔ ایسی محبت نہیں پائی جاتی جیسی کہ میں نے یہاں محسوس کی گھر تو سب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں بس ذرا درودیوار کی کانٹ چھانٹ مختلف ہوتی ہے۔ صبح تو ہر گھر میں طلوع ہوتی ہے۔ شام کے سائے تو ہر آنگن میں یکساں طور پر پھیلتے ہیں مگر کھانے کی میز شاید مختلف ہوتی ہے جہاں سارے رشتے ایک ساتھ ایک وقت میں بیٹھتے ہیں۔ ہوتے ہوں گے ایسے بھی گھر۔ مگر میرا تجربہ محدود ہے۔ مجھے آپ لوگ بہت مختلف، بہت اچھے لگے۔ یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ دل دھڑکنے لگا۔ اور سچ زبان پر آتے آتے رہ گیا۔ ہر گھر میں انور تو نہیں ہوتا نا۔ ہر انور کے لیے دل یوں سچ تو نہیں بولتا۔ ہر انور کے لیے دل یوں تو نہیں دھڑکتا۔ میں اس انور کو چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ جانے وہ کس سے سوال کر رہی تھی خاموش آواز میں۔ چپکے چپکے، روتے روتے۔

تو سلینا پھر تم نے جانے کا خیال کیوں کیا؟ نجمہ مطلب پر آ گئی۔

بھابھی میں تو اس گھر میں مہمان ہی تھی نا۔ جانے کے لیے تو آئی تھی۔ آپ جانتی ہیں میں ریڈ کراس سے وابستہ ہوں۔ انہوں نے نرسنگ کی مفت تربیت دی ہے۔ اور اب وہ یہ حق رکھتے ہیں کہ مجھے جس طرح چاہیں رکھیں۔ استعمال کریں۔ اسپتال میں یا مختلف گھروں میں۔ یونہی چلتے پھرتے رہنا ہی میرا مقدر ہے۔ سلینا نے اپنے بارے میں رک رک کر سب بتا دیا۔

لیکن تم نے اب تک جتنی خدمات انجام دی ہیں اس سے ان کی تربیت کے اخراجات تو پورے ہو چکے ہیں۔

نہیں بھابھی۔ ماں باپ اپنی اولاد کی پرورش پر جس قدر بھی رقم خرچ کرتے ہیں وہ انہیں کبھی واپس نہیں ملتی۔ دراصل اخراجات اہم نہیں ہوتے۔ وہ وقت وہ لمحہ اہم ہوتا ہے جب کوئی کسی کے زیرِ سایہ ہوتا ہے۔

لیکن۔ نجمہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ سلینا نے جملہ کاٹ دیا۔
جن کے ماں باپ نہیں ہوتے ان کی پرورش کرنے والے ہی ماں باپ کہلاتے ہیں۔ اولاد پر بھی تو کچھ فرض عائد ہوتا ہی ہے نا۔ چاہے وہ ان کی اولاد ہو یا نہ ہو۔ پیدا کرنا کہاں اہم ہوتا ہے۔ ہوتا تو ماں باپ یوں انجان نہ بن جاتے۔ سلینا کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔
ٹھیک ہے۔ سلینا تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر جانے کیوں ہمارا دل بے قرار ہوجاتا ہے تمہارے چلے جانے کے ذکر ہی سے۔ کیا تم یہاں کوئی تکلیف محسوس کر رہی ہو؟
''تکلیف''سلینا آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ ہنس پڑی۔
بھابھی اس چار دیواری میں تکلیف نامی کوئی چیز پائی بھی جاتی ہے۔ یہاں تو راحت ہی راحت ہے۔ خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔ محبت ہی محبت ہے۔ جتنی چاہو سمیٹ لو۔ دامن تنگ پڑجائے گا خوشیاں امنڈتی چلی آئیں گی۔ کوئی بدذوق ہی ہوگا جو اس حسین جگہ کو چھوڑنے پر آسانی سے آمادہ ہو۔
لیکن تم نے تو بڑی آسانی سے جانے کا اعلان کردیا۔
یہ تو میرا ہی دل جانتا ہے کہ جانے کا اعلان میں نے کتنے دن کے حوصلے جمع کرنے کے بعد کیا ہے۔ سلینا نے آپ ہی سوچا۔
کچھ مجبوریاں بھی تو ہوتی ہیں بھابھی ورنہ چمن اپنے ہاتھوں سے کون اجاڑتا ہے۔
وہ کون سی مجبوری ہے سلینا۔ نجمہ نے اپنائیت سے پوچھا۔ اگر ہم اسے حل کرسکے تو خدا کی قسم اسے حل کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔
اس لمحے سلینا کا جی چاہا کہ وہ نجمہ کی گود میں سر رکھ دے۔ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔
ڈیوڈ۔ سلینا یہ کہہ کر واقعی نجمہ کی گود میں گر پڑی۔ آج سلینا کو یہ کیا ہوگیا۔ وہ کیا کہہ گئی۔ مگر اب وہ کہہ چکی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ آج تو اس کی شہ رگ ہی کٹ گئی۔ لو اب تو سلینا مر ہی گئی۔
نجمہ کچھ دیر تو چپ رہی۔ اسے اس ایک نام نے مکمل طور پر شکست دے دی۔

ہاری ہوئی نجمہ بولی۔

تم میرے لیے شاکرہ ہی ہو سلینا۔ مجھے شاکرہ کو بھی اس گھر سے رخصت کرنا ہے۔ کاش اسی طرح میں تم کو بھی رخصت کر سکوں۔

یہ تو آپ کی محبت ہے بھابھی۔ مگر آپ اس حقیقت کو کیوں فراموش کر رہی ہیں کہ میں شاکرہ نہیں۔ ہم لوگوں کو گھر والے اس محبت سے رخصت نہیں کیا کرتے۔ ہم لوگ تو خود ہی گھر والوں کو خدا حافظ کہہ کر دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔

میں جانتی ہوں سلینا تم ہم میں ہی سے ایک ہو۔ تم اپنے نام کا جھوٹا سہارا لے کر اپنے آپ سے آج تک جھوٹ بولتی رہی ہو۔

سلینا نے آنکھیں بند کرلیں اور سوچنے لگی۔

نجمہ بھابھی۔ ہم لوگ ہمیشہ اپنے آپ سے جھوٹ ہی بولتے ہیں اور سچ بولنے کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ہم لوگ دُہری شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اور ایسی ہی دُہری شخصیت کا کرب اٹھائے زندگی گزار دیتے ہیں۔ ہم فضاؤں میں اڑتے ہیں۔ چاند تسخیر کرنے کی کوششیں کرتے ہیں اور اپنی دنیا اور اپنی ذات کے خول میں دفن رہتے ہیں۔ یہ ہماری تمام نسل کا المیہ ہے بھابھی۔ بچا سکتی ہیں تو پورے مغرب کو بچا لیجیے، سلینا بکھر رہی تھی۔ اس کی فطری کمزوری اس پر حاوی تھی۔ ان کمزور لمحوں پر قابو پانے کے لیے وہ باغ کی طرف نکل گئی۔ اسے کھلی ہوا اور وسیع آسمان کی اشد ضرورت تھی۔ وہ چلتی چلی گئی اسی نازک سی پگڈنڈی پر جو دونوں طرف گھنے درختوں کے درمیان تھی۔ جس پر وہ چند مہینوں سے چلتی آئی تھی۔ انور کے ساتھ۔ اس انور کے ساتھ جو اپنا ذہن کھو چکا تھا اور اپنا دل توڑ چکا تھا۔ جسے اس کا ماضی یاد نہیں تھا اور وہ مستقبل کے خاکے بنانے سے قاصر تھا۔ اسی تہی دست انور نے سلینا کے سارے وجود پر آن ہی آن میں قبضہ جما لیا تھا۔ اس نے تو بارہا اس کی انجانی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش بھی کی مگر وہ تو بڑی کمزور نکلی۔ وہ ہر کوشش کے بعد اور بھی اس کے قریب آجاتی۔

۲۹

.....تجھ میں کتنی طاقت کتنی قوت تھی کہ تو نے اپنے آپ کو زندہ صلیب پر لٹکا دیا۔ ذرا بھی اپنی زندگی کی پروا نہیں کی۔ بس اسی قوت اسی طاقت میں سے چھوٹی سی مقدار میرے جسم میں بھی ڈال دے۔ میری شریانوں میں، بہتے خون میں وہ چنگاری چھوڑ دے جو مجھے بھی زندہ اپنی صلیب پر لٹکا دے...

ڈیوڈ کا ایک اور بلاوا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا اصرار بڑھتا جارہا تھا اور سلینا کے اضطراب میں بھی اضافہ ہورہا تھا۔

پاک مریم تجھے یسوع مسیح کا واسطہ مجھے حوصلہ دے دے۔ میں لمحہ لمحہ کمزور ہوتی جارہی ہوں۔ میں بکھر رہی ہوں۔ مجھے قوت دے۔ میں حالات کا مقابلہ کرنا چاہتی ہوں۔ چاہے میری اپنی آرزوئیں کچھ بھی کیوں نہ ہوں لیکن مجھے استقامت دے کہ میں اپنے پہلے وعدے پر قائم رہوں۔ اس کی التجا میں مفہوم اور زبان ایک ہی ہوتی۔

اب اس نے یسوع مسیح کو براہِ راست مخاطب کیا۔

تجھ میں کتنی طاقت کتنی قوت تھی کہ تو نے اپنے آپ کو زندہ صلیب پر لٹکا دیا۔ ذرا بھی اپنی زندگی کی پروانہیں کی۔ بس اسی قت اسی طاقت میں سے چھوٹی سی مقدار میرے جسم میں بھی ڈال دے۔ میری شریانوں میں، بہتے خون میں وہ چنگاری چھوڑ دے جو مجھے بھی زندہ اپنی صلیب پر لٹکا دے۔

سلینا ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

میں بھی کتنی عجیب ہوں اپنی بربادی کی آپ دعا مانگ رہی ہوں۔ اپنی خوشیوں سے آپ

دامن بچا رہی ہوں۔ اپنی آرزوؤں کا آپ گلا گھونٹ رہی ہوں۔ میری بھی کیا زندگی ہے۔ اور زندگی کا بھی کیا فلسفہ ہے۔ ایک بار پھر سلینا نے پُرانے طرز پر سوچا۔ وہ تو بار بار بس اسی طرح سوچنے پر مجبور تھی۔

ہم جس کو چاہتے ہیں اس سے دور ہو جاتے ہیں اور جن سے کوئی اُنسیت نہیں ہوتی ان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے پابند ہوتے ہیں۔

سلینا نے آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں کنواری مریم پر جما دیں۔ پاک مریم تجھے اپنے بیٹے کا واسطہ۔ میری منزل مجھ پر آسان کر دے۔ میں چلتے چلتے تھک گئی ہوں۔ مجھے سکون دے۔ مجھے اپنی آغوش میں لے لے مریم کہ میں اپنی ماں کے دونوں بازوؤں میں سمٹ کر کچھ دیر سولینا چاہتی ہوں۔

اور سلینا پھر وہیں فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ ناشتے کی میز پر سوائے سلینا کے سب موجود تھے۔ کچھ دیر تو سب نے چپ چاپ اس کا انتظار کیا مگر جب وہ نہ آئی تب انور کرسی کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔

انور کے جانے کے بعد نجمہ نے اطہر کو مخاطب کیا۔

سلینا آج کل بہت بجھی بجھی رہتی ہے۔

اور میں دیکھ رہا ہوں کہ انور کے چہرے پر تیزی سے آنے والی سرخی پھر سے ماند پڑ رہی ہے۔

اطہر نے چائے کی پیالی گھماتے ہوئے کہا۔

انور شاید سلینا کو پسند کرنے لگا ہے۔ نجمہ نے بہت آہستگی سے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا۔ اس وقت شاکرہ کا جی چاہا کہ وہ بھیا بھابھی کے پاؤں پڑ کر سلینا کو اپنے انور بھیّا کے لیے مانگ لے۔ ایسے جیسے سلینا ان دونوں ہی کے بس میں ہے۔

سلینا کی منگنی ہو چکی ہے۔ نجمہ نے اطہر کو افسردگی سے اطلاع دی۔

اچھا۔ اطہر کے لیے یہ ایک انکشاف تھا۔

سلینا کی اپنی پسند ہے! اطہر نے نجمہ کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

تفصیلات میں نہیں جانتی۔مگر سلینا نے کسی ڈیوڈ کا نام لیا تھا۔اور ویسے بھی ان لوگوں کے یہاں پسند کی ہی شادی ہوتی ہے پھر سلینا تو اکیلی ہے۔

خدا کرے وہ شخص سلینا کی قدر کر سکے۔اطہر نے سگریٹ سلگا لیا۔ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

انور سلینا کے کمرے پر دستک دے کر سوچ رہا تھا۔آٹھ بج چکے ہیں اور سلینا کو تو اب تک اٹھ بھی جانا چاہیے۔آج وہ کمرے ہی میں کیوں ہے۔اور جواب کیوں نہیں دے رہی۔

اس نے آہستگی سے دروازے کو دھکا دیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

سلینا اوندھی فرش پر بے حس وحرکت پڑی تھی۔وہ دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

سلینا اٹھو۔اس نے آہستہ سے سلینا کے کاندھے ہلائے۔مگر سلینا کا کوئی جواب انور کو نہیں ملا۔

اس نے سلینا کو بازوؤں سے پکڑ کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

کیا بات ہے سلینا۔تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔انور نے اس کے کان میں جھک کر پوچھا۔

اور سلینا ایک دم ہوش میں آ گئی۔یہ آواز تو اس کے مردہ جسم میں زندگی دوڑا سکتی ہے۔

ہاں میں ٹھیک ہوں۔سلینا کا لہجہ سپاٹ تھا۔اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

انور نے سہارا دے کر اسے کھڑا کر دیا۔

دونوں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

انور بکھرا جا رہا تھا۔اور سلینا اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

یک بارگی سلینا نے انور کا ہاتھ تھام کر اسے ہلکے سے دبایا۔اب سلینا انور کی نرس بن چکی تھی۔یسوع مسیح نے وہ طاقت بخش دی تھی جس طاقت کے سبب وہ زندہ سولی پر لٹک گئے تھے۔سلینا کی التجا انہوں نے سن لی تھی۔اس کی شریانوں میں کسی ایسی ہی چنگاری نے آگ لگا دی تھی۔

میرا ناشتے پر انتظار ہو رہا ہوگا نا انور۔تم چلو میں ابھی آتی ہوں اور وہ غسل خانے میں

داخل ہوگئی۔

انور نے سلینا کے سرھانے ڈیوڈ کا خط پڑا دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس سے اخلاقی جرم سرزد ہوگیا۔

میں جلد آنے کی کوشش کررہا ہوں۔تم واپسی کی تاریخ سے مطلع کرو۔تمہارا مریض کیسا ہے؟ بھلاتم جس کی تیمارداری کرو اور وہ زندگی نہ پائے۔اور آخیر میں ڈیوڈ کے بے شمار پیار تھے۔جو اسے مستقبل کی طرف بلا رہے تھے۔

انور خط اسی طرح کھلا بستر پر ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔ایسے جیسے وہ اس کی زندگی سے نکال دیا گیا ہو۔بے عزت کرکے۔حقارت کے ساتھ۔

ناشتے کی میز پر سلینا تھی لیکن انور نہ تھا۔

شاکرہ چپ چاپ ناشتہ اس کے کمرے میں پہنچا آئی۔نہ کسی نے انور سے غائب ہونے کی وجہ پوچھی اور نہ سلینا سے کسی نے دیر سے آنے کا سبب۔

وہ دن یوں ہی گزر گیا۔

۳۰

.....تم تو کسی سنسان ویران سڑک پر جاکر میرا ساتھ چھوڑو گی، جاؤ میں نے آج کی زندہ مہکتی دمکتی زندگی کی روشن شاہ راہ پر چلتے ہوئے تمہیں دھکا دے کر اپنے سے دُور کردیا ہے۔ میں چاہے اکیلے ہی سفر پر نکل جاؤں۔ راستے میں بہت سے مقام آئیں گے میں رک کر سانس بھی لے لوں گی اور وہ طاقت بھی پیدا کرلوں گی جو مجھ سے بقیہ راستے کی مسافت طے کرادے...

ایسے ہی کتنے دن اور بھی گزر گئے۔

سلینا ان تمام دنوں میں اپنے ارد گرد ٹھوس مضبوط دیوار بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ وہ جذباتی سلینا اب ایک بار پھر مرگئی جو پچھلے دنوں بھرپور طریقے سے زندہ ہو چلی تھی۔

اب وہ اکثر سوچتی۔ عجیب ہیں وہ فلسفی جو کہتے ہیں'' آرزو نصف زندگی ہے اور بے حسی نصف موت۔''

اس نے یہ انور کی لائبریری میں رکھی خلیل جبران کی ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ یہ بات کتنی غلط ہے۔ ایک دن اس نے اس کتاب کے جملے کی تصحیح کردی'' بے حسی نصف زندگی ہے اور آرزو مکمل موت''

خلیل جبران اپنی زندگی جیتا رہا اس کے تجربے میں شاید ایسا ہی رہا ہو۔ مگر اس کا اطلاق وہ سب پر کیوں کرنا چاہتا ہے۔ بہت سوں کے تجربے اس سے مختلف بھی تو ہوں گے۔ جیسا کہ میرا تجربہ۔ ہاں بے حسی نصف زندگی ہے اور آرزو مکمل موت۔ اس نے پھر اطمینان سے اپنے آپ کو قائل کیا۔ ایسے تمام دانش وروں اور ادیبوں کی تخلیقات کو جلا دینا چاہیے جنھوں نے ہم لوگوں کی زندگیوں کو بھسم کرنے کے لیے طرح طرح کے مقولے تراشے

ہیں۔ وہ بے حد پریکٹیکل بن کر سوچتی۔
جینا ہے تو سلینا کراس بن کر زندہ رہو۔ نام ہی شخصیتیں بناتی ہیں۔ احساس کو مار ڈالنا چاہیے۔ یہ تو بھوت پریت ہوتے ہیں اور انسان کی روح پر تو ہمیشہ ہی آسیب رہتا ہے۔ روح کی پکار کبھی نہیں سننا چاہیے۔ اب سلینا خود ہی فلسفی بنتی جا رہی تھی۔ مگر اس کا فلسفہ تمام تر فلسفیوں کے قول کی تردید پر مبنی تھا۔ اور پھر جب اس نے پڑھا۔

''ہم اپنے لیے خوشیاں اور غم انتخاب کر لیتے ہیں اس سے پہلے کہ انہیں ایک طویل زمانے تک آزمائیں''۔

تب ایک بار پھر وہ فلسفیوں کو مان گی۔

اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ اس کے دل میں محبت کا خزانہ بھرا پڑا تھا۔ اسے وہ بے دریغ لٹا بھی سکتی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی محبت کی تپش میں اس کا نسلی وقار جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ وہ ہر قیمت پر اپنی نسل پر عائد کیے گئے بیشتر الزام واپس کر دینا چاہتی تھی۔ یہ جانتے اور مانتے ہوئے کہ یہ الزام صحیح ہیں۔

انسان کو اپنی خواہشات کے برعکس بھی سوچنا چاہیے۔ ضروری تو نہیں یک بارگی پیدا ہونے والی کوئی خواہش صحیح ہی ہو۔ دیرپا بھی ہو۔ اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ بھی چلے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے یہ خواہش زندگی کے کسی مقام پر دھوکا دے جائے۔ ٹھہر جائے۔ آگے بڑھنے سے انکار کر دے۔ اس خواہش میں بسنے والی وہ روح غائب ہو جائے جو اسے زندہ رکھے ہوئے تھی۔ تب پھر کیا ہوگا۔ راستہ تو پھر بھی باقی ہے۔ پھر پیدل کا سفر اکیلا ہی طے کرنا پڑے گا نا۔

ذرا رک جاؤ۔ تھوڑا سوچ لو۔ مت مانو اپنی اس خواہش کو بھی جو تمہارے جسم میں منتقل ہو گئی ہے۔ تمہاری روح پر قابض ہو گئی ہے، جس نے تمہارے دل میں اپنا قیام کر لیا ہے۔

پھر وہ گہری ہنسی کے ساتھ ایسی ہی کسی خواہش کا گلا دبا دیتی۔ اور زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ کہتی۔

تم تو کسی سنسان ویران سڑک پر جا کر میرا ساتھ چھوڑو گی۔ جاؤ میں نے آج کی زندہ مہکتی

دمکتی زندگی کی روشن شاہ راہ پر چلتے ہوئے تمہیں دھکا دے کر اپنے سے دور کر دیا۔ میں چاہے اکیلے ہی سفر پر نکل جاؤں راستے میں بہت سے مقام آئیں گے میں رک کر سانس بھی لے لوں گی اور وہ طاقت بھی پیدا کرلوں گی جو مجھ سے بقیہ راستے کی مسافت طے کرادے۔

اسے اب اپنی بہادری بہت اچھی لگ رہی تھی۔ یہ کوئی دوسری ہی سلینا تھی جو پرانی سلینا کے بطن سے جنم لے رہی تھی۔ وہ کتنے دن زندہ رہے گی اس کا یقین خود سلینا کو بھی نہیں تھا۔

۳۱

..... لیکن وہ تو آنے والا ایک خیال تھا جو ٹھنڈی سانس کی طرح آیا اور سائے کی طرح سرک گیا۔ یہ تو پرانی سلینا کی سوچ تھی۔ ابھی ابھی اس نے ایک نئی سلینا کو جنم دیا تھا جو پرانی سلینا کے توڑ کے لیے پیدا کی تھی۔ دونوں سلینا آپس میں جنگ کرتی دکھائی دیتیں۔ ایک دل سے جنگ کر رہی تھی دوسری دماغ سے لڑ رہی تھی۔ کبھی دل جیت جاتا کبھی دماغ بغاوت کر دیتا...

میں ایک ہفتے میں آرہا ہوں۔تم اپنے اسپتال پہنچ جاؤ۔

ڈیوڈ کا تار پاتے ہی سلینا کے ساتھ ساتھ تمام گھر والے گڑ بڑا گئے۔سلینا کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ایک تار نے اسے ہرے بھرے باغ سے اٹھا کر زبردستی کسی تپتے صحرا میں پھینک دیا ہے۔

میں اس صحرا کو قبول نہیں کرسکتی۔ میں اس پیار سے دامن نہیں چھڑا سکتی میں جینا چاہتی ہوں۔ اور جینے کے لیے ایسا ماحول چاہتی ہوں جیسے اطہر نے اپنے گھر میں پیدا کیا ہوا ہے۔

وہ اپنی خواہش کی جانب جھکی جارہی تھی۔

لیکن وہ تو آنے والا ایک خیال تھا جو ٹھنڈی سانس کی طرح آیااور سائے کی طرح سرک گیا۔ یہ تو پرانی سلینا کی سوچ تھی۔ ابھی ابھی اس نے ایک نئی سلینا کو بھی تو جنم دیا تھا جو پرانی سلینا کے توڑ کے لیے پیدا کی گئی تھی۔

دونوں سلینا آپس میں جنگ کرتی دکھائی دیتیں۔ ایک دل سے جنگ کر رہی تھی دوسری دماغ سے لڑ رہی تھی۔کبھی دل جیت جاتا کبھی دماغ بغاوت کر دیتا۔

اسی الجھن میں نجمہ۔ شاکرہ اور اطہر بھی گرفتار تھے۔

سلینا سب کے لیے ملازم نرس بن کر ہی رہتی تو آج اس کے رخصت پر سارا گھر یوں قبرستان کی طرح خاموش نہ ہو جاتا۔ سلینا ان سب کے دل کی دھڑکن بن چکی تھی۔ نجمہ، شاکرہ کی دوست۔ اطہر کی بہن اور انور کی مسیحا۔ اس گھر میں سلینا اپنے بوٹے سے قد کے باوجود قد آور تھی۔ یہاں پیدا نہیں ہوئی تھی مگر عزیز تھی۔ اس گھر کو چھوڑ رہی تھی اور سب اداس تھے۔ تو بالآخر اپنے پیا کے دیس سدھاریں۔ اپنا پتا بتا کر جانا۔

نجمہ نے سب سے پہلے اپنے آپ کو سنبھالا اور گھر کی فضا کو اس سوگواری سے نجات دلانے کے لیے اس نے سلینا کی رخصتی کو خوش گوار بنانے کی کوشش کی اور سلینا، نجمہ کی اس کوشش پر صرف ہونٹوں کو مخصوص حرکت ہی دے سکی۔ اپنے جانتے میں سلینا مسکرائی تھی۔

یہاں سے گئی تو آپ لوگوں کے لیے کھو جاؤں گی۔ میرا پتا آپ لوگ کبھی جان نہیں پائیں گے۔ اس نے آپ ہی آپ سوچا۔

سلینا ڈیوڈ کے پاس جا کر ہمیں بھول تو نہ جاؤ گی؟ اب شاکرہ نے اس خاموشی کو توڑا۔

کاش بھولنا اتنا آسان ہی ہوتا شاکرہ ڈیئر۔ اس نے پھر تلخی سے سوچا۔ کوشش تو کروں گی کہ تم سب کو ایک دن ہی میں بھول جاؤں۔ سلینا کا یہ جواب اتنا آہستہ تھا کہ جسے سننے کے لیے شاکرہ کو اس کے آگے جھک جانا پڑا۔ شاکرہ کی لہراتی چوٹی سلینا کے چہرے کو چھو گئی۔

تم لوگوں کے یہ لمبے لمبے بال مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔

تم اپنے بال بڑھا بھی تو سکتی ہو سلینا۔ شاکرہ نے اپنی چوٹی بے نیازی سے پیچھے جھٹک دی۔

جس چیز کا ہمیں اشتیاق ہو اور وہ ہمیں حاصل نہ ہو وہ ہمارے دل کو اس چیز سے زیادہ محبوب ہوتی ہے جو ہمیں حاصل ہو۔ کیوں شاکرہ ڈیئر۔

سلینا نے خاص فلسفیوں والے انداز میں کہا۔

اوہ سلینا۔ شاکرہ جھنجھلائی۔ انور بھائی کے فلسفے سے خدا خدا کر کے نجات حاصل ہوئی تھی

کہ تم فلسفی بن بیٹھیں۔
کتنے دن کی بات ہے ڈئیر۔ سلینا مسکرائی۔ جلد ہی میری باتوں سے بھی نجات مل جائے گی۔
شاکرہ روٹھ گئی۔ میرا یہ مطلب تو نہ تھا سلینا!
اور میرا بھی تمہیں خفا کرنے کا مقصد نہیں تھا۔ مگر جانا بھی تو ہے ہی نا!
چلو اپنے ڈیوڈ کی بات کرو۔ نجمہ نے ماحول کو خوش گوار کرنا چاہا۔
ڈیوڈ ایک ہفتے میں آ رہا ہے اور مجھے اسپتال پہنچنا ہے۔
سلینا نے تار کے الفاظ دہرا دیے۔
یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ نجمہ ہنس پڑی۔
پھر آپ اور کیا جاننا چاہتی ہیں۔ سلینا نے زبردستی یہ جملہ ادا کیا۔
اچھا یہ بتاؤ شادی کے بعد ملازمت کرو گی۔
شاہ کار کی تخلیق کے بعد مصور اپنا برش توڑ دیتا ہے۔
سلینا جیسے آج سیدھی طرح بات کرنے کے موڈ میں تھی ہی نہیں۔ کچھ دیر تینوں ہی خاموش رہیں۔ اور پھر سلینا چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ مگر اس کا دل کمرے میں بھی نہیں لگا۔ وہ یہاں عین وسط میں کھڑی چاروں طرف گھوم کر دیواروں کو تک رہی تھی۔ یہ دیواریں میری راز دار ہیں۔ میں نے اس چار دیواری میں نئے نئے جذبے محسوس کیے ہیں۔ یہاں میری خوشیاں اور میرے آنسو دفن ہیں۔
اس کا دل بھر آیا۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس کی نظریں کنواری مریم کی تصویر پر مرکوز ہو گئیں۔ اب اس کیل پر کوئی اور تصویر لٹک رہی ہوگی۔ اس کمرے کی ترتیب بدل جائے گی۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ یہ سوچتے ہوئے حسبِ معمول اس کے دل میں جیسے کوئی چیز ٹوٹ کر دھنس گئی ہو۔ اس نے کئی کئی بار کروٹ بدلی اور تکیے میں منہ دے کر رونے لگی۔
روتے روتے اسے اپنی حالت پر خود ہی ترس آ گیا۔
یہ کیسی زندگی ہے میری۔ میں اگر اس گھر سے نہ جاؤں اور یہاں اسی کمرے میں اپنا

مستقبل تلاش کروں تو۔ اس نے مریم کے چہرے پر ایک اور چہرہ ابھرتے ہوئے محسوس کیا۔

انور............

انور آؤ، سچ تو یہ ہے کہ میں یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتی۔ مجھے ڈیوڈ سے محبت نہیں۔ محبت میں تم سے کرتی ہوں انور...

انور۔اب کے اس نے جیسے اسے چیخ کر پکارا۔

اور اسی لمحے انور سلینا کے کمرے میں داخل ہوا۔ سلینا جوتوں سمیت بستر پر اوندھی پڑی تھی۔

سلینا۔ اس نے ہولے سے پکارا۔

کیا ہے انور۔ سلینا نے خواب میں اپنا نام سنا اور حقیقت میں جواب دے بیٹھی۔

میں اندر آجاؤں۔ انور نے اجازت چاہی۔

میں تمیں پہلے ہی اپنے دل میں چھپائے بیٹھی ہوں۔ پوچھتے کیوں ہو۔ اب کے سلینا کی آواز نہایت دھیمی تھی۔ وہ شاید اس لیے بول رہی تھی کہ وہ یہ آواز بھی کمرے کو دے جائے۔ یہاں کی دیواریں اس کا اعترافِ محبت بھی سن لیں۔

میں اندر آجاؤں سلینا۔ اب کے انور نے دروازے پر ہلکی سی دستک بھی دی۔

پھر تو سلینا گڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔

تم رو رہی تھیں۔ سلینا کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی سرخ تھیں۔ انور کو جانے کیوں خوشی ہوئی۔ شاید سلینا یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔

نہیں۔نہیں تو انور۔ سلینا نے ساڑھی کے پلّو سے آنکھیں پوچھتے ہوئے کہا۔

''جی اچھا نہیں ہے''

تم اپنے آپ کو فریب دے رہی ہو۔ دکھ اٹھاؤ گی۔ انور کی آواز دھیمی تھی۔

میرے لیے دکھ کا بوجھ نیا نہیں ہوگا۔تم فکر نہ کرو انور۔ سلینا کا لہجہ ٹھہرا ہوا تھا۔

کیا ڈیوڈ بہت اچھا ہے۔کیا وہ تمہارے لیے بہت ضروری ہے؟ انور نے سلینا کے چہرے

پر نظریں گاڑ دیں۔ سلینا نے محسوس کیا کہ انور کی آنکھوں سے نکلنے والی روشنی کی حدت سے وہ موم کی طرح پگھل جائے گی۔

اسی لمحے شاکرہ کمرے میں داخل ہوئی۔

تمہیں بھائی جان بلا رہے ہیں سلینا۔ اور سلینا کے چہرے پر نظریں پڑتے ہی وہ چونک گئی۔ سرخ سرخ انگارا آنکھیں اور پھیکا چہرہ۔

تم اپنے آپ کو فریب دے رہی ہو سلینا۔ تمہیں انور بھائی سے محبت ہوگئی ہے۔ شاکرہ کے ذہن میں یک بارگی اس خیال نے جنم لیا۔

مجھے تمہارے بھائی جان بلا رہے ہیں انور۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

اپنے کمرے سے ڈرائنگ روم تک کے راستے میں انور کا سوال اس کا پیچھا کرتا رہا۔

کیا ڈیوڈ بہت اچھا ہے۔ کیا وہ میرے لیے بہت ضروری ہے۔

اس نے ایک سوال اور بھی اپنے آپ سے کر ڈالا۔

کیا وہ انور کے لیے اسے چھوڑ نہیں سکتی۔

میں پھر کس دوراہے پر آ گئی۔ وہ اپنے آپ سے خوف زدہ ہوگئی۔ رات کی کھائی قسم صبح ہوتے ہی کہیں گم ہو جاتی ہے۔ اور دن بھر اپنے آپ کو مضبوط بناتے بناتے رات اسے مٹی کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔

اطہر ڈرائنگ روم میں بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ پاس ہی نجمہ بیٹھی سوئیٹر بُن رہی تھی۔ مگر دونوں ہی خاموش تھے۔ اطہر کے سگار کا ہر کش ظاہر کر رہا تھا کہ اس وقت اس کے ذہن میں کوئی زبردست کش مکش ہے اور نجمہ کی انگلیاں اس انداز سے چل رہی تھیں کہ اس سے اس کے ذہنی انتشار کا راز افشا ہوا جا رہا تھا۔

سلینا نے اپنی آڑی ترچھی سوچ کو جھٹک دیا کہ وہ تو اس میں کمال رکھتی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی مگر دونوں ہی اپنے اپنے خیالوں میں یونہی گُم صم بیٹھے رہے کہ نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ چند ثانیے بعد سلینا ہی نے یہ سکوت توڑا۔ آپ نے مجھے یاد کیا ہے؟

اوہ، تم آ گئیں۔ اطہر سنبھل گیا۔
پرسوں تمہاری روانگی ہے۔ میں نے انتظام کر دیا ہے۔
اطہر نے یہ جملہ اس قدر کوشش سے ادا کیا کہ سلینا کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔
شکریہ۔ وہ اسی قدر کہہ سکی۔
گاڑی نو بجے آتی ہے ہم یہاں سے پانچ بجے تک نکل جائیں گے۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر اطہر نے سلینا سے پھر کہا۔
رات کا سفر ہے۔ تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا؟
سلینا برستی آنکھوں سے مسکرا دی۔
میری ساری زندگی رات ہی کی طرح تاریک ہے اور میں جانے کب سے گُھپ اندھیرے میں اکیلے سفر کر رہی ہوں۔ اب ڈر کیسا؟
جی نہیں۔ گاڑی صبح پہنچ جائے گی رات آرام سے سو کر گزاروں گی۔
اگر کہو تو میں تمہارے ساتھ چلوں۔ اطہر نے مشکوک نظروں سے سلینا کی طرف دیکھا۔
یہ لڑکی بہادر بننے کی کوشش کر رہی ہے۔
اب کہاں تک آپ لوگ میرا ساتھ دیں گے۔ اس نے سوچا۔
جی نہیں۔ آپ بے فکر رہیں مجھے ڈر نہیں لگے گا۔ آخر میں آئی بھی تو رات ہی کی گاڑی سے تھی۔ سلینا نے دلیل دے کر اطہر کو مطمئن کرنا چاہا۔ یا شاید وہ اپنے آپ کو مطمئن کر رہی تھی۔ ویسے بھی اسے اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی شخص اسے پہنچانے کے لیے ساتھ نہ بھیج دیا جائے۔ اسے دوسرے ہی شہر جانا تھا۔ اور اپنے اسپتال کا نام وہ صیغۂ راز میں رکھنا چاہتی تھی۔
میں یہاں سے نکل کر اس وسیع دنیا کی بھیڑ میں گُم ہو جانا چاہتی ہوں۔
اس نے یہی فیصلہ کیا تھا۔
سلینا، اطہر نے سلینا کو پھر مخاطب کیا۔
یہاں تم نے کافی عرصہ ہمارے ساتھ گزارا ہے۔ اُن دنوں جب تم آئی تھیں گھر کے

حالات بڑے عجیب سے رہے ہیں۔ ہماری کسی بات سے کبھی تمہیں کوئی بھی تکلیف پہنچی ہو تو معاف کر دینا۔ اور سلینا... اطہر نے پائپ سلگایا۔

زندگی کے کسی موڑ پر تمہیں ہماری ضرورت محسوس ہو تو اس گھر کو ہمیشہ اپنا گھر سمجھنا۔ بلا تکلف یہاں آ جانا۔ یا مجھے آواز دے کر بلا لینا۔ میں تمہیں شاکرہ جیسا ہی سمجھتا ہوں۔ مجھ پر تمہارا حق بنتا ہے۔ اس حق کو استعمال کرنے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کرنا۔ سمجھیں نا۔

شکریہ۔ اس کی آنکھوں سے ابھی پہلے کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے کہ دوسری کھیپ تیار تھی۔

وہ اور کیا جواب دے۔ اس خلوص کا کوئی جواب بھی تو نہیں۔ اس نے سوچا تھوڑی دیر سب خاموش رہے اور پھر چپ چاپ ایک دوسرے سے بات کیے بغیر اٹھ گئے۔

۳۲

.....اس نے کتنی ہی بار اپنے آپ کو جھٹلایا۔ کتنی ہی بار کنواری مریم کے آگے رگوگڑائی۔ کتنی ہی بار اس نے راستہ تبدیل کرنے کی کوشش کی، مگر دل، دماغ اور اس کا سارا وجود اس کا مخالف ہو چکا تھا۔ ایک بھی عضو تو اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا...

سلینا کے واپس جانے میں بس صرف ایک ہی رات حائل تھی اور یہ رات سلینا پر بڑی کڑی تھی۔ یہ رات انور پر بھی بھاری تھی۔ اور اس رات دیر تک ڈرائنگ روم میں سب بیٹھے رہے۔ مگر اور دنوں کی طرح یہاں اس رات کوئی قہقہے نہیں گونجے۔ وائلن پر کوئی دھن نہیں بجائی گئی۔ کسی نے گانا بھی نہیں گایا۔ بھائی بہن کی چھیڑ چھاڑ بھی نہیں ہوئی۔ ایسا لگتا تھا سب ایک دوسرے سے اجنبی ہیں۔ کوئی کسی کو پہچانتا نہیں۔ اطہر اور نجمہ کی محبت پاش نظروں میں اب عجب ایک بے چینی نے جگہ لے لی تھی۔ انور کی شوخی کو جیسے کوئی سانپ ڈس گیا تھا۔ شاکرہ منہ لٹکائے بُت بنی تھی اور سلینا، اس کی تو دنیا ہی لُٹی جارہی تھی۔

یہ محفل آخری محفل تھی۔

سب خاموش تھے۔ جب سوزشِ دل بڑھ جاتی ہے تب آدمی گونگا ہوجاتا ہے۔ سب ہی ساکت تھے جیسے سب پتھر کے ستون ہوں۔

لیکن بالآخر ایک ستون اپنی جگہ سے ہل ہی گیا اور اس کے اندر سے آواز آئی۔

سلینا، آخری بار وائلن پر ایک اچھی سی دھن سنا دو۔ یہ نجمہ کی آواز تھی۔
اور سلینا خاموشی سے وائلن اٹھا کر اپنی جگہ آ بیٹھی۔ ایسی جیسے کسی روبوٹ نے اپنا کام کیا ہو۔ اس نے اپنے سارے جذبات کو سمیٹا اور وائلن کے تاروں میں سمو دیا۔
جذبوں کا کرب موسیقی کی لہروں میں ڈھل کر اور بھی کرب ناک ہو جاتا ہے۔ دل کے سارے تار ہل گئے۔ ہر ایک اپنی جگہ اور بھی اداس ہو گیا۔ تار چھیڑتے چھیڑتے سلینا کی انگلیاں تھک گئیں۔ مگر وہ بجاتی رہی۔
زندگی کی کہانی اتنی طویل ہے۔ جذبے اتنے شدید ہیں کہ انہیں اس مختصر سے وقت میں تاروں میں کیوں کر سمویا جائے اور آج جیسے سلینا موسیقی کی زبانی اپنی زندگی کی داستان سب کو سنانا چاہتی تھی۔ جسے وہ آج تک زیرِ لب صرف اپنے آپ سے دہراتی رہی ہے۔
ان جذبوں کی شدت کو آج اسے مریم کے علاوہ اوروں کو بھی جیسے محسوس کرانا تھا وہ آج اس زبان میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن جیسے ہی اس کی کہانی کا موڑ انور کی طرف ہوا وہ تھم گئی۔
وہ محبت کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی۔
اس نے وائلن رکھ دیا۔ اس کی کہانی کیا تھی۔ کوئی موسیقی کی لہروں سے نہ جان سکا سوائے اس کے کہ وہ ایک ایسی دھن ہے جو بے سُر ہے اور بجے جا رہی ہے۔
وہ چپ چاپ بغیر کسی سے اجازت لیے کمرے سے نکل آئی اور اپنے کمرے میں جانے کے بجائے باہر کی طرف نکل گئی جہاں مکمل تاریکی تھی۔ آج کی رات چاند بھی نہیں تھا سیاہ رات جس میں ہاتھ کو ہاتھ بھی بجھائی نہ دے۔ مگر اسے تو بند آنکھوں سے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔
وہ سیڑھیوں پر پیر پھیلائے دور تاریکی میں گھنے درختوں اور چھوٹے چھوٹے پودوں اور پھولوں کو تکے جا رہی تھی جو اسے نظر بھی نہیں آ رہے تھے۔
اس گھر میں اب کوئی رات نہیں آئے گی۔ آج میری یہاں آخری رات ہے۔
ہمیشہ کی طرح وہ خاموش آواز میں اپنے آپ سے مخاطب تھی۔

اس کے سامنے وہ صبح تھی جب وہ یہاں تک پہنچی تھی۔ اس کے سامنے وہ تمام دن تھے جو اس نے یہاں گزارے تھے۔ اس کے سامنے وہ راتیں تھیں جو اس نے یہاں بسر کی تھیں۔ انور کی بیماری کے ایام تھے۔ انور کی دیکھ بھال کے دن تھے۔ انور کے صحت یاب ہونے کا زمانہ تھا۔ انور کو چاہنے کے مختلف دور تھے۔

پہلے پہل جب اس نے انور کو دیکھا تھا تب وہ اسے ایک معصوم بھولا بھالا بچہ نظر آیا تھا۔ صابن کے غبارے اڑانے والا پھونس کے چھپر والی تجربہ گاہ کا ننھا سا سائنس دان۔ اور اسے اس پر ایک دم سے پیار آ گیا تھا۔ پھر یہ پیار ہمدردی میں بدل گیا۔ انور کی ذہنی بے راہ روی سے اس نے انور سے ہمدردی محسوس کی۔ پھر انور کو ایک حادثہ پیش آیا۔ خوف ناک حادثہ جس میں وہ خود ملوث تھی۔ اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔ اس کی حالت اور بھی مخدوش ہو سکتی تھی۔ اور ان دنوں انور کی دل و جان سے خبر گیری کرتے کرتے اس نے اپنے دل میں نامعلوم جذبوں کو سر اٹھاتے محسوس کیا تھا۔ اور پھر جب انور صحت یاب ہوکر اپنے اصلی روپ میں اس کے سامنے آیا تب وہ اسے اپنی نس نس میں سمایا محسوس ہوا۔ دل نے کہا سلینا تجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔ اس نے کتنی بار اپنے آپ کو جھٹلایا۔ کتنی ہی بار کنواری مریم کے آگے گڑگڑائی۔ کتنی ہی بار اس نے راستہ تبدیل کرنے کی کوشش کی مگر دل، دماغ اور اس کا سارا وجود اس کا مخالف ہو چکا تھا۔ ایک بھی عضو تو اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس نے بارہا ڈیوڈ کی دی ہوئی انگوٹھی اپنی انگلی میں پہنی۔ اس کی گرمی محسوس کرنی چاہی۔ اس کے وعدے یاد کرنے کی کوشش کی۔ مگر لگتا تھا انور کی یادداشت تو واپس آ گئی ہے، مگر اس کی یادداشت کھو چکی ہے۔

وہ بار بار کوشش کر کے ماضی بھلاتی مگر حسین مستقبل اسے اپنی جانب راغب کر لیتا۔ وہ سوچتی اس کا ایک چھوٹا سا گھر ہوگا۔ اس کے آنگن میں بے شمار پھول ہوں گے۔ مختلف رشتے ہوں گے۔ اس کے اپنے بچے ہوں گے اور انور ہوگا۔ یہاں آ کر وہ پھر ڈر جاتی کنواری مریم کے سامنے ثابت قدم رہنے کے سارے وعدے اسے یاد آ جاتے اور وہ جلدی جلدی ڈیوڈ کی انگوٹھی انگلی میں گھمانے لگتی۔ کئی بار تو اس نے ایسا بھی کیا انگوٹھی اتار

دی اسے اپنے بکس میں رومال سے ڈھانک کر چھپا دی۔ اسے ہفتوں نہیں دیکھا مگر وہ انگوٹھی نہیں کوئی پر اسرار سی شے تھی وہاں سے بھی جھانک پڑتی۔ اسے بہت کچھ یاد دلا دیتی۔ وہ بارہا التجا بھی کر چکی تھی میں نے کون سا وعدہ کیا ہے۔ بس اتنا ہی تو ہوا تھا کہ وہ اسپتال کی بدبودار دواؤں سے اکتا گئی تھی اور ایک مریض نے ازراہِ ہمدردی اس کی انگلی میں اپنے نام کا پھندا ڈال دیا۔ وہ کچھ بھی نہیں بولی۔ ہاں بھی نہیں کہا ناں بھی نہیں کر سکی۔ بس اگر اسے محبت کہتے ہیں تو اس نے محبت کی اور اگر اُسے وعدہ کہتے ہیں تو ہاں اس نے ڈیوڈ سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ واپس آجائے گی اور اس کے ساتھ اس کے گھر چلی جائے گی رہنے کے لیے۔

اچانک اسے انور کی تیمار داری کے لئے آجانا پڑا یہاں آئی تو ڈیوڈ سے عہد و پیمان کے باوجود اس کے دل میں محبت نام کا کوئی جذبہ نہ تھا اور اب جا رہی ہے تو انور سے محبت کے سوا اس کے دل میں اور کچھ نہیں تھا۔ جب وہ یہاں آئی تھی تب وہ ایک نرس تھی، صحت مند تھی، اور ایک مریض کی دیکھ بھال کے لیے آئی تھی۔ اور جب جا رہی ہے تب وہ دل کی مریض ہے۔ محبت کی ماری ہے اور ایک صحت مند انسان اسے پوری طاقت سے اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔ وہ کس قدر سوچے۔ الفاظ بدل بدل کر اس کی سوچ کا محور بس صرف انور تھا۔ ہر صبح وہ خود صلیب پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پرانے عہد پر قائم رہنے کی طاقت مانگتی اور ہر شام اپنے کمرے میں لوٹتے وقت وہ ٹوٹ پھوٹ چکی ہوتی۔ یسوع مسیح سے نظریں چراتی اور تکیے میں منہ دے کر سو جاتی۔ اور سوتی بھی کیا۔ ساری ساری رات کروٹ بدل کر گزار دیتی۔

وہ اب بھی اندھیرے میں سیڑھی پر بیٹھی تھی اسے محسوس ہو رہا تھا انور بھی اس کے برابر بیٹھا ہے۔ مگر انور وہاں نہیں تھا۔ شاید وہ اب بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ الوداع۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جانے کسے مخاطب کیا۔ پھر وہ تھکے قدموں لوٹ کر کمرے میں آگئی۔ لباس تبدیل کیے بغیر لیٹ گئی۔

آج آخری رات ہے۔ دل نے جانے سینکڑوں بار اسے آگاہ کیا۔

اور پھر دل نے ،سرگوشی بھی کی۔آخری بار جال میں الجھانا چاہا۔
چاہو تو اس کمرے میں تم عمر بھی بسر کر سکتی ہو۔
نہیں۔وہ آپ ہی آپ چیخ اٹھی۔
صلیب پر بڑے الزام آئے ہیں۔میں صلیب کی عظمت کو ایک بار پھر بحال کروں گی۔یہ فریضہ میرے حصے میں آیا ہے۔میں صلیب کے تقدس کی حفاظت کروں گی۔
جانے دل نے یا دماغ نے ترس کھا کر اسے نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔

۳۳

... جب سے میں نے جنم لیا ہے میرے ہاتھوں میں زہر کا پیالہ ہے جسے میں نے گھونٹ گھونٹ پیا ہے۔ اس پیالے میں اب چند قطرے باقی ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ انہیں بھی نہایت صبر اور استقلال کے ساتھ حلق سے اُتار لوں...

اندھیرا چھٹ گیا۔ ہر رات کے بعد صبح ضرور آتی ہے۔ اس گھر میں بھی صبح آئی سورج نکلا۔ روشنی ہر طرف پھیل گئی۔ مگر یہاں کے ہر رہنے والے کا دل دھواں دھواں تھا۔ ہر ایک دیر سے کمرے سے باہر آیا۔ سلینا کی آنکھیں روز کی طرح جلد ہی کھل گئیں اور وہ اس آخری صبح کو الوداع کہنے باغ کی جانب نکل گئی۔ لان سے ہوتے ہوئے روش پر چلتے چلتے وہ پھاٹک سے باہر نکل آئی۔

اس نے گھوم کر دیکھا حویلی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اور اب وہ اس جگہ تھی جہاں انور نے پہلی بار اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ وہ اسی جگہ بیٹھ گئی۔ جہاں ایک بار بچوں کے ساتھ آ کر وہ دونوں بیٹھے تھے۔

اور انور نے بلا تمہید کہا تھا۔

سلینا مجھے تم سے محبت ہے۔

سلینا کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے محسوس کیا اِس وقت بھی اس کے سامنے انور ہے اور وہ اس سے اظہارِ محبت کر رہا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ آنکھیں بند کر کے وہ بھی آج اسی غائبانہ آواز کا جواب دے دے۔ محسوس تو کرے، جواب میں کتنا مزا ہے۔

انور میں بھی تمہیں چاہتی ہوں۔ اتنا ہی جتنا اپنے تمہارے خدا کو۔ میں کنواری مریم کو بھی گواہ بنا کر کہہ سکتی ہوں۔ وہ میرے دل کا سارا حال جانتی ہے۔

انور تم میرا شاہ کار ہو میں نے تمہیں دیوانگی سے نکالا ہے۔ میں نے تمہارا سارا ماضی تمہیں واپس کیا ہے۔ میں نے تمہارے گھر میں تمہارا احترام برقرار رکھا ہے۔ ان سب کو تمہاری بے راہ روی سے بے خبر رکھا ہے۔ میں اس قابل ہوں کہ تم مجھ سے محبت کر سکو۔ مگر انور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میں ایک ایسا پودا ہوں جو تمہارے باغ میں پھل پھول نہیں سکتا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سلینا کو مدہوش بنائے دے رہے تھے۔ یہ ہوائیں، یہ فضائیں، یہ سب میرے لیے اب اجنبی ہوجائیں گی۔ لاؤ جتنا ہو سکے میں انہیں اپنے اندر انڈیل لوں۔ اس نے پورا منہ کھول دیا اور اندر کی طرف گہری سانس لی۔ ارد گرد کی تمام ہوا اس کے اندر اتر گئی۔ پھلوں پھولوں کی ساری خوشبو اس کے جسم میں پھیل گئی۔ میں زندگی کی آخری سانس تک ،اس کی حفاظت کروں گی۔

یہ ہوائیں تم سے چھو کر جو گزری ہیں۔ ہاں اب یہ میرے لیے اجنبی ہوجائیں گی۔ شاید مجھے یاد بھی کریں۔ شاید میری یاد میں اداس بھی ہوجائیں۔ اس نے دکھ سے سوچا اور اچانک پلٹ پڑی۔ مجھے اب واپس جانا ہوگا۔

سامنے، وہ انور سے ٹکرا گئی۔

تم یہاں۔ سلینا نے اپنا آپ سنبھالا۔

انور لاتعلق کھڑا رہا۔ اس نے واپس جاتی سلینا سے درخواست کی۔

یہاں بیٹھ جاؤ۔ کچھ دیر۔ تھوڑی دیر۔ انور کی آنکھیں لال انگارا ہو رہی تھیں۔ وہ نظریں چرا گئی۔

میری خیریت پوچھو سلینا۔ دیکھو میرا ماتھا بھی گرم ہے۔ میرا ہاتھ بھی گرم ہے۔

اس نے اپنا گرم گرم ہاتھ سلینا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

تم تو ذمہ دار نرس ہو۔ اپنے فرض سے بھی غافل ہوگئیں۔ شاید تم نے چارج دے دیا ہے۔ مگر کسے؟

تمہیں بخار ہے، اور تم یہاں آ گئے۔ اس نے انور کی باتوں کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ تو گھبرا گئی تھی۔

ایسے ایسے بخار تو آتے ہی رہیں گے سلینا، اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی۔ انور کی آواز میں بے پناہ دکھ تھا۔

آؤ واپس چلیں، تمہیں ہوا لگ جائے گی۔ سلینا تنہائی اور اس کے لہجے سے گھبرا رہی تھی۔

بیٹھ جاؤ سلینا۔ کچھ دیر۔ تھوڑی دیر۔ میں ابھی یہاں سے نہیں جانا چاہتا۔

اور سلینا کو انور کے ساتھ ہی بیٹھ جانا پڑا۔

سلینا۔ انور نے کچھ دیر کی کش مکش کے بعد سلینا کو مخاطب کیا۔

تم اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی نہیں کر سکتیں۔

سلینا خاموش رہی۔

سلینا آؤ میرا ہاتھ تھام لو۔ ہم محبت کی زندگی بسر کریں گے یہ سوچنے کا موقع نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لمحے جو بادشاہوں کے تاج سے زیادہ قیمتی اور فرشتوں کی لطافتِ فکر سے زیادہ لطیف ہوتے ہیں ہمارے ہاتھوں سے نکل جائیں۔ سلینا۔ تم جھوٹ اور سمجھوتے کی تاریک زندگی سے نکل کر سچ اور محبت کی روشنی میں آ جاؤ۔ آج تک تم تاریکی کا سفر کرتی رہی ہو۔ اب روشنی تمہارے سامنے ہے۔ آنکھیں کھول دو، میں تمہیں اپنے دل سے قریب رکھوں گا۔ ذرا جھانک کر تو میرے دل میں دیکھو۔ یہاں محبت ہی محبت ہے۔ اور یہ سب تمہارے لیے ہے۔ انور کہتے کہتے تھک گیا اس کی آواز مدھم ہوتی گئی۔ اور انور کا ایک ایک لفظ سلینا کی روح تک کو سیراب کرتا گیا۔ جلتے ہوئے تپتے ہوئے صحرا میں پانی کی ایک بوند جس طرح جذب ہو جاتی ہے انور کے ایک ایک لفظ نے سلینا کے دل میں اسی طرح جگہ پائی۔

سلینا کا بھی جی چاہا وہ انور کے چوڑے چکلے سینے سے لپٹ جائے اور کہے

مجھے چھپالو انور۔ دنیا کی نظروں سے، سب کی نظروں سے۔ مجھے صلیب سے ہلال کی بیٹی بنالو۔

مگر پھر وہ چونک گئی۔ پتہ نہیں وہ بولی یا کنواری مریم نے اپنی مضبوط اور توانا آواز سلینا کے حلق میں انڈیل دی۔

میں سلینا ہوں، سلینا کراس۔ کیا تم جانتے نہیں میں صلیب کی بیٹی ہوں۔

اب اس نے اپنا مدھم لہجہ اختیار کیا۔ نہیں انور۔ جب سے میں نے جنم لیا ہے، میرے ہاتھوں میں زہر کا پیالہ ہے جسے میں نے گھونٹ گھونٹ پیا ہے۔ اس پیالے میں اب صرف چند قطرے باقی ہیں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ انہیں بھی نہایت صبر اور استقلال کے ساتھ حلق سے اتارلوں تاکہ میرے ہاتھوں میں زہر کا پیالہ پکڑانے والوں کی روحیں تک شرم سار ہوجائیں۔

سنو انور میں اس زندگی کی اہل نہیں ہوں جو راحت، اطمینان، مسرت اور محبت کا گہوارہ ہے۔ شاید میں یہ مسرت برداشت بھی نہ کرسکوں جانتے ہو انور زمین پر رینگنے والا کیڑا ہوا میں پرواز کے قابل نہیں ہوتا۔ مجھے معاف کردو انور۔ میں تمہارا دل توڑ رہی ہوں لیکن کیا کروں اس زہر کے پیالے کو توڑنا میرے بس میں نہیں۔

انور ساکت و جامد سلینا کے ایک ایک لفظ کو سنتا رہا۔ اور سلینا کہتے کہتے نڈھال ہوگئی۔ اس نے اپنے گھٹنوں پر اپنا سر رکھ دیا۔

انور میں نے ایک بار تم سے کہا تھا نا کہ میں خودرو پودا ہوں جسے کسی مالی کی ضرورت نہیں۔ تمہیں یاد ہے نا۔

میرے حافظے کے لیے بس تمہارا یہی جملہ کیوں ہو؟ کچھ اچھی یاد بھی تو میرا حق ہے۔ انور نے کہا۔

سلینا اب چپ تھی۔

تمہارا واپس چلے جانے کا فیصلہ اٹل ہے۔ انور کے لہجے میں اب بھی بے یقینی تھی۔ اب بھی امید کی کوئی کرن موجود تھی۔

ہاں انور... میں مجبور ہوں۔ سلینا نے یوں ہی جھکے جھکے اپنی تقدیر یگاڑ لی۔ انور اب بھی ہار نہیں مان رہا تھا اس کے پاس ٹوٹی پھوٹی کچھ دلیلیں اب بھی تھیں۔

تم چاہتی ہو جس مریض کو تم نے صحت یاب کیا ہے وہ پھر بستر سے لگ جائے جان کی بازی لگا دے۔ دنیا سے بے گانہ ہو جائے۔

اور تم چاہتے ہو صلیب کی ایک بیٹی نے تم سے جو سلوک روا رکھا ہے ایک دوسری بیٹی اس روایت کو نبھاتی جائے؟

سلینا نے اُلٹا انور ہی سے سوال کر دیا۔

اور انور کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

انور۔ اگر آج میں ڈیوڈ سے منہ موڑ کر تمہاری پناہ تلاش کرلوں تو بتاؤ کیا میں ڈیوڈ کے لیے میبل سے کچھ کم ہوں گی؟

تم ٹھیک کہتی ہو۔ انور نے ہار مان لی۔

مگر صلیب کا ہر زخم صرف میرے ہی حصّے میں کیوں آیا ہے؟

یہ غم میرے بھی حصّے میں آیا ہے انور، تم کیا جانو۔ اس نے تو میرا سارا وجود ہی کرچی کرچی کر کے رکھ دیا ہے۔ سلینا آپ ہی آپ دہرا کر رہ گئی۔

اچھا سلینا۔ میں تمہیں اچھے ناموں سے یاد رکھوں گا۔ اگر یاد رکھنے کے قابل رہا تو۔

انور نے یہ جملہ بڑی آہستگی سے ادا کیا۔ اس کے لہجے میں شکست اور دکھ ایک ساتھ سمٹ آئے تھے۔

اور اب اردگرد کی ساری ہوا اور فضا مکدر ہو چکی تھی۔ پھولوں کے رنگ دھندلا گئے۔ درختوں کے پتے اب سرسرانا بند کر چکے تھے۔ گھاس مردہ سی لگ رہی تھی۔ سورج کی روشنی میں تلخی اور بیزاری تھی۔ وہ دونوں بھی یہاں ٹھہر کر اب کیا کرتے۔ دونوں نے ایک ساتھ ہی اس پتھر کو دیکھا جس پر وہ اکثر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اور پھر دونوں قدم سے قدم ملا کر چلنے لگے۔ یہ واپسی کا سفر تھا سلینا نے محسوس کیا کہ انور آگے جا رہا ہے۔ اور وہ پیچھے کی جانب کہیں دھکیلی جا رہی ہے۔

۳۴

.....اے سُولی پر چڑھ جانے والے تجھے میرے دل پر سُولی دی گئی ہے۔ تو اکیلا ہی صلیب کی بھینٹ نہیں چڑھا ہے۔ میں نے بھی اپنی صلیب کو آپ کاندھا دیا ہے...

جیپ حویلی کے باہر آ کر رکی تو سلینا کا دل کانپ گیا۔
تو وقتِ رخصت آ ہی گیا۔
آج ساری دوپہر سلینا نے شاکرہ کے ساتھ مل کر دھیرے دھیرے اپنا سامان پیک کیا۔ ایک ایک چیز اپنی جگہ سے اٹھاتے ہوئے سلینا کا دل دکھ رہا تھا۔ میں اپنے پَر سمیٹ رہی ہوں۔
سامان باندھتے ہوئے اس نے سوچا۔ اور آخیر میں جب کنواری مریم کی تصویر اس نے دیوار سے اتاری تب اس کے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے فریم کے شیشے پر اپنا چہرہ رکھ دیا۔
شکریہ کنواری مریم۔ تیری رہنمائی میں، میں نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا۔ تو نے میری دعاؤں کو قبولیت کا درجہ دیا۔ میرے مشن کو کامیاب بنایا۔
میری آیندہ زندگی بھی تیرے حوالے ہے۔ اور اس نے آہستگی سے فریم اپنے سوٹ کیس میں کپڑوں کی تہہ کے درمیان چھپا دیا۔
شاکرہ نے یہ سب کچھ دیکھا اور خاموش رہی۔
جب میں آئی تھی تب میرا سامان کس قدر مختصر تھا۔ اور اب اس وقت یہ تمام چیزیں میرے

سوٹ کیس میں سما ہی نہیں رہی ہیں۔ اس نے نجمہ کی دی ہوئی ساڑھیوں کی جگہ بناتے ہوئے کہا۔

ایسا کوئی خاص اضافہ بھی نہیں ہوا ہے۔شاکرہ نے جواب دیا اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی۔

تم بھی میرے جانے پر اداس ہو بلکہ مجھ سے خفا بھی ہو شاکرہ ڈیئر۔ میری اچھی سی بہن چند دنوں میں شاید تم بھول بھی جاؤ کہ اس کمرے میں مختصر سی مدت کے لیے کوئی مہمان بھی ٹھہرا تھا۔ مگر یہ مدت مجھے زندگی کی آخری سانسوں تک یاد رہے گی۔ میں اپنے جذبات سمیٹے ہوئے ہوں تو تم مجھے اس قدر بے رحم اور بے مروت سمجھ رہی ہو۔ کیا کروں شاکرہ رانی کہ میں مجبور ہوں۔ اپنی خوشیاں تو میں تم لوگوں کے درمیان ہی چھوڑے جارہی ہوں۔

سلینا آپ ہی آپ بول رہی تھی۔ اس نے شاکرہ کے دیے ہوئے سفید سوئیٹر کو اپنے سینے سے لگا کر سوٹ کیس میں رکھ دیا۔

یہ وہی سوئیٹر ہے ڈیئر جسے تم نے محبت سے تیار کیا اور جس کے لیے نجمہ بھابھی نے کتنا چھیڑا تھا۔ تو تم اسے میرے لیے بُن رہی تھیں۔ کتنی محبت ہے تم لوگوں کے دل میں۔ اور کتنی وسعت رکھتی ہو اپنی سوچ میں۔

یہ سارے دھیمے دھیمے جذبے محبت میں ڈوبے ہوئے احساسات کہاں سے اٹھا لاتے ہو تم لوگ۔ اَللّٰہ نے تم لوگوں کو ہم سے اتنا مختلف کیوں بنایا ہے۔ اور بنایا ہے تو ہم سے ملایا کیوں ہے۔ اور اگر ملا ہی دیا تھا تو پھر جدا کیوں کر رہا ہے وہ۔

اتنے میں نجمہ ایک بیگ لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

سلینا اس میں سارا کچھ ڈیوڈ کے لیے ہے۔ ہم سب کی طرف سے۔

شادی میں تو تم بلاؤ گی نہیں! بلا لینا سلینا۔ نجمہ نے خوشامدانہ کہا۔

پلیز بھابھی اب ایسے جملے مت بولیے۔ میرا دل دہل جاتا ہے۔ مجھے کمزور مت بنائیے اب تو میرے پاس وقت بھی نہیں ہے کہ میں اپنے آپ کو سمیٹ سکوں۔ بکھرنے سے بچا سکوں۔ اپنے میں ایک بار پھر طاقت پیدا کر پاؤں۔ بس اب مجھے میرے حال پر چھوڑ

دیجیے۔ وقت کو گزر جانے دیجیے جیسا کہ وہ گزر رہی رہا ہے۔ اس نے بیگ کی طرف حیرت کی تمام تر شدت کے ساتھ دیکھا۔ یہ کیسے لوگ ہیں؟

بھابھی اتنی ساری چیزوں کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ سلینا کا لہجہ عاجزانہ تھا۔

تھی ضرورت سلینا۔ تمہارے رشتے سے اب ہمارا اُس کے ساتھ بھی ایک رشتہ بنتا ہے۔ برتنے دو ہمیں یہ رشتہ۔ بلکہ کبھی تم دونوں ساتھ یہاں آنا۔ ہمیں اچھا لگے گا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ بھابھی کے لہجے میں خلوص ہی خلوص تھا۔

اطہر نے روانگی کی جلدی کی۔ نوکر سامان اٹھا کر جیپ میں رکھ آیا۔

سلینا، نجمہ اور شاکرہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی باہر نکل آئیں۔ سلینا رک گئی۔ آخری بار اس نے خالی کمرے پر نظر دوڑائی۔ اجڑا اجڑا سا یہ کمرہ خود سلینا کو بھی رُلا گیا۔ پھر اس نے کھڑکی سے باہر دور تک باغ کا وہ حصہ دیکھا جو سلینا کے کمرے کے پیچھے پیچھے اپنی بہار دکھا رہا ہوتا تھا۔ اسے وہیں کھڑے کھڑے حویلی کا عقبی حصہ بھی نظر آیا جہاں اس نے پہلے پہل انور کو پھوس کی کٹیا میں صابن کے غبارے بنا کر ہوا میں اڑاتے دیکھا تھا۔

اس کی نظریں اس نرم گھاس پر جم گئیں جس پر روز صبح وہ اپنے پیر کے تلوے سہلایا کرتی تھی۔ وہ حویلی جس کے پھاٹک پر پہنچ کر اسے سب سے پہلا خیال یہ آیا تھا کہ اس نے یہاں آکر غلطی تو نہیں کی؟ اور اب جاتے ہوئے اس کے ذہن نے پھر یہ دہرایا۔

وہ یہاں سے جا کر غلطی تو نہیں کر رہی ہے؟ پہلے خیال پر بھی اس نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا اور اس بار بھی اس نے اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا۔ لیکن وہ جانتی تھی اس بار وہ کچھ بھی نہیں پائے گی۔ بلکہ بہت کچھ کھو دے گی۔ اس نے اپنے آپ دہرایا۔

میں انسانوں کے وسیع جنگل میں اپنے آپ کو گُم کر دینے کے لیے جا رہی ہوں۔ اور اس نے اپنے قدم جیپ کی طرف بڑھا دیے جو اسے لے کر یہاں سے دور بہت دور چلتی چلی جائے گی۔

انور کہاں ہے؟ جب سب جیپ میں بیٹھ گئے تب اطہر نے ادھر اُدھر دیکھ کر انور کو تلاش کیا۔

اور تب سلینا نے گردن جھٹک کر سب کچھ بھلا دیا اور آخری قدم جیپ پر رکھتے رکھتے وہ اُتر گئی۔

ہاں انور کہاں ہے؟ شاید وہ ابھی اپنے کمرے سے ہی نہیں نکلا اس نے سوچا اور دوڑتی ہوئی پھر حویلی میں داخل ہوگئی۔

میں انور کو لے کر آتی ہوں۔ وہ بہادری دکھانے پر اُتر آئی۔

انور اپنے کمرے میں بیٹھا چپ چاپ سگرٹ پھونک رہا تھا۔

انور تم مجھے چھوڑنے اسٹیشن نہیں جا رہے ہو۔

اور انور نے سگرٹ کا دھواں فضا میں چھوڑ دیا۔ اس کی نظریں سلینا پر ٹِک گئیں۔

سلینا۔ سسٹر کراس بن گئی۔

تمہارا بخار اب کیسا ہے؟ سلینا نے بڑھ کر انور کی کلائی تھام لی اور نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔

تمہارا بخار تو اب تک نہیں اُترا۔ سلینا نے تشویش سے کہا۔

اور اس لمحے انور نے گلدان سے ایک پھول توڑ کر اس کے بکھرے بالوں میں اٹکا دیا۔

سلینا کا سر جھک گیا۔ دو بوند آنسو بھی جانے تیار ہی تھے ٹپک پڑے۔

چلو۔ اتنی دیر میں انور صرف اسی قدر بولا۔

دونوں تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے ایک ساتھ باہر آئے اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ اس عرصے میں ڈاکٹر بھی پہنچ گیا تھا۔

معاف کیجیے گا سسٹر کراس میں جلدی نہیں آسکا دراصل مجھے ایک مریض کو دیکھنے جانا پڑ گیا۔

کوئی بات نہیں ڈاکٹر۔ اچھا ہوا آپ سے ملاقات ہوگئی۔

سلینا نے خوش دلی سے جواب دیا۔

میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں سسٹر، کہ آپ کی تمام تر محنتیں بارآور ثابت ہوئیں۔ اور ڈاکٹر نے ٹھہر کر اسے دوسری مبارک باد بھی دے ڈالی۔ میری مبارک باد ڈیوڈ صاحب تک بھی پہنچا دیجیے گا۔

اس بار سلینا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں نیچی تھیں اور ذہن صرف انور کے

بارے میں سوچ رہا تھا۔
انور کو بخار ہے۔ کہیں بخار تیز نہ ہو جائے۔ اس نے تھرماس سے پانی گلاس میں انڈیلا پرس سے بخار کی گولی نکالی اور انور کی طرف بڑھادی۔
انور کو شاید اس کی شدید ضرورت تھی اس نے غٹاغٹ گولی حلق سے اتار لی سلینا کو اچھا لگا۔ کم از کم واپسی تک اس کی حالت اب سے بہتر ہو چکی ہو گی۔ اس نے اطمینان سے سوچا۔
اطہر نے جلدی کی اور جیپ پہاڑی راستوں سے ہوتی ہوئی شہر کی طرف بڑھنے لگی۔ سلینا میں اب اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ آخری بار ان گزرتے ہوئے راستوں کو دیکھ لے جن پر وہ اب کبھی نہیں چل پائے گی۔ اس حویلی کو دیکھ لے جس میں اس نے اپنی زندگی کے چند اہم ترین دن گزارے ہیں۔ اور اب ایسا کوئی ایک دن بھی گزارنے وہ یہاں نہیں آئے گی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور بند آنکھوں سے گزرے دنوں کی تصویریں اس کی نظروں کے سامنے بکھر گئیں۔
یہ تتلیاں میں نے تمہارے لیے پکڑی ہیں سلینا!
سلینا اب میرا ستارہ آسمان تک پہنچ جائے گا نا!
سلینا یہاں بیٹھ جاؤ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔
میں تم سے محبت کرتا ہوں۔
اُف وہ بلاتمہید اظہارِ محبت۔ سلینا گھبرا گئی۔
پہلے لائٹ بند کرو پھر میں سوؤں گا۔
انور کی معصوم ضد۔ اس کے ذہن میں اِدھر اُدھر سے بے شمار جملے جو انور نے ادا کیے تھے چکر لگاتے رہے۔ جیپ اونچے نیچے راستوں سے ہوتی ہوئی شہر کی جانب رواں دواں تھی۔
یہ میرا اظہارِ عقیدت ہے سلینا۔
اس کا ہاتھ اپنے بالوں میں اٹکے ہوئے پھول تک جا پہنچا۔
میں نے تو ان پھولوں کا بھی خیال نہیں کیا انور۔ اس نے انور کی جانب دیکھا جو دور نظریں جمائے تیزی سے سگرٹ کے کش لے رہا تھا۔

راستے میں نجمہ نے دو تین بار تھرماس سے چائے نکال کر سب کو پلائی لیکن آپس میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ کبھی کبھار اطہر کا کوئی جملہ سنائی دے جاتا لیکن جواب نہ پاکر وہ بھی خاموش ہو جاتا۔

اسٹیشن پر جیپ سے اتر کر سب نے ٹانگیں سیدھی کیں۔ گاڑی جانے میں ابھی دیر تھی۔ اطہر بھاگ کر ٹکٹ لے آیا۔ دوسری بار گیا تو پھلوں کا ٹوکرا ساتھ تھا۔ شاکرہ نے چند انگریزی رسالے خرید کر سلینا کے ہاتھ میں تھما دیے اور سلینا میں اتنا بھی دم نہیں تھا کہ وہ شکریہ ادا کر دیتی۔

گاڑی پلیٹ فارم پر رکی تو سب ڈبے کی طرف بڑھ گئے۔ نجمہ نے سلینا کی سیٹ پر بستر لگا دیا۔

یہ تھرماس رکھ لو۔ راستے کی چائے مت پینا بڑی بدمزہ ہوتی ہے۔ نجمہ نے چائے سے بھرا ایک دوسرا تھرماس اس کی سیٹ پر رکھ کر ہدایت کی۔

یہ راستہ جو آپ کے گھر سے مخالف سمت کو جاتا ہے کون سا خوش گوار ہے بھابھی اس نے سوچا۔

جا کر خط لکھنا۔ نجمہ نے پھر ہدایت دی۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کا قد چھوٹا ہو گیا ہے اور وہ بھی افسر اور ندیم ہے۔

نجمہ اسے ہدایت کرتی چلی جا رہی ہے۔ یونی فارم گندہ نہیں کرنا۔ دل لگا کر پڑھنا اب کے فرسٹ آنا۔ اپنے کھانے پینے کا خیال رکھنا۔ ہاتھ صابن سے دھونا زیادہ کھیلنا نہیں۔

بہتر ہے پہنچنے کا تار دے دینا۔ نجمہ نے پھر سلینا کو مخاطب کیا۔ اور تب سلینا مسکرا پڑی بھابھی اگر اس گاڑی کی ٹکر ہو جائے تو۔ کیا آپ لوگ میری لاش پہچاننے آئیں گے۔

اور اس بار نجمہ نے ڈانٹ پلائی۔

سفر کے وقت ایسی باتیں نہیں کرتے۔

بس اسی وقت گاڑی نے وسل دے دی سب آہستہ آہستہ اُتر گئے۔ سلینا نے ہر ایک اُترنے والے سے ہاتھ ملایا۔

نجمہ نے محبت سے دبا دیا۔
شاکرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
اطہر نے آہستگی سے سلینا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔
سلینا نے بھیگی نظروں سے انور کی طرف دیکھا۔ وہ لاتعلق سا کھڑا کھڑکی سے کہیں دور دیکھ رہا تھا۔
وہ آگے بڑھی۔
اپنا خیال رکھنا انور۔ اور سلینا نے اپنا ہاتھ انور کے ہاتھ میں دے دیا۔
تمھیں بخار ہے انور۔ اپنا خیال آپ رکھنے کی کوشش کرنا۔ گھر جا کر پھر ایک گولی کھالینا۔ سوجانا۔ آرام سے طبیعت بہتر ہوجائے گی۔
بس کرو سلینا۔ بس کرو۔ یہ کرلینا وہ کرلینا۔ میں چھوٹا بچہ نہیں ہوں۔ جو میرا دل چاہے گا وہی کروں گا۔
اطہر نے انور کو جلد ڈبے سے اتر جانے کے لیے آواز دی۔ گاڑی چلنا شروع ہوچکی تھی۔ یہ لمحہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ گاڑی کی رفتار دھیمی ہوتی ہے۔ انجن اپنی ایک آواز نکال رہا ہوتا ہے۔ غیر ضروری لوگ جو الوداع کہنے کے لیے ٹرین میں سوار ہوتے ہیں اترنا شروع ہوجاتے ہیں۔ مسافر اپنی جگہ بیٹھ کر کھڑکی کے باہر رخصت کرنے والوں پر نظریں جما دیتے ہیں۔ دونوں طرح کے لوگوں کے دل ٹرین سے زیادہ کی رفتار سے بھاگنا شروع کردیتے ہیں۔
الوداع۔ خدا حافظ کی آوازیں گونج رہی ہوتی ہیں۔
انور چلتی گاڑی سے اتر تو گیا مگر اس کی نظروں میں اب بھی ایک پیغام تھا۔
''آؤ ہم ایک نئی دنیا بنائیں۔ مسرت کی، محبت کی دنیا۔''
سلینا کی آنکھوں پر پلکوں کی چلمن پڑ گئی۔ جیسے وہ بند آنکھیں کہہ رہی ہوں میرے ہاتھوں میں زہر کا پیالہ ہے انور۔ میں اسے آج تک گھونٹ گھونٹ پیتی رہی ہوں۔ اب چند

قطرے اور باقی ہیں۔ مجھے یہ بھی ختم کرنے دو۔

گاڑی نے کھسک کھسک کر پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔ جیسے رک رک کر کسی کا دم نکلتا ہے۔ لہراتے رومال بھی غائب ہوگئے۔ انور ایک نقطہ بن گیا اور پھر جب یہ نقطہ بھی دُھندلا گیا تو سلینا نے کرب سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔

اے سُولی پر چڑھائے جانے والے تجھے میرے دل پر سُولی دی گئی ہے تو اکیلا ہی صلیب کی بھینٹ نہیں چڑھا ہے میں نے بھی اپنی صلیب کو آپ کاندھا دیا ہے۔ میرا تو حوصلہ دیکھ کہ میں غم کی اس صلیب پر ہنسی خوشی چڑھ گئی ہوں اور کسی کو میرے دل کے خون ہوجانے کی خبر بھی نہیں ہوئی ہوگی۔

اس نے دکھی دل سے یسوع مسیح کو پکارا۔ انور لوگوں کے عقیدے کے مطابق ایک دن تو دنیا میں دوبارہ آئے گا۔ نیا جنم لے گا۔ ہمارے سارے عقائد کو غلط ثابت کرے گا۔ اور سب سے پہلا کام تو یہ کرے گا کہ اس مقدس صلیب کو جسے ہم سب اپنے گلے میں لٹکائے پھرتے ہیں توڑ دے گا۔ تو کہے گا کہ میں تو صلیب پر چڑھایا ہی نہیں گیا۔ مجھے تو میرے پیدا کرنے والے نے زندہ آسمان پر اٹھالیا تھا۔ تو پھر اسی دنیا میں چالیس سال کی اور زندگی گزارنے کے لیے آئے گا اور اس عرصے میں صلیب ٹوٹ جائے گی کرچی کرچی ہوجائے گی۔ پھر ہر سلینا صلیب کی پھانسی سے آزاد ہوجائے گی مگر یہ سلینا کراس تو اسے اپنی گردن میں لٹکائے مرجائے گی۔ پھر کبھی دنیا میں واپس نہیں آئے گی اگر آسکتی تب وہ دوڑ کر انور کی حویلی میں جا چھپتی۔ اس گھاس پھوس کی کٹیا والے انور کے وجود میں اپنے آپ کو چھپالیتی۔ پھر اسے کسی صلیب کی قیمت نہیں چکانی پڑتی۔ مگر یسوع مسیح تو نے اپنے آنے کا وقت بہت دیر میں رکھا ہے اس وقت تو یہ سلینا کراس کرچی کرچی ہوچکی ہوگی اپنے عقیدے کی اس صلیب پر سولی چڑھ چکی ہوگی۔ یہ انصاف نہیں ہے یسوع مسیح یہ انصاف نہیں ہے۔ مجھے ایک اور جنم دے۔ مجھے ایک اور جنم چاہیے میں مبیل کے تمام قرض

چکا کر آزاد ہو جانا چاہتی ہوں۔ میں انور کو پورے حق کے ساتھ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ تجھے کنواری مریم کا واسطہ یسوع مسیح۔

پھر وہ اپنی سیٹ پر گر کر پھُوٹ پھُوٹ کے رو دی۔

۳۵

.....اس کی آواز کے ساتھ کوئی موسیقی نہیں تھی لیکن پتوں کی سہمی سہمی سرسراہٹ اس کے ایک ایک لفظ کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر موسیقی ہی کا کام انجام دے رہی تھی۔ اب وہ گاتا ہوا دیوانوں کی طرح دوڑنے لگا...

چمکتی ہوئی دو متوازی پٹریاں اس کی نظروں کے سامنے تھیں اور وہ گُم صم کھڑا اُنہیں بغور تک رہا تھا۔ اسٹیشن پر لوگوں کا ہجوم اِدھر اُدھر ہو چکا تھا۔ جانے والے جا چکے تھے۔ کچھ قلی تھکے ہارے دیواروں سے لگے بیڑی سلگانے لگے تھے۔ اور کچھ اسٹیشن پر بکنے والی چائے پی کر اپنی تھکن دور کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ انور اپنی جگہ ٹھہرا سوچ رہا تھا۔

یہ دو سیدھی لکیریں ہیں۔ کیا کسی جگہ جا کر ایک دوسرے سے مل نہیں سکتیں؟ اور پھر اس کی نظریں پٹریوں پر سے پھسلتی ہوئی بہت آگے تک نکل گئیں۔ وہاں، جہاں جا کر یہ دونوں لکیریں ایک دوسرے میں مدغم ہوگئی تھیں۔

وہ یکا یک تیزی سے آگے بڑھا۔ پیچھے کھڑے اطہر نے اسے پکڑ لیا۔

کہاں جا رہے ہو انور؟

یہ جو دونوں پٹریاں یہاں الگ الگ ہیں اور دوسرے کے متوازی ہیں وہاں جا کر اس نے انگلیوں سے دور اشارہ کیا۔

وہاں جا کر یہ دونوں ایک دوسرے سے مل گئی ہیں۔ میں.... اس نے بے چارگی سے اطہر کی

جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
میں وہاں تک جانا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں ملاپ کیسا لگتا ہے؟
اطہر تڑپ گیا۔
سیلینا اب تمہیں نہیں مل سکتی میرے بھائی۔ اس نے آپ ہی آپ کہا۔
مجھے چھوڑ دیجیے بھائی جان میں وہاں تک ضرور جاؤں گا۔ اس نے اپنا بازو چھڑانا چاہا اس کے لہجے میں عزم تھا پختہ عزم۔
یہ پٹریاں ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملتیں انور۔ یہ سب تمہاری نظروں کا دھوکا ہے۔ آؤ گھر چلیں۔
اطہر نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔
یہ سب ہماری نظروں کا دھوکا ہے۔ آخر جگہ جگہ دھوکا کیوں ہے؟ یہاں بھی دھوکا وہاں بھی دھوکا وہ آپ ہی آپ بول رہا تھا۔
اطہر اس کا ہاتھ تھامے اب واپسی کے راستے پر تھا۔ اور ان دونوں کے پیچھے شاکرہ اور نجمہ سر جھکائے یوں چلی آ رہی تھیں جیسے وہ اپنی کسی بہت پیاری بے حد عزیز دوست کے جنازے کا آخری دیدار کر کے لوٹی ہوں۔
کچے پکے اونچے نیچے راستوں سے ہوتی ہوئی جیپ جب حویلی کے پھاٹک پر آ کر ٹھہری تب رات کے سائے اسے اپنی آغوش میں لے چکے تھے۔ وہ حویلی اچانک ان سب کو اتنی اداس اتنی ویران محسوس ہوئی کہ کچھ دیر تک سب ہی جیپ میں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ کسی میں اترنے تک کی ہمت نہیں تھی۔ نجمہ شاکرہ کے منہ لٹکے ہوئے تھے اطہر اسٹیرنگ کو مضبوطی سے تھامے اپنے اندر کو مضبوط کر رہا تھا۔ انور کا چہرہ بخار سے تپ رہا تھا۔ آنکھیں لگتا تھا اب باہر نکل کر گر پڑیں گی اور اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ رات نے اس کی یہ کیفیت اپنی سیاہی میں چھپائی ہوئی تھی ورنہ تو سب ہی چیخ چیخ کر رو رہے ہوتے۔
کچھ دیر سب ہی جیپ میں چپ چاپ بیٹھے رہے اور سلینا کی اس سیٹ کی طرف تکتے رہے جس پر بیٹھ کر وہ یہاں سے روانہ ہوئی تھی اور واپسی کے سفر میں اس کی سیٹ دہائی

دے رہی تھی۔ کتنی دیر وہ بیٹھے رہتے اور پھر ایک دم ہی سے سب کود پڑے۔ کون کدھر گیا۔ کسی کو ایک دوسرے کا ہوش ہی نہیں تھا۔

وہ رات حویلی کی تاریخ میں تمام راتوں میں سب سے زیادہ کالی اور ویران تھی۔ نوحہ کررہی تھی اپنے ایک مکین کے کم ہوجانے کا۔ اندھیرے ہی میں باہر کے پیڑ پودوں نے دیکھ لیا تھا کہ یہاں کی روش پر روز چلنے والی سلینا کم ہے۔ وہ واپس نہیں آئی ہے۔ اس اندھیرے میں حویلی کے عقبی حصے کی وہ گھاس پھوس والی کٹیا نوحہ خواں تھی۔ وہ رہتی تو صابن کا غبارا ایک دن آسمان تک ضرور پہنچ جاتا۔ اس کے جذبے میں اتنی صداقت تھی کہ سیارے کا خلا میں پہنچ جانا یقینی تھا۔ گھاس پر پاؤں رکھتے ہی گھاس نے فریاد کی وہ قدم کہاں گئے کہ جن کے تلے آنے کے باوجود گھاس کو دم گھٹنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا پودوں کے رنگ تبدیل ہوگئے۔ تتلیاں اپنے پر سمیٹ کر جیسے احتجاج کر رہی ہوں آئندہ وہ اُڑیں گی ہی نہیں۔ وہ مخصوص پتھر جو ملاپ کا استعارہ تھا رات کی تاریکی میں بھی اسے بلا رہا تھا۔ آؤ کچھ دیر اور بیٹھ جاؤ۔ ہوا فضا خلا اور تمام پیڑ پودے بولتے ہیں سوچتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ وہ تو فریاد بھی کرتے ہیں بس ہم ہی ان کی آواز نہیں سنتے۔

اس رات حویلی کے ہر ایک کمرے کی روشنی بند تھی۔ اور ہر ایک فرد کے ذہن کے دریچے میں صرف ایک شخصیت کی ہی یاد کے دیے روشن تھے۔ ہر ایک کے سائے کے ساتھ صرف ایک ہی سایہ تھا۔ اس کا اپنا نہیں سسٹر کراس کا۔ جو اس گھر میں ایک مریض کی نرس کے طور پر آئی تھی۔ جو ان سب کی ملازم تھی اور جو آتے ہی اس گھر پر رحمت کا فرشتہ بن کر چھا گئی تھی۔ اور جو ابھی ابھی اپنا فرض نبھا کر اس گھر سے رخصت ہو چکی تھی۔ اور سب اپنی اپنی جگہ اس کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کا حساب کر رہے تھے۔ اور وہ بے حساب یاد آ رہی تھی۔

کسی کی آنکھوں میں اس کی یاد آنسو بن کر چمک رہی تھی۔

کسی کے سینے میں اس کی یاد دیے کے مانند روشن تھی۔

اور کسی کے جذبوں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

اور کوئی سوچ رہا تھا کہ وہ کون تھی۔ کہاں سے آئی تھی جو چپکے سے آئی اور اس گھر کا سب سے قیمتی اثاثہ چرا کر بھاگ گئی۔ اور اس اثاثے سے بھی زیادہ قیمتی شے اپنی یاد کی صورت میں یہاں چھوڑ کر چلی گئی۔

آج ڈرائنگ روم ویران تھا۔ نہ وائلن کے تاروں کی گونج تھی نہ قہقہوں کا ہجوم نہ باتوں کی آواز۔ آتش دان کی آگ بھی سرد تھی مگر دلوں کی بھٹی سلگ رہی تھی۔ لب خاموش تھے اور دل بول رہے تھے۔

اطہر اور نجمہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آرام کرسی پر کچھ یوں بیٹھے تھے جیسے سامنے ہوتے ہوئے بھی وہ نظریں نہ ملانا چاہتے ہوں۔ اطہر کے پاس ہی میز پر رکھی ایش ٹرے میں راکھ اور ادھ جلے سگرٹ کا انبار تھا اور پیشانی پر سوچوں کی اَن گنت لکیریں۔ لب خاموش تھے اور دل بول رہا تھا۔

سلینا چلی گئی۔ وہ اکیلی ہے اور انسانوں کے اس وسیع جنگل میں کتنے بھیڑیئے منہ پھاڑے گھومتے پھرتے ہیں۔ کیا وہ حساس لڑکی اپنے آپ کو ان انسانی شکل والے بھیڑیوں سے بچا سکے گی۔ وہ جو بے حد معصوم اور پاکیزہ لڑکی ہے۔ کم ہمت اور بزدل جو اپنے آپ کو بہادر بنا کر پیش کرتی ہے اور جو ننھا سا کانچ کا دل رکھتی ہے۔

اس کے دل نے دھیرے سے پوچھا۔

مجھے اس سے اتنی محبت کیوں ہے۔ میں، جس نے نجمہ شاکرہ اور انور کے علاوہ کسی کو اپنے سے اتنا قریب نہیں پایا۔ میرے دو بیٹے ہیں آج مجھے ایک بیٹی کے باپ ہونے کا احساس اس قدر شدید کیوں ہے۔ وہ میری کون تھی؟ صرف ایک ملازم ہی نا۔ اس نے زور سے سر جھٹکا۔ ملازم کا لفظ اسے اچھا ہی نہیں لگا۔ وہ تو میری بیٹی تھی۔ وہ میری بہن تھی۔

نجمہ کا دل چپکے چپکے کہہ رہا تھا۔ خاموش آواز میں۔

ہم دونوں کی تقدیریں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں۔ میں نے اطہر کو چاہا مجھے وہ مل گئے۔ میں ایک خوب صورت گھر کی مالک ہوں۔ میرا شوہر مجھ سے پیار کرتا ہے۔ شاکرہ اور انور میرے گھر کی رونق بڑھاتے ہیں۔ ندیم اور افسر سے میری مامتا کو ٹھنڈک ملتی ہے۔

دنیا ہی میں مجھے ایک حسین اور پرسکون جنت مل گئی ہے۔ اب کوئی مجھ سے پوچھے کہ تمہیں کیا چاہیے؟ میں تو پورے سکون سے کہہ سکتی ہوں اب مجھے کسی چیز کی تمنا نہیں۔ یقیناً میں دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہوں۔ اور وہ جو میری ہی جیسی ہے۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ اس نے انور کو شدت سے چاہا۔ ہم سب یہ محسوس کر سکتے ہیں مگر وہ انور کو چھوڑ کر جانے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی رہی۔ اس کے پاس تو کوئی بھی گھر نہیں ہے۔ کوئی بھی رشتہ نہیں ہے۔ وہ تو انسانوں کے ہجوم میں رہتے ہوئے اکیلی ہے، بالکل اکیلی۔

نرم دل نجمہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برساتیں شروع ہو گئیں۔

آج میرے دل میں ایک خواہش جنم لے رہی ہے۔ کاش سلینا یہاں سے نہ جاتی، بس انور کو اپنا لیتی۔ وہ کم ہمت لڑکی تھی۔ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پائی۔

اطہر، نجمہ کی کیفیت دیکھ رہا تھا۔ کیفیت تو اس کی بھی یہی تھی مگر وہ نجمہ کا دکھ بانٹنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے گھر میں لا کر نجمہ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں وہ کبھی آنسو نہیں آنے دے گا۔ اور وہ اپنا وعدہ پورا کر پایا تھا۔ نجمہ ہمیشہ خوش رہتی اور اطہر ہمیشہ مطمئن تھا۔ مگر آج نہ وہ خوش تھی اور نہ وہ مطمئن تھا۔ سلینا نے اس گھر کی بنیاد ہی ہلا دی تھی۔

ہم لوگ احمق ہیں۔ اطہر نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ جذباتی بننے سے کیا فائدہ۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ یہاں سے چلی گئی۔ وہ ہماری تھی بھی کون؟ اطہر شاید اپنے آپ کو جھٹلا رہا تھا۔

ہماری محسن تھی وہ اطہر۔ نجمہ کی آواز بھاری تھی۔

اس کے وجود میں عجب سی کشش تھی۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارا ساتھ مدتوں کا تھا۔ اور آج وہ ساتھ ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔

وہ اچھی لڑکی تھی۔ اچھے کردار کی لڑکی۔ مغربی مگر بہت حد تک مشرقی۔ میں نے مغرب کی عورتوں کو کبھی اچھا نہیں سمجھا۔ ان میں نسوانیت تو ہوتی ہی نہیں ہے۔ لیکن ایک کمزور سی کم ہمت لڑکی سلینا نے میرے خیالات بدل کر رکھ دیے ہیں کہ اچھائی صرف کسی ایک معاشرے کی میراث نہیں ہوتی۔ یہ بات میں نے سلینا کو دیکھ کر محسوس کی۔ ہم اس سے اگر رشتہ جوڑ نہیں ہو سکے تو توڑ بھی نہیں سکتے۔ ہمارے اس کے درمیان ایک گم نام بے نام

رابطہ ضرور رہے گا۔ وہ جا کر بھی یہاں ہر وقت موجود رہے گی۔تم اسے خط لکھتی رہنا۔ اطہر نے نجمہ کو ہدایت کی۔

اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنا پتا تحریر کرے گی۔ نجمہ کی آواز میں اب بھی اداسی تھی۔ اطہر اور نجمہ دیر تک اسی کی باتیں کرتے رہے۔

دوسری طرف اکیلی شاکرہ کا دل نہ اپنے کمرے میں لگتا تھا اور نہ سلینا کے ویران کمرے میں۔

سلینا تم تو ہمارے گھر کو اداس کر گئیں۔

کاش تم یہاں رہ جاتیں۔ اس کی نظریں اس کیل پر تھیں جہاں کنواری مریم کی تصویر آویزاں تھی۔

تم نے انور بھائی سے محبت کی۔ ہم سب نے یہ بات جان لی ہے، مگر تم اپنی محبت کو ادھورا چھوڑ کر یہاں سے چلی گئیں۔کوئی یوں بھی اپنی چاہت کو ٹھکراتا ہے۔ وہ سلینا کے بستر پر لیٹ گئی۔

تم چلی گئیں لیکن کیا تم اپنے فیصلے پر قائم بھی رہ سکو گی۔تمہیں یہاں لوٹ کر آنا ہی ہوگا۔تم آؤ گی۔ کیوں کہ تمہاری محبت سچی ہے اور یہاں اسی حویلی میں تمہاری محبت رہتی ہے۔ تمہیں یہاں آنا ہی ہوگا۔

شاکرہ نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اسے امید تھی کہ سلینا ایک دن ضرور واپس آئے گی۔ اپنی غلطی تسلیم کرلے گی اور انور کو اپنا بنالے گی۔ وہ سب کچھ اپنی خواہش کے مطابق سوچ رہی تھی۔مگر نیند تو اب بھی اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

اس گھر میں ایک دل اور بھی تھا جو آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

سب کچھ فراڈ ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ فراڈ ہے۔

انور کے سگرٹ کا اسٹاک ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ اپنے کمرے کے اس دروازے سے باہر نکل آیا تھا جسے سلینا نے اس کی بیماری کے دنوں میں بند کردیا تھا۔ اور پھر سردیاں آگئی تھیں۔ ادھر سے ٹھنڈی ہواؤں کا جھونکا آتا اور انور کے کمرے کی آگ کو بھی ٹھنڈا

کر جاتا۔ آج رات یہ دروازہ کھلا پڑا تھا۔ باہر کی سرد ہواؤں سے یہ کمرا کانپ رہا تھا۔ اور بغیر کسی گرم کپڑے کے انور باہر رات کی تاریکی میں روش پر آہستہ آہستہ سر جھکائے چلا جارہا تھا۔ بغیر منزل کا تعین کیے۔

اس کے دماغ میں بے شمار چیونٹیاں ایک ساتھ رینگ رہی تھیں۔ اس کا جسم کسی شدید چوٹ سے پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ اس کے احساس میں اک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اور وہ اپنی ہتھیلیوں کو اضطراری انداز میں ایک دوسرے سے مسل رہا تھا۔

ہیلو انور۔ ان سے ملو یہ میرے شوہر ہیں بیڈن، آج ہی جنوبی افریقہ سے تجارتی دورے پر لندن آئے ہیں۔

یہ آواز جانے کدھر سے انور کو برابر سنائی دے رہی تھی۔ وہ لپک کر حویلی کے پھاٹک کی طرف بڑھا پھر دوڑ کر بیلے کی ان کیاریوں کی طرف جو لان کے بالکل آخری سرے پر سلینا کے کمرے کی جانب دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

میں میبل نہیں بن سکتی انور۔ یہ آواز اسے بیلے کی کیاریوں کی ہی جانب سے سنائی دی۔

تم میبل نہیں بن سکتیں۔ لیکن تم سلینا بھی تو نہیں رہیں نا۔

وہ لان پر پتھر کی اس بینچ کے پیچھے کھڑا ہوگیا جہاں اس نے سب سے پہلے سلینا کے لیے اپنے دل میں محبت کا جذبہ بے اختیار اٹھتے محسوس کیا تھا۔ وہ ایک نکھری نکھری سی صبح تھی۔ سلینا سفید نائٹ گاؤن میں صبح کی دیوی بنی عالمِ بے خودی میں بیٹھی ہلکے ہلکے گھاس پر اپنے پیر کے تلوے سہلا رہی تھی۔ اور اس نے سوچا تھا۔

یہ صبح کی دیوی اس کے چمن میں کہاں سے آگئی۔

وہ کہاں چلی گئی۔ اس نے شدتِ جذبات سے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔

اور پھر سرد رات کی تاریکی میں اس کی آواز نغمہ بن کر چمکی جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

بس ایک موتی سی چھب دکھا کر بس ایک میٹھی سی دُھن سنا کر
ستارۂ شام بن کے آیا برنگِ خوابِ سحر گیا وہ

وہ چیخ چیخ کر گا رہا تھا یا رو رہا تھا۔

خوشی کی رُت ہو کہ غم کا موسم نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں مرے تو دل میں اُتر گیا وہ

اس کی آواز میں دنیا جہان کا درد سمٹ آیا تھا۔ اس کا کلیجہ پھٹ رہا تھا۔ اور رات کی تاریکی اس کی آواز سے لرز رہی تھی۔

وہ میکدے کو جگانے والا وہ رات کی نیند اُڑانے والا
یہ آج کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ

اس کی آواز کے ساتھ کوئی موسیقی نہیں تھی لیکن پتوں کی سہمی سہمی سرسراہٹ اس کے ایک ایک لفظ کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر موسیقی کا ہی کام انجام دے رہی تھی۔ اب وہ گاتا ہوا روش پر دیوانوں کی طرح دوڑنے لگا۔

دوڑتے دوڑتے جب اس کے پاؤں تھک گئے تب وہ ایک جگہ ٹھہر گیا اور اس نے پھر خالص فلسفیوں والے انداز میں سوچا۔

جب دو پٹریوں کو کسی ایک جگہ بھی ایک دوسرے سے ملنا نہیں ہوتا تب وہ پھر ساتھ ساتھ چلتی کیوں ہیں؟

سب فراڈ ہے۔ سب کچھ فراڈ ہے۔ ہر شخص فراڈ ہے۔ اس کے ذہن نے فیصلہ صادر کر دیا۔

اور پھر ایک سایہ آہستہ آہستہ روش سے ہوتا ہوا بیلے کی کیاریوں کی جانب تھوڑا سا جھکا اور پھر چلتا حویلی کے عقبی حصے میں گھاس پھوس کی کٹیا کی طرف جا کر گُم ہو گیا۔

سناٹے میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ بازگشت بنے سنائی دے رہے تھے۔

وہ ہجر کی رات کا ستارا............سنا ہے کل رات مر گیا وہ

رات اور بھی ٹھنڈی اور بھی تاریک ہو گئی۔

اور حویلی کسی آنے والے ان جانے خدشے سے لرز کر رہ گئی۔

۳۶

.....نہ جانے زندگی کے ساتھ میرا روّیہ درست ہے یا ان لوگوں کا جو بڑھ کر زندگی سے وہ سب کچھ چھین لیتے ہیں جس کی انہیں خواہش ہوتی ہے۔ کیا وہ اب بھی یہ نہیں سمجھ پائی ہے کہ زندگی سے کچھ مانگنے والوں کو کچھ بھی نہیں ملتا چھین لینے والوں کو بہت کچھ مل جاتا ہے...

چمکیلی صبح نمودار ہوئی تو وہ اس بڑے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اتر گئی جہاں تک کا ٹکٹ اس کے پاس تھا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے میں اس وسیع و عریض دنیا کے ہنگاموں میں گُم ہونے جا رہی ہوں۔ علی نگر کے فارسٹ آفیسر اطہر علی اور ان کے گھر والوں کو میرا اپنا نشان بھی نہیں مل سکے گا۔ اب سے تین گھنٹے بعد میں جس ٹرین میں سوار ہو کر جس اسٹیشن کی طرف گامزن ہوں گی وہی میری منزل ہوگی جس کا کوئی سراغ میں چھوڑ کر نہیں آئی ہوں۔

اس نے یہ سب کچھ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے اس وقت تک سوچا جب تک کہ ٹرین رینگتی ہوئی دو چمک دار پٹریاں خالی نہیں کر گئی۔

''تم میری متوازی لکیر بن جاؤ'' اسے اسپتال کے اپنے مریض کا یہ جملہ یاد آ گیا۔

دو متوازی لکیریں کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملتیں۔ اس نے جواب میں کہا تھا ''لیکن۔'' متوازی لکیریں ایک دوسرے سے مل بھی جاتی ہیں۔ اس نے دور تک پٹریوں پر نظریں دوڑائیں۔

لیکن۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نظریں دھوکا کھا جاتی ہیں۔ وہ کانپ گئی۔
کنواری مریم میری زندگی کو خوش گوار بنا دے۔ میں اب کسی دھوکے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔
اس نے اپنے گلے کی لٹکتی صلیب پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرا اور سوٹ کیس اٹھائے دھیرے دھیرے بوجھل قدم بڑھاتی ہوئی ویٹنگ روم میں آ گئی۔

رات بھر کے سفر میں وہ اتنی نڈھال نہیں ہوئی تھی۔ اس کی حالت جو مُردوں سے بدتر ہو رہی تھی وہ سب کچھ اس کے جذبوں کی مار تھی جسے وہ مسلسل بہادر بن کر سہتی چلی آ رہی تھی۔

اس نے سوچا میں راستہ بدل چکی ہوں بالکل ٹرین کی طرح جو ایک مقام پر آ کر پٹری بدل لیتی ہے اور پھر سکون سے اسی پر چلتی چلی جاتی ہے کہ وہ جانتی ہے بدلی ہوئی پٹری اس کے مطلوبہ اسٹیشن کی طرف جاتی ہے۔ وہ چھوڑی ہوئی پٹری کے بارے میں بالکل بھی نہیں سوچتی۔
مجھے بھی چھوڑی ہوئی پٹری کو بھلا دینا چاہیے۔ کچھ دیر وہ پھر بھی بے مقصد کھڑی رہی۔ اور پھر تولیا صابن لے کر غسل خانے میں گھس گئی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے اس سردی میں نہاتے ہوئے اسے ایک لمحہ کو بھی تو احساس نہیں ہوا کہ اسے سردی لگ رہی ہے۔ وہ کانچ کا جسم اب لوہے کی دیوار بن چکا تھا۔ نہا کر اس نے طبیعت میں تازگی محسوس کی۔
کچھ دیر قبل وہ اس ویٹنگ روم میں تنہا مسافر تھی اور نہانے کے بعد جب وہ داخل ہوئی تو اسے ایک عورت کی پیٹھ نظر آئی۔
اس کے قدموں کی آہٹ سنتے ہی وہ عورت اس کی جانب مڑی۔
اوہ۔ معاف کیجیے گا میں آپ کا میگزین پڑھنے لگ گئی تھی۔
وہ عورت نہیں اس کی ہم سن ایک لڑکی تھی۔
شوق سے پڑھیے۔ ٹرین کے سفر میں کوئی ایک میگزین ہر مسافر کے زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔
اس نے مسکرا کر اجازت دے دی۔
آپ کو بھی نو بجے والی گاڑی سے ہی جانا ہے۔ اس نے صفحات پلٹتے ہوئے پوچھا۔

جی ہاں۔سلینا نے جواب مختصر کردیا۔
اس کی نظریں اسی لڑکی پر تھیں۔عنابی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس یہ لڑکی اسے بہت مطمئن اورخوش خوش لگی۔سلینا نے سوچا۔اس کے رخساروں پر شفق پھوٹی پڑ رہی تھی۔اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اوراس کی اداؤں میں بےفکری نمایاں تھی۔شانوں پر بکھرے بال اور چہرے کے خطوط دھیرے دھیرے جیسے بول رہے ہوں۔
سلینا یہ تیرے دیس کی لڑکی ہے۔
معاف کیجیے گا۔میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں۔اس کے تجسس نے اسے اس کا نام پوچھنے پر مجبور کردیا۔
جی۔میرانام۔وہ ہنسی۔اورسلینا نے محسوس کیا کہ اس کی ہنسی وائلن کے تاروں سے نکلنے والی موسیقی کی آواز سے بھی زیادہ کھنک دار ہے۔
میرا نام ثّریا ہے۔وہ ادا سے بولی۔
اور میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں۔اس نے بھیگے بالوں اور پھیکے چہرے والی کمزور لڑکی سے پوچھا۔
سلینا تولیے سے بالوں کو پونچھتی ہوئی اس ٹھنڈی آگ کے پاس سمٹ آئی جو نہ جانے کب ویٹنگ روم کے آتش دان میں سلگائی گئی ہوگی۔
میرانام سلینا ہے۔سلینا کراس اور میں نرس ہوں۔
عنابی ساڑھی والی اس لڑکی نے اپنی بھوری آنکھیں نچائیں اور نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹتے ہوئے بولی۔
سلینا کراس تمہارا نام ہے اورتم نرس ہو۔
مگر۔اس نے سرکو جھٹکا اورسلینا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔
نہ تم سلینا کراس لگتی ہواور نہ ہی نرس۔
یہ کیابات ہوئی۔سلینا کی آواز میں خفگی تھی۔
میرا مطلب ہے۔اس نے تیزی سے پہلو بدلا۔

نام تمہارا پاکستانی ہونا چاہیے تھا۔ یہی کوئی پروین۔ نسرین ۔ یاسمین وغیرہ۔ اور نرس کی بجائے تو تم مریض لگ رہی ہو۔

ہوں۔ اس نے اپنے مقابل بیٹھی ہوئی عنابی ساڑھی بھوری آنکھیں اور کٹے بالوں والی شوخ لڑکی جس نے ابھی ابھی اپنا نام ثریا بتایا تھا تیز نظریں ڈالتے ہوئے اسی کے انداز میں کہا۔

تم ثریا ہو اور مجھے تم ثریا نہیں لگتیں۔

اب تو میں ثریا ہی ہوں۔ ثریا ناصر۔ لندن میں مارگریٹ تھی۔ یہاں آ کر ثریا ہوگئی اس نے ساڑھی کا پلّو ایک خاص ادا کے ساتھ اپنے شانوں پر ڈالا جو ڈھلک کر اس کی گود میں آ گرا تھا۔

گیلے بالوں والی لڑکی کو یک بارگی اپنی وہ ساڑھی یاد آ گئی جس کا پلّو اس کے قابو میں آتا ہی نہ تھا اور چکنی مچھلی کی طرح ہاتھوں سے پھسل جاتا۔

اس نے عنابی ساڑھی والی لڑکی پر حسرت سے نظریں دوڑائیں۔

تو مشرق کا ایک تاج محل تمہارے ہاتھ آ لگا ہے۔

سلینا نے آپ ہی آپ سوچا۔ میں اپنے تاج محل کو خود ہی مسمار کر کے چلی آئی ہوں۔ اور یہ سوچ اس کے لیے کانٹا تھی جو سیدھی اس کے جگر کو چھلنی کرتی گئی۔

ناصر سے میری ملاقات لندن یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں اقتصادیات کے طالب علم تھے۔ اکٹھے پڑھتے تھے ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہوگئی۔ اور ہم نے شادی کر لی۔ ناصر مجھے یہاں لے آیا اور اب میں ثریا کہلاتی ہوں۔ اس نے بے تکلفی سے اپنی داستان سنا ڈالی۔

تم اپنی نئی زندگی سے مطمئن ہو۔ سلینا آہستہ آہستہ ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔

فی الحال تو مطمئن ہوں۔ آگے کا کہہ نہیں سکتی۔ اس لڑکی نے کندھے اُچکائے۔

تم نے ابھی کہا تھا تمہیں ناصر سے محبت ہوگئی تھی۔ کیا اپنی محبت کی بنیاد پر بھی تم آیندہ کے بارے میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتیں۔

وہ محبت جولندن کی فضاؤں میں ہوئی تھی یہاں آ کر حالات بالکل ویسے تو نہیں۔ اس سے تو مختلف ہی ہیں نا۔ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مجھے ناصر کا گھر سُوٹ نہیں کرتا۔ لیکن۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ اس کے یہ معنی تو نہیں کہ مجھے ناصر سے محبت نہیں۔ میں ناصر سے محبت کرتی ہوں۔

سلینا کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل تیزی سے ہو رہا تھا۔ اور وہ عنابی ساڑھی والی لڑکی اچانک ہی بہت بے تکلف ہوگئی تھی۔

وہ بولے جارہی تھی۔

ناصر کے گھر کے لوگ بڑے مضحکہ خیز ہیں۔ اس کی بوڑھی اماں ہر آن میرے سر پر سوار رہتی ہیں۔ اوٹ پٹانگ کپڑے پہناتی ہیں۔ اُوٹ پٹانگ حرکتیں سکھاتی رہتی ہیں۔ یوں بولو۔ یوں اٹھو۔ یوں چلو۔ سچ سلینا۔ وہ یکا یک سلینا پر جھک آئی اور رازداری سے بولی۔ بعض اوقات تو میں سوچنے لگتی ہوں جیسے میں نے آج تک بولنا اٹھنا چلنا پھرنا کچھ سیکھا ہی نہیں۔

سلینا گُم صُم تھی۔ ہم لوگوں نے آج تک سیکھا ہی کیا ہے صرف یہی نا کہ شوہروں کو لباس کی طرح صبح شام بدلتے رہیں۔

نفیسہ، نسیم، شائستہ اور بے بی کا تو کچھ کہنا ہی نہیں۔

یہ دیکھو اس نے دونوں ہتھیلیاں سلینا کے آگے کر دیں۔

اچھے بھلے ہاتھوں میں سرخ رنگ مل دیا۔

سلینا نے اس کے دونوں ہاتھوں کو آہستگی سے تھام لیا۔

سرخ سرخ مہندی لگے ہاتھ اس کی نظروں کے سامنے شاکرہ آگئی جو اکثر مہندی کی باڑھ کو پانی دیتی تب نجمہ اسے چھیڑنا نہیں بھولتی۔

شاکرہ رانی خوب سینچ لو مہندی کے پودوں کو۔ اسی کے پتوں سے لال کروں گی تیرے ہاتھ۔

اور شاکرہ شرما کر اپنے دونوں ہاتھوں سے سرخ ہوتے ہوئے رخساروں کو چھپا لیتی کتنے

خوب صورت استعارے ہوتے ہیں ان لوگوں کے پاس محبت اور شادی کے لیے۔
دیور صاحب کوئی ہیں نہیں ورنہ وہ بھی کوئی نہ کوئی تماشا شروع کر دیتے۔
اور سلینا کے سامنے شریر انور آ گیا۔
بھابھی آج میرے لیے گاجر کا حلوہ بنائیں گی نا۔
وہ کس خوشی میں جناب!
اچھا پھر ٹھیک ہے۔ وہ بھائی جان۔ اس نے دھمکی دی۔
اور جانے بھابھی کی وہ کون سی کمزوری تھی کہ اس نے فوراً حلوہ بنانے کا وعدہ کرلیا۔
بھابھی اور دیور کا لفظ اور رشتہ سلینا کے لیے اور بھی محترم ہو گیا تھا کہ یہ انور اور نجمہ سے منسوب تھا۔ نجمہ جو انور کو ٹوٹ کر چاہتی تھی۔
اور انور۔ اس کے خیالات کا دھارا مڑ گیا۔
جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا۔
تم کچھ سوچ رہی ہو سلینا۔ اس لڑکی کی باتوں کا اسٹاک غالباً ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ بے تکلفی سے سلینا کو مخاطب کر رہی تھی۔
میں یہ سوچ رہی تھی۔ سلینا اپنی سوچ کے دائرے سے باہر آ گئی۔
تم جس جگہ آ گئی ہو یہاں کب تک رہ سکو گی؟
یہ تو ناصر کے رویے پر منحصر ہے۔ وہ جلدی سے بولی۔
یہ تم پر منحصر ہے ثریا ڈارلنگ۔ وہ اپنے پرانے لہجے کی طرف لوٹ رہی تھی۔ وہ لہجہ جو خالصتاً نرسوں والا لہجہ تھا۔
تم اس جنّت کو چھوڑ کر کبھی نہیں جانا۔ کبھی نہیں۔ لندن میں کچھ بھی نہیں۔ وہاں کی چکا چوند آنکھوں کو اندھا اور دل کو ویران کر دیتی ہے۔ وہاں کی روشنیوں میں گُم ہونے کے لیے اب وہاں کبھی نہیں جانا۔ ورنہ تم زندگی کا وہ حُسن کھودو گی جسے قدرت نے مہربان ہو کر تمہاری جھولی میں ڈال دیا ہے۔
سلینا کی آواز بہت مدہم تھی۔ اور وہ کوشش کر کے بہت زور سے بول رہی تھی۔

تم۔ثرّیا نے اس کی جانب بغور دیکھا۔
تم کسی سانولی رنگت والے مرد سے محبت تو نہیں کرتیں سلینا۔ اس بے تکلف لڑکی نے اپنا خدشہ بڑے اٹکتے انداز میں ظاہر کر دیا۔
ثرّیا کے اٹکتے جملے اتنے براہِ راست تھے کہ سلینا واقعی گڑ بڑا گئی۔مگر اسے اپنے جذبات پر ناقابلِ بیان حد تک اختیار حاصل تھا۔اس نے جذبات سمیٹے جو اس کے سارے وجود میں انگارے کی طرح دہک رہے تھے۔
ثرّیا اس کی آنکھوں سے کوئی راز پانے کو بے چین تھی۔
میں سانولی رنگت والے ہر مرد سے محبت کرتی ہوں۔
ثرّیا معنی خیز طور پر ہنسی۔
کیوں کہ سلینا کی آنکھوں کے کونے بھیگ چلے تھے۔
کیوں کہ میرا باپ بھی سانولا مرد تھا۔
اور کیا تم نہیں چاہتیں کہ تمہارے بچوں کا باپ بھی کوئی سانولا مرد ہی ہو۔
اقتصادیات کی ماہر ثرّیا نے نفسیات سے بھرپور ایک سوال جڑ دیا۔
آنکھوں کا پانی کانپ کر قطرے کی صورت میں سلینا کی گود میں جذب ہوگیا۔
اپنے بچوں کے سانولے باپ کی ہمیشہ حفاظت کرنا ثریا۔اسے تم کھونہ دینا۔
وہ نہ جانے کیوں اس سے یہ وعدہ لینا چاہتی تھی۔شاید وہ ایک اور بے وفا کو اپنی نسل سے کم کرنا چاہتی تھی۔
ناصر مجھے بہت چاہتا ہے سلینا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ مجھ سے جدا ہوا تو وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے گا۔ثریا کا لہجہ خوشیوں سے بھرپور تھا۔
اندیشوں کے باوجود بھی۔انسان کتنا خودغرض ہوتا ہے۔
مشرق کے یہ تاج محل کانچ کا دل، موم کا ذہن رکھتے ہیں۔ ذراسی گرمی پا کر ان کا ذہن پگھل جاتا ہے اور ذراسی ٹھیس سے ان کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔
یہ بے وقوف اپنے دل اور ذہن کو مغرب کی آگ اور پتھر کے حوالے جانے کیوں کر دیتے

ہیں۔ جب کہ دو سرخ ہاتھ ان کے دل اور ذہن کے بہترین نگہبان ہوتے ہیں۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبی تھی کہ کسی نے دروازے پر ہولے سے دستک دی۔ اور اس کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا۔

آجاؤ انور!

شاید تمھیں کوئی بلا رہا ہے۔ثریا نے سلینا سے کہا۔

میں تنہا ہوں۔سلینا کی یہ آواز کسی کھنڈر سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔

یہ دستک تمہارے لیے ہے۔ دستک پہچانو۔

ثرّیا اٹھ کر چلی گئی۔

تب سلینا نے سوچا۔ وہ کس قدر تنہا ہے۔اپنی ذات کے اندر بھی اور ذات کے باہر بھی۔ اس ویٹنگ روم کے اندر بھی اور ویٹنگ روم کے باہر بھی۔

یہ جو لڑکی ابھی ابھی کسی کی دستک پر گئی ہے، میرے دیس کی لڑکی ہے۔لیکن کتنی خوش قسمت ہے۔

اس نے بہت پرانی بات ایک بار پھر سوچی۔

نہ جانے زندگی کے ساتھ میرا روّیہ درست ہے یا ان لوگوں کا جو بڑھ کر زندگی سے وہ سب کچھ چھین لیتے ہیں جس کی انہیں خواہش ہوتی ہے۔کیا وہ اب بھی یہ نہیں سمجھ پائی ہے کہ زندگی سے کچھ مانگنے والوں کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ زندگی سے چھین لینے والوں کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔

انور علی۔ اس نے کرب سے سوچا۔تمہاری ایک کتاب میں ایک فلسفی نے لکھا تھا کہ آرزو نصف زندگی ہے اور بے حسی نصف موت۔ اور جس کی تصحیح میں کر آئی ہوں کہ آرزو مکمل موت ہے۔

وہ سسک پڑی۔

۳۷

..... تم رہبر بھی بنیں تو منزل ہی لوٹ لی۔ تم کیا جانو جس
گاڑی میں تم مجھے سوار کرنے جارہی ہو وہ میری منزل کی
طرف نہیں جاتی لیکن اس میں تمہارا بھی کیا قصور ہے ٹکٹ تو
میں نے ایسی منزل کا خریدا ہے۔ جو میری منزل ہے ہی نہیں...

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر سوٹ کیس لے کر پلیٹ فارم پر
آ گئی۔
سورج پوری طرح نکل آیا تھا لیکن اس کی گرمی ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ اس نے شال اپنے گرد لپیٹی ہوئی تھی لیکن اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کے بال ابھی گیلے ہیں۔ وہ نہائی بھی ہے اور اگر اسے سردی لگ گئی تو بخار بھی ہوسکتا ہے۔ جو اس کا پیچھا کئی دن سے کیے ہوئے بھی تھا لیکن اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ اس کی آؤ بھگت کرتی۔ وہ تو اب اپنے آپ سے بے نیاز تھی۔ بس ایک مشینی انداز سے وہ آگے کے تمام سفر طے کر رہی تھی۔
تین نمبر والے پلیٹ فارم پر پورے زور شور کے ساتھ ایک گاڑی
آ کر رک گئی۔ وہ سوٹ کیس سنبھال کر ڈبے میں داخل ہو ہی رہی تھی کہ کسی نے اس کے ہاتھوں کو پیچھے سے پکڑ کر گاڑی سے اتار لیا۔
اسے ایسا لگا کہ وہ ہاتھ نجمہ، شاکرہ یا اسی گھر کے کسی کا بھی ہے۔ مگر سامنے ثریا کھڑی تھی۔ اسے گاڑی سے اتارنے بھلا وہ لوگ کیسے آ سکتے ہیں جو اب اس کی زندگی سے دور بہت

دور جا چکے ہیں۔
ثریا ناصر صاحب کے ساتھ کھڑی تھی جو جھک کر سگرٹ سلگا رہے تھے۔ اس نے بغور ناصر صاحب کو دیکھا۔
تو تم بھی اپنی قسمت کی لڑکی پانے کے لیے سات سمندر پار چلے گئے تھے۔
خدا کرے تمہارا دماغی توازن کبھی نہ بگڑے۔ اس نے خلوصِ دل سے انہیں دعا دی۔
دیکھو گاڑی کا انجن کس طرف ہے؟ ثریا کی کھنک دار ہنسی کے ساتھ ہی اس کی نظریں انجن پر پڑیں۔
اوہ۔ یہ گاڑی تو اسی سمت جا رہی ہے جدھر سے وہ ابھی آئی ہے۔
اس نے حسرت سے لمبی گاڑی کے ہر ہر ڈبے پر نظریں دوڑائیں۔
ہماری گاڑی آنے میں ابھی دس منٹ باقی ہیں۔ اور وہ پلیٹ فارم نمبر چار پر آئے گی۔ آؤ اُدھر ہی چلیں۔ وہ بے تکلفی سے سلینا کا ہاتھ تھامے آگے آگے چلنے لگی۔ ایسے جیسے اگر اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تو وہ اسٹیشن کے ہجوم میں ننھی بچی کی طرح گُم ہو جائے گی۔
سلینا پیچھے پیچھے چلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔
تم رہبر بھی بنیں تو منزل ہی لوٹ لی۔ تم کیا جانو جس گاڑی میں تم اب مجھے سوار کرانے جا رہی ہو وہ میری منزل کی طرف نہیں جاتی۔ لیکن اس میں تمہارا بھی کیا قصور ہے؟ ٹکٹ تو میں نے ایسی منزل کا خریدا ہے جو میری منزل ہے ہی نہیں۔
اس بار جب وہ ٹرین میں بیٹھی تو اس نے پچھلے اسٹیشن کی طرح یہاں بھی رخصت کرنے والوں کا ہجوم دیکھا۔ لیکن ایک بھی چہرہ ایسا نہیں تھا جو اسے رخصت کرتا۔ رومال ہلاتا، آنسو بہاتا۔ چائے سے بھرا تھرماس پکڑاتا۔ نئے نئے میگزین خرید کر ہاتھوں میں پکڑا دیتا۔ پہنچنے کا تار دینے کی ہدایت کرتا۔ سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا۔ ہاتھ ملاتا۔ ہولے سے دبا دیتا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لاتا اور آنکھیں چرا کر انہیں پونچھ لیتا۔ دو بڑی بڑی آنکھیں خلا میں گھورتیں۔ ٹرین حرکت میں آتی تو وہ نظریں اس کے چہرے پر جم جاتیں۔ اور پھر خاموش آواز میں یوں گویا ہوتیں۔

''لوٹ چلو۔ چلو کہ ہم ایک نئی دینا بسائیں۔ مسرت کی۔ محبت کی۔''

ٹرین رینگنے لگی تھی اور وہ دروازے پر کھڑی ان بے پناہ ہجوم میں سے دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تلاش کر رہی تھی جو برابر اس سے اصرار کر رہی تھیں۔

لوٹ چلو سلینا۔ لوٹ چلو۔ ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر نہ جانے کسے الوداع کہا۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی برساتیں ہونے لگیں۔ ٹرین تیز ہوتی جا رہی تھی۔ پٹریوں پر پٹریاں بدل رہی تھی۔

میں نے بھی اپنی پٹری بدل دی ہے۔ اس نے کرب سے اپنے ہونٹ چبا لیے اسٹیشن پر اسٹیشن گزر رہے تھے، اور وہ کھڑکی سے لگی بیٹھی اس اسٹیشن کی منتظر تھی جہاں تک کے لیے خریدا ہوا ٹکٹ اس کے پرس میں پڑا تھا۔ اور اس کی نگاہیں ان راستوں پر تھیں جنہیں یہ ٹرین چھوڑتی چلی جا رہی تھی۔

یہ عمل کب تک جاری رہے گا۔ میں چلتی ایک طرف ہوں۔ دیکھتی دوسری طرف ہوں۔ اس نے تھک کر اپنا سر کھڑکی سے ٹکا دیا۔ تب اسے محسوس ہوا کہ اس کے سر ہی میں نہیں پورے جسم میں درد ہے۔ یہ درد تھکن کی طرح اس کے پورے وجود میں سرایت کر چکا تھا مگر وہ بدستور کھلی آنکھوں سے اوجھل راستوں کو دیکھ رہی تھی۔ سامنے اگرچہ مریم کی تصویر نہیں تھی مگر خلا میں اسے کہیں نہ کہیں کنواری مریم ٹرین کے ساتھ ساتھ چلتی محسوس ہوئی۔ ایسے جیسے وہ اس کی نگرانی کر رہی ہے۔ اس نے بھی اپنی آنکھوں میں بھر جانے والے آنسوؤں کو ساڑھی کے پلّو میں جذب کیا اور با آوازِ بلند بولی۔

کنواری مریم میں یسوع مسیح کی طرح صلیب پر چڑھ چکی ہوں۔ اور تو گواہ رہنا کہ میں نے اپنی نسل کی آبرو رکھنے میں اپنے دل کو لہولہان کر لیا ہے۔

۳۸

.....سیڑھی پر پہلا قدم رکھتے ہی جانے کدھر سے یہ خیال اسے پھر آ گیا۔ کہیں یہاں آ کر میں نے غلطی تو نہیں کی۔ وہ جیسے اس وقت حویلی کے دروازے پر کھڑی تھی اور اس نے کچھ یوں ہی سوچا تھا...

شام کے پانچ بجے جس اسٹیشن پر وہ اپنا سوٹ کیس تھامے اتری وہاں کی فضا بڑی نکھری نکھری تھی۔ ابھی بارش ہو کر تھمی تھی۔ اسٹیشن کی عمارت بارش کے چھینٹوں سے دھل کر صاف ہوگئی تھی۔ قلیوں کی سرخ قمیص جسے وقت کے طویل سفر نے دھندلا کر دیا تھا بارش کے قطروں نے ان کے اصلی رنگ کو اجاگر کر دیا تھا۔ سردی بھی اپنا زور دکھا رہی تھی۔ شال کے علاوہ مفلر بھی اس کے کانوں کو ڈھکے ہوئے تھا۔

انسانوں کے اسی ہجوم میں سلینا پلیٹ فارم پر کھڑی سوچ رہی تھی کاش بارش کی ننھی ننھی بوندیں میرے دل کی ویرانیوں میں اُتر جائیں۔ میرے ذہن پر چھائی ہوئی سوچوں تک بھی ان کا گزر ہو جائے۔ سب کچھ دھل کر صاف ہو جائے ساری یادیں مٹ جائیں ساری خواہشات گُم ہو جائیں اور میں ایک نئی سلینا بن جاؤں بغیر دل کے، بغیر دماغ کے، بغیر کسی سوچ کے۔ جس کا کوئی ماضی نہ ہو۔ کوئی حال نہ ہو بس مستقبل ہو جیسا بھی ہو اس سے پھر کیا فرق پڑے گا۔ مگر سب کچھ سوچ سے ہی نہیں بدلتا۔ بدلنے کے لیے کسی زلزلے طوفان سیلاب یا کسی آتش فشاں کی ضرورت ہوتی ہے جو سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔

اچانک کسی نے بڑھ کر اسے یوں گلے لگایا جیسے وہ اسے اپنے دل میں سمیٹ کر ساری دنیا سے چھپالینا چاہتا ہے۔اور سلینا اس کی چوڑی چکلی چھاتی سے لگتے ہی یوں تڑپ کر علیحدہ ہوئی جیسے سینے کے اُگے ہوئے بال جو اس کے کھلے گریبان سے جھانک رہے تھے بال نہیں سوئیاں ہوں جن کی نوکیں سلینا کو چھلنی چھلنی کر دیں گی۔

سوٹ کیس ڈیوڈ کے ایک ہاتھ میں تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے سلینا کا نازک سا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

سلینا، ڈیوڈ کے قدم سے قدم ملا کر بغیر کسی جذبے کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ میں نے اپنا اسٹور ٹھکانے لگا دیا ہے اور اب مستقل یہاں آ گیا ہوں۔تمہارے لیے ایک چھوٹا سا گھر لے لیا ہے۔ اسے ہم مل کر خوب سجائیں گے اور جلد ہی شادی کرلیں گے۔ ہے نا۔ ڈیوڈ نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اسے ساری باتوں سے آگاہ کیا۔

سلینا نے گردن جھکالی۔

آؤ ہم مسرت کی محبت کی ایک نئی دنیا بسائیں۔

اس کے کانوں میں آواز آئی۔

تمہارا مریض ٹھیک ہوگیا؟ یہ سوال نہیں ایٹم بم تھا جو سلینا کو ہیروشیما کی طرح تباہ کر گیا۔

تم جس کی تیمار داری کرو وہ کیوں نہ صحت یاب ہو جائے گا۔اب مجھے ہی دیکھو۔ڈیوڈ نے بات آگے بڑھائی۔

کئی پیالیاں توڑیں۔ کتنے انجکشن پھینکے۔مگر واہ ری ہماری ثابت قدم نرس آخر کار مجھے ہی ہار ماننی پڑی۔

کیوں ڈارلنگ؟ وہ پھر سلینا کے کانوں کے پاس جھک آیا۔سلینا کا وجود جو اس وقت کسی پرانے کھنڈر سے کم نہیں تھا۔اس میں سے ایک خالی خالی آواز آئی گھر کتنی دور ہے؟

معلوم ہوتا ہے تم تھک زیادہ گئی ہو۔ڈیوڈ نے اپنے بازوؤں پر اسے ٹکالیا۔

ہم ابھی گھر پہنچے جاتے ہیں۔سلینا آج کا دن میری زندگی میں بہت اہم ہے۔

اس نے پھر سرگوشی کی۔سلینا بدستور خاموش تھی۔

تم بھی تو کچھ بولو ڈارلنگ۔ ڈیوڈ کو سلینا کی خاموشی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔
یہ دن میری زندگی میں بھی اہمیت رکھتا ہے ڈیوڈ۔ اس نے پوری کوشش سے اپنی بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی پر اپنے لب رکھ دیے جو بہت دنوں بعد اس کے پرس سے انگلی میں منتقل ہوئی تھی۔ میں تمہاری ہوں۔ اور اس بار بھی اس کی آنکھوں سے پانی کا ایک قطرہ چپکے سے اس کی گود میں گر کر جذب ہوگیا۔
اوہ ڈارلنگ۔ ڈیوڈ کا چہرہ خوشی سے گلنار ہوگیا۔ وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ اس کے بعد اس کی آنکھوں سے اور کتنے قطرے ایک ساتھ ہی اس کی گود میں گر کر جذب ہوگئے ہیں۔ اور اس کا گلابی چہرہ سفید پڑ گیا ہے۔
گھر کے باہر ٹیکسی رکی تو وہ اتر پڑی۔ ڈیوڈ تالا کھول رہا تھا اور وہ دعا مانگ رہی تھی۔ پاک پروردگار تجھے یسوع مسیح کا واسطہ مجھے اس گھر کا اہل بنادے۔ میرے دل سے ساری پرانی یادیں کھرچ کر پھینک دے کہ میں صرف ڈیوڈ کی بن جاؤں۔
اور سیڑھی پر پہلا قدم رکھتے ہی جانے کدھر سے یہ خیال اسے پھر آ گیا کہیں یہاں آکر میں نے غلطی تو نہیں کی۔ وہ جیسے اس وقت حویلی کے دروازے پر کھڑی تھی اور اس نے کچھ یونہی سوچا تھا۔ کہیں یہاں آکر میں نے غلطی تو نہیں کی ہے۔ لیکن پھر فوراً ہی وہ تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے اپنے نئے گھر میں داخل ہوگئی۔

۳۹

..... گواہ رہنا کنواری ماں کہ میں نے اس شبیہ کو پہچاننے سے انکار کردیا ہے۔ وہ عقیدت سے گھٹنے ٹیک کر تصویر کے سامنے بیٹھ گئی۔ مجھے مغرب کا دفاع کرنا ہے۔ مجھے اپنی نسل کا مقدمہ لڑنا ہے...

اور پھر ایک دن ڈیوڈ اور سلینا ایک سادہ سی تقریب میں ایک دوسرے کے ہوگئے۔ نہ سلینا کے ہاتھوں میں مہندی لگی نہ کسی نے ڈھولک پر گیت گائے۔ نہ وہ سمٹ سمٹا کر کسی کونے میں گھونگھٹ نکال کر بیٹھی۔ وہ سارے تصور دھندلا گئے۔

سفید روایتی دلہنوں کے کپڑوں میں سلینا کسی حور سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی اک ٹک اپنے آپ کو دیکھے جارہی تھی۔ ایسی تو وہ کبھی بھی نہیں تھی۔ لال کناروں والی سوتی ساڑھی میں اس کے جسم کا سارا حُسن دب کر رہ گیا تھا۔ پہلی بار اطہر کی لائی ہوئی ریشمی ساڑھی میں الجھی ہوئی سلینا اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان پارہی تھی اور آج پھر آئینہ سلینا کو اس کا روپ دکھا رہا تھا۔ قدرت نے فیاضی کے ساتھ حُسن اس پر لٹا دیا تھا۔ اس نے کئی بار آنکھیں بند کیں کئی بار کھولیں اس بار جب اس نے آنکھیں کھولیں تب ایک اور شبیہ اسے نظر آئی جو اس کے پیچھے تھی اور جس کا چہرہ اسے صاف نظر آرہا تھا یہ کسی اور کی شبیہ تھی۔ اس نے کئی بار پلکیں جھپکائیں۔ شبیہ کبھی دھندلی ہوجاتی اور کبھی بالکل واضح ہوجاتی۔ پھر یہ ہوا کہ سلینا نے اسے پہچاننے سے صاف انکار کردیا۔ وہ تیزی سے آئینے کے پاس سے ہٹی تو اس کی نظریں دیوار پر لگی کنواری مریم کی

تصویر پر ٹک گئیں۔

گواہ رہنا کنواری ماں۔ کہ میں نے اس شبیہ کو پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ عقیدت سے گھٹنے ٹیک کر تصویر کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔

مجھے مغرب کا مقدمہ لڑنا تھا۔ مغرب نے میرے کاندھوں پر بڑی ذمہ داری ڈال دی تھی۔ مجھے اپنی نسل کا دفاع کرنا تھا جہاں میں پیدا ہوئی۔ جہاں میں پلی بڑھی جس کی ہواؤں اور فضاؤں نے میرے خدوخال ترتیب دیے۔ میں ان سب کی مقروض تھی۔ کنواری ماں میں ناتواں تھی۔ میں بہت کمزور تھی۔ میری زندگی میں بڑے کمزور لمحے آئے۔ میں نے ان لمحوں میں سے کچھ لمحے خاص اپنے لیے چُن لیے تھے۔ انہیں سمیٹ کر اپنے دل میں چھپا لیے تھے کہ وہ صرف میرے لیے تھے۔ ان پر تو صرف میرا ہی حق ہونا چاہیے تھا۔ زندگی میری اپنی تھی اسے مجھے ہی جینا تھا لیکن میں نے اپنی زندگی زمانے پر وار دی۔ میں نے ان سہمے سہمے، میٹھے میٹھے، رواں دواں لمحوں کا اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دیا۔

کنواری ماں گواہ رہنا میرے بعد آنے والی ہر سلینا کو میری کہانی سنانا انہیں بتا دینا کسی جنم میں کوئی سلینا رہتی تھی جس نے اپنی صلیب کو آپ ہی کاندھا دیا تھا۔

اس نے زمین پر اپنے ماتھے کو ٹیک دیا۔ وہ بندگی کی اعلیٰ ارفع معراج سے سرشار تھی۔ بس ایک آنسو تھا جس پر اسے اب بھی اختیار نہیں تھا۔

ارے سلینا تم رو رہی ہو؟

تم کیوں رو رہی ہو؟

میں تمہارے لیے رو رہی ہوں۔

میرے لیے مگر مجھے کیا ہوا ہے؟

میں اس لیے رو رہی تھی کہ تم مجھے اچھے لگنے لگے ہو۔

واقعی۔ مگر اس میں رونے کی کیا بات ہے؟

میں اس لیے رو رہی تھی کہ تم صابن کے غبارے اڑاتے ہو اور لوگ تمہیں پاگل سمجھتے ہیں۔

تو یونہی کہہ دیا ہوتا۔ اب میں یہ سب کچھ نہیں کروں گا۔
اور تم سب کچھ بھول چکے ہو۔ اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے۔
یہ غلط ہے میں اچھی طرح ہر بات لکھ سکتا ہوں۔
نہیں تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم کوئی بڑی چوٹ چھپائے ہوئے ہو۔
چوٹ۔ کیسی چوٹ؟
یہی تو میں تمہیں سمجھا نہیں سکتی۔ تم کوشش کرو۔ تم یاد کرو۔ جب تم لندن میں تھے۔
وہ ٹیمز کے پانی کی طرح دو نیلی آنکھیں اور وہ اخروٹ کی رنگت والی لڑکی۔
سلینا گھبرا گئی۔ وہ کسی گزرے سفر پر جا نکلی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے کنواری مریم کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ وہ ہڑ بڑا کر کھڑی ہوگئی۔ کنواری مریم کی آنکھیں سرزنش کر رہی تھیں۔
تم ماضی کا مزار کیوں بن گئی ہو؟
جس راستے کو چھوڑ کر آ گئی ہو اس راستے پر اب بھی ذہنی طور پر گامزن ہو۔ یہ ہے تمہارے پاک باز رہنے کا عزم؟
اور سلینا اپنے گناہوں کے بوجھ تلے دب کر پھر سے مریم کے آگے دوزانو ہوگئی۔
میرے جسم میں دو طرح کا خون گردش کر رہا ہے۔ میں دو راستوں پر بیک وقت چل رہی ہوں۔ میری رہنمائی کر پاک مریم۔ میری محبت کے مرکز کو مکمل طور پر بدل دے۔ میرے باپ کے حصے کا خون میری رگ رگ سے نچوڑ لے کہ میں اپنی ماں کی جانب آسانی سے جھک سکوں۔
وہ سایہ جو میرے ساتھ چلتا ہے اسے میرے ذہن سے۔ میرے وجود سے دور کر دے کہ میں صرف..... اس نے زور سے کہا۔
میں صرف ڈیوڈ کی ہو جاؤں۔
اس بار ڈیوڈ نے اس کے کندھے پکڑ کر اسے آہستگی سے اٹھالیا۔
تم میری ہو سلینا۔ صرف میری۔ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

اس کی آواز میں بے پناہ اپنائیت تھی۔ اور اس کے بازوؤں کے حصار میں دنیا جہان کی وسعت اور پناہ کا احساس تھا۔

سلینا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

گل دان سے گلاب کی نازک کلی توڑ کر اس نے ڈیوڈ کے کوٹ کے کالر میں لگا دی۔ اور بے اختیار ہی اس کا ہاتھ اپنے بالوں کی طرف اٹھ گیا۔

یہ میرا اظہارِ عقیدت ہے سلینا۔ اس بار پھر سلینا کی نظریں کنواری مریم سے بچنا چاہ رہی تھیں۔ ڈیوڈ نے اسے سنبھالا۔ وہ آواز کہیں فضا میں معدوم ہوگئی۔

وہ ڈیوڈ کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی سامنے والے چرچ میں داخل ہوگئی۔

جب وہ دونوں واپس لوٹے تو سلینا کراس سلینا ڈیوڈ بن چکی تھی۔

یہ تمہارا گھر ہے سلینا۔ تمہارا اپنا۔ تمہیں اپنے گھر کی بڑی آرزو تھی نا۔ اب تم اسے جتنا چاہو سنوارو۔ میں ہر ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہیں اتنا چاہوں گا۔ اتنا سنبھال کر رکھوں گا کہ تم کبھی مجھ سے دور نہیں ہو پاؤ گی۔

یاد ہے تم نے اسپتال میں مجھے نئی زندگی دی تھی۔ جینے کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

آج تمہارے نام میں اپنی تمام زندگی نذر کر رہا ہوں۔

اس نے اپنی دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ آجاؤ سلینا چھپ جاؤ میرے وجود میں سلینا ڈیوڈ کے پیار سے بہت متاثر تھی۔

شکریہ ڈیوڈ۔ اس کی آواز میں تشکر سے کہیں زیادہ ویران سناٹا تھا!

۴۰

..... کیا خاموشی گفتگو سے زیادہ سنگین نہیں ہوتی؟...

ڈیوڈ نے سلینا کا گھر خوشیوں سے بھرنے کا بھرپور عزم کر لیا تھا۔
سلینا کے ساتھ مل کر اس نے اپنے گھر کے چھوٹے سے لان کو خوب صورت چمن میں تبدیل کر دیا۔ رنگا رنگ پھول لہلہاتے تو سلینا کی طرف دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیا کرتا۔
ہماری زندگی ان لہلہاتے پھولوں کی طرح خوش گوار رہے۔
وہ خلوصِ دل سے دعا مانگتا۔
اس نے سلینا کی ضرورت کی ہر چیز کا گھر میں انبار لگا دیا تھا۔ روزانہ نت نئے ڈزائین کے کپڑے لاتا رہتا۔ ضد کر کے انہیں سلینا کو پہناتا۔ وہ سلینا کو ایک معصوم بچہ سمجھ کر اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ وہ تو سلینا سے ٹوٹ کر پیار کر رہا تھا۔
اور ایک دن جب وہ ڈھیروں پیکٹ سنبھالے گھر میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھوں میں اس دن کا تازہ اخبار بھی تھا۔
سلینا۔ سلینا ڈارلنگ کہاں ہو تم؟ دیکھو آج کے اخبار میں ہماری شادی کی تصویر چھپی ہے۔ آؤ ہم مل کر دیکھیں گے۔
مگر سلینا اپنے گھر کے ننھے سے لان میں بیلے کی کیاریوں میں پانی دیتی رہی۔

یہاں آ جاؤ۔ میں یہاں ہوں۔ کیاریوں کے پاس۔ اس نے دھیمی آواز میں وہیں سے جواب دیا۔ سلینا کو اپنی ہی آواز اپنے ہی کانوں میں اجنبی لگنے لگی تھی۔ مگر اب اسے اپنے بارے میں سوچنے کی عادت بھی کب رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی بھی کب جی رہی تھی۔

ارے.. ڈیوڈ کے بڑھتے قدم رک گئے۔ قبل اس کے کہ وہ تصویر سلینا کو دکھاتا اس کی نظریں ایک اشتہار پر پڑیں جو عین تصویر کے نیچے چھپا تھا۔

''علی نگر کے فارسٹ آفیسر اطہر علی کو اپنے مخبوط الحواس بھائی کے لیے ایک خوب رو اور محنتی نرس کی فوری ضرورت ہے۔''

سلینا۔ وہ کیاریوں کے پاس آ گیا۔

تم تو کہتی تھیں کہ تمہارا مریض صحت یاب ہو چکا ہے۔ مگر یہ دیکھو۔ اس نے با آوازِ بلند اشتہار پڑھا اور اس کا ایک ایک لفظ سلینا نے غور سے بہت غور سے سنا۔

اور اس کا چہرہ، بیلے کے پھول کی طرح سفید ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں نے آنکھوں کے اندر ہی جلدی سے ایک دائرہ بنایا جیسے کہہ رہی ہوں سب کچھ ختم ہو گیا۔ اور پھر دل سے ایک آواز بلند ہوئی۔

میرے رب مجھے صلیب پر نہ چڑھا۔ تو مجھے زندہ آسمان پر اٹھا لے اور پھر دوبارہ کبھی کسی وقت دنیا میں بھیج دے۔ جب میں کسی کی بھی مقروض نہ رہوں۔ میں کسی حویلی کے گیٹ پر پہنچ کر اندیشوں کے ساتھ یہ نہ سوچوں کہ کہیں میں نے یہاں آ کر غلطی تو نہیں کی۔ میں پھر کسی گھاس پھوس کی کٹیا میں کسی کے ساتھ صابن کے غبارے اڑاؤں اس یقین کے ساتھ کہ وہ کسی سیارے پر ضرور پہنچ جائے گا۔ اور اپنے قدم جما لے گا۔

دل کی آواز مدھم پڑتی گئی۔ اس کے جسم سے قیدی روح نکلنے کو بے چین ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں پائی اور پھول کی مانند ٹہنی سے جدا ہو کر کیاری میں گر گئی۔

وہ مٹی تھی مٹی میں جا ملی۔ مگر ایک دودھیا لکیر تھی جو کیاری سے طلوع ہوئی اور تیزی سے آسمان کی جانب پرواز کر گئی ایسے جیسے شب برات کا انار جو روشنی کی لکیر بناتا ہوا اوپر جا کر غائب ہو جاتا ہے۔ مگر وہ شور بھی مچاتا ہے لیکن اس لکیر نے خاموشی سے اپنا سفر طے کیا،

کسی نے دیکھا بھی نہیں۔

سلینا۔سلینا ڈارلنگ تمہیں کیا ہورہا ہے۔وہ بھاگ کر گلاس میں پانی لینے دوڑا

سلینا اٹھو۔تمہیں کیا ہورہا ہے۔کیا ہوا ہے تمہیں۔

ڈیوڈ کی آواز ایک چیخ تھی۔ وہ پریشان تھا۔ وہ حیران تھا۔ اس کی بے شمار آوازوں کے جواب میں وہ ایک لفظ بھی نہیں بول سکی۔ گلاس کا پانی کیاری کو سیراب کررہا تھا۔ایسے جیسے سلینا کا ادھورا کام اسے پورا کرنا تھا۔ڈیوڈ اب بھی چیخ رہا تھا۔ بے تحاشا چیخ رہا تھا لیکن اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

''کیا خاموشی گفتگو سے زیادہ سنگین نہیں ہوتی''

=☆=☆=

Saleeb Kay Zakham

Written by
Naushaba Siddiqui

میرے قلم سے اور بھی

A Text Book of Economic Theory by Stonier & Hague for BA.BCom. MA ---------- ترجمہ

کتابِ معاشیات ------------ انٹر کامرس کے لیے

صلیب کے زخم ------------ ناول

افکارِ حسن ------------ مرتب (والد کی شاعری)

سرِ شام ------------ خاکے، مضامین

زندگی بھر کی بات ------------ ناول

چشمِ حیراں ------------ خاکے (زیرِ تحریر)

WELCOME BOOK PORT
Main Urdu Bazaar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax:(92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com